زیر و زبر
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

قانونی پیچیدگیاں، عدالتی کارروائی کے اہم رموز و نکات

زن، زر اور زمین کے تنازعوں سے جنم لینے والے مقدمات

زیروزبر

راوی: مرزا امجد بیگ (ایڈووکیٹ)

تحریر: حسام بٹ

القریش پبلی کیشنز

ملک جلال دین (وقف) ہسپتال بلڈنگ سرکلر روڈ، چوک اردو بازار۔ لاہور۔ ۲۔ فون: 7668958

www.Alquraish.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں

با اہتمام.......محمد علی قریشی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بار اوّل ـــــــــــ 2008ء

مطبع ـــــــــــ نیر اسد پریس

ڈیزائن ـــــــــــ ذاکر

کمپوزنگ ـــــــــــ کلائمکس گرافکس

قیمت ـــــــــــ -/120 روپے

فہرست

نامعلوم — 5

خوش فہم — 61

زیروزبر — 123

اُلجھی ڈور — 181

نامعلوم

انصاف کرنا دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔

اگر منصف غیر جانبدار ہو، اسے اپنے رُتبے کا پاس ہو، اس کی سوچ میں توازن اور شعور میں حق و ناحق کا امتیاز پایا جاتا ہو تو یہی دشوار کام نہایت ہی سہل ہو جاتا ہے۔ نظامِ عدل میں اسی لئے منصف کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک متوازن، سمجھ دار اور فرض شناس جج دونوں فریقوں اور ان کے نمائندہ وکلاء کو پوری توجہ اور دیانت داری سے سنتا ہے۔ وہ کبھی یک طرفہ کہانی پر کوئی فیصلہ صادر نہیں کرتا، چاہے وہ کہانی کتنی ہی سچی محسوس کیوں نہ ہو رہی ہو کیونکہ یہ انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ اگر ہر انسان روزمرہ کی زندگی میں بھی یہی طریق اختیار کر لے تو یہ دنیا بہشتِ ارضی بن سکتی ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد میں اصل واقعے کی طرف آتا ہوں۔

وہ ماہِ مئی کا ایک گرم دن تھا۔ اس وقت دوپہر کے گیارہ بجے ہوں گے۔ میں ایک عدالت سے نکل کر دوسری عدالت کی طرف جا رہا تھا کہ برآمدے میں ایک شناسا چہرے پر نگاہ پڑ گئی۔ چہرہ چونکہ شناسا تھا لہٰذا پہچاننے میں کسی دقت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں تیز قدموں سے انوار روَنی کی جانب بڑھ گیا۔ انوار اس وقت دو افراد کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ انوار نے مجھے دیکھا نہیں تھا ورنہ وہ پہلی فرصت میں میری طرف ضرور پیش قدمی کرتا۔ وہ اس زاویے سے کھڑا تھا کہ میں تو با آسانی اسے دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی نگاہ میرے چہرے پر نہیں جا سکتی تھی۔

''السلام علیکم روَنی صاحب......!'' میں نے ان کے قریب پہنچ کر قدرے بلند آواز میں سلام کیا۔

انوار روَنی اس اچانک ''پکار'' پر چونک کر میری طرف مڑا پھر مجھ سے نظر ملتے ہی اس کی آنکھیں مسکرا اُٹھیں۔ میرے سلام کا جواب دینے کے بعد اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''بیگ صاحب! آپ یہاں؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ دراز کر دیا۔

''اور مجھے کہاں ہونا چاہئے روفی صاحب......؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا اور اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو گرم جوشی سے تھام لیا۔ ''ایک وکیل کورٹ کچہری ہی میں تو دکھائی دے گا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ ''پچھلے دنوں پتہ چلا تھا آپ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ کب واپس آئے؟''

''اوہ!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور بتایا۔ ''پچھلے دنوں میں واقعی پاکستان میں نہیں تھا۔ لیکن واپس آئے ہوئے بھی ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے۔ آپ سنائیں، آج کورٹ میں کیسے نظر آ رہے ہیں؟ خیریت تو ہے نا؟''

''اب تو خیریت ہی ہے۔ مگر گزشتہ دنوں تھوڑی پریشانی رہی ہے۔'' انوار روفی نے بتایا۔ ''ایک خبیث قسم کے کرائے دار سے واسطہ پڑ گیا ہے۔ میری نرمی اور شرافت کے سبب وہ بدمعاشی پر اُتر آیا۔ کم بخت اس انداز میں فلیٹ پر قابض ہو گیا تھا کہ معاملے کو عدالت میں لانا پڑا۔ بہرحال!'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اللہ کا شکر ہے، سب سیٹ ہو گیا۔ اُس کمینے سے جان چھوٹ گئی۔''

میں نے سوالیہ نظر سے اُس کے ساتھ کھڑے افراد کی طرف دیکھا۔ ان میں سے ایک جوان مرد تھا اور دوسری طرف ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ میرا اندازہ یہ کہتا تھا کہ روفی سے اس کی کوئی رشتے داری نہیں۔ وہ فوراً میری نگاہ کے مفہوم تک پہنچ گیا اور ان دو افراد سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''لیں جی.......آپ لوگوں کا کام تو ہو گیا۔ آپ کو کسی اچھے وکیل کی تلاش تھی اور........ چوٹی کا ایک وکیل خود ہی یہاں پہنچ گیا۔''

پھر وہ میری جانب دیکھتے ہوئے بتانے لگا۔ ''بیگ صاحب! ان لوگوں سے یہیں عدالت کے برآمدے میں میری ملاقات ہوئی ہے۔ بہت پریشان اور مصیبت زدہ دکھائی دیتے ہیں۔ مجھ سے کسی اچھے وکیل کا پتہ پوچھ رہے تھے۔ میری نظر میں آپ سے اچھا وکیل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ آپ سنبھالیں انہیں، میں چلتا ہوں۔''

اس کے بعد انوار روفی مجھ سے الوداعی مصافحہ کر کے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ انوار روفی ایک کاروباری شخص تھا۔ علاوہ ازیں اس کے چند فلیٹس بھی کرائے پر اُٹھے تھے۔ انتہائی امن پسند، صلح جو اور ایماندار شخص تھا۔ پیشہ ورانہ زندگی میں اکثر و بیشتر تو اس سے میرا واسطہ پڑتا رہتا ہے۔ اس کے کاروبار کی نوعیت کو یہاں اُجاگر کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں اور نہ ہی اس کی

ضرورت ہے۔“

انوار رؤفی کے جانے کے بعد میں مذکورہ افراد کی طرف متوجہ ہوا۔

جوان مرد کا نام طارق معلوم ہوا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں نادرہ خاتون تھی۔ طارق نے دونوں ہاتھوں کا استعمال کرتے ہوئے مجھ سے بڑا عقیدت مندانہ مصافحہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی نادرہ دُکھی لہجے میں اپنے مسائل کا ذکر کرنے لگی۔ اس کے اندازِ بیان سے میں نے محسوس کرلیا کہ وہ وہیں کھڑے کھڑے اپنی پوری داستان مجھے سنا ڈالے گی لہٰذا اسے روکنا ضروری ہو گیا کیونکہ اس کام کے لئے وہ جگہ مناسب تھی اور نہ ہی میرے پاس اتنا وقت تھا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور نادرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خاتون! ایسا ہے کہ دوسری عدالت میں میرا ایک کیس لگا ہوا ہے۔ مجھے فوراً متعلقہ عدالت پہنچنا ہوگا۔ آپ لوگ دو بجے کے بعد میرے دفتر آجائیں۔ پھر میں آپ کا مسئلہ تفصیل سے سنوں گا۔“

نادرہ خاتون نے اُمید اور تشکر کے ملے جلے تاثرات سے مجھے دیکھا، طارق نے پوچھا۔

”بیگ صاحب! آپ کا دفتر کہاں پر واقع ہے؟“

”آپ کو کہیں زیادہ دور نہیں جانا پڑے گا۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور طارق کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ادھر سٹی کورٹ کے قریب ہی ایک عمارت میں میرا دفتر واقع ہے۔ میں دو بجے تک وہاں پہنچ جاتا ہوں۔“

طارق نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا اور اپنی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”دو بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی ہیں۔ گھر جا کر واپس آنا تو ممکن نہیں۔“

میں نے استفسار کیا۔ ”آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں؟“

”کورنگی سے۔“ نادرہ نے جواب دیا پھر بولی۔ ”کوئی بات نہیں وکیل صاحب! ہم لوگ اِدھر ہی آپ کا انتظار کرلیں گے۔“

طارق نے کہا۔ ”امی! اتنی دیر میں ہم لوگ بولٹن مارکیٹ کا ایک چکر لگا لیتے ہیں۔ وہاں مجھے ایک کام بھی ہے۔ اس طرح آسانی سے وقت کٹ جائے گا۔“

ماں نے بیٹے کی تجویز کو فوراً اوکے کر دیا۔ میں نے طارق سے ہاتھ ملایا اور متعلقہ عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

لنچ کے بعد جب میں اپنے دفتر پہنچا تو طارق اور اس کی والدہ نادرہ خاتون وزیٹرز لابی میں میرے منتظر تھے۔ میں نے فوراً انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ وہ میرے چیمبر میں پہنچے اور رسمی علیک سلیک کے بعد میز کے سامنے بچھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

میں نے پیشہ ورانہ لہجے میں کہا۔ ”جی، اب بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
ماں بیٹے نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ وہ ایک دوسرے سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ گفتگو کا آغاز کون کرے گا۔ لمحاتی استفساریہ خاموشی کے بعد طارق نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
”بیگ صاحب! ہم ایک مقدمہ کرنا چاہتے ہیں۔“
”ہوں!“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور قلم سنبھال کر رف پیڈ کو اپنے سامنے رکھتے ہوئے طارق سے پوچھا۔ ”مقدمے کی نوعیت کیا ہے؟ اور آپ کس پر مقدمہ کرنا چاہتے ہیں؟“
”ہم اپنا جائز حق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”میرے تایا نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ تایا تو اب اس دنیا میں موجود نہیں، رہی سہی کسر تائی نے پوری کر دی۔ ہم انصاف کے طلب گار ہیں اور اس کے لئے کسی قابل وکیل کی ضرورت ہے.......اسی لئے ہم اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہیں۔“
میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کا تایا زندہ نہیں، تائی زندہ ہے۔ اس کا تو یہ مطلب ہوا آپ اپنی تائی کے خلاف کیس کرنا چاہتے ہیں؟“
”جی ہاں....... بالکل!“ وہ قطعیت سے بولا۔
میں نے دریافت کیا۔ ”آپ لوگوں کے ساتھ کس قسم کی زیادتی یا حق تلفی کی گئی ہے؟ یہ بات میرے لئے جاننا ضروری ہے تاکہ میں کیس کی نوعیت کا تعین کر سکوں؟“
”زیادتی اور حق تلفی تو بہت چھوٹے الفاظ ہیں وکیل صاحب!“ نادرہ خاتون نے دکھی لہجے میں کہا۔ ”ہمارے ساتھ تو ظلم ہوا ہے بلکہ اب تک ہو رہا ہے۔ آپ ہمیں انصاف دلا دیں تو یہ آپ کا ہم پر بہت بڑا احسان ہو گا۔ ہم آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔“
”یہ تو آپ کو کرنا ہی ہو گا۔“ میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ شے وکیل اور عدالت کے لئے ایندھن کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ عدالتی امور کے سلسلے میں آپ کا ایک روپیہ بھی فضول یا بے کار خرچ نہ ہو۔“
”تھینک یو بیگ صاحب!“ طارق نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔
میں نے کہا۔ ”اب آپ لوگ مجھے اصل واقعے کے بارے میں بتائیں؟“
انہوں نے ایک دوسرے کی مدد سے میری ”فرمائش“ پوری کر دی۔
ماضی کے واقعات پر مشتمل یہ ایک طویل اور عبرت اثر کہانی تھی۔ تاہم میں کہانی میں سے

غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے آپ کی خدمت میں ان واقعات کا خلاصہ بیان کر رہا ہوں تا کہ آگے بڑھنے سے قبل آپ اس کیس کے جغرافیے اور تاریخ سے آگاہ ہو جائیں۔ اس میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں مگر واقعات کے تسلسل کا خیال کرتے ہوئے انہیں بھی نتھی کر لیا ہے۔

***

یہ کہانی تو بہت پرانی ہے لیکن پندرہ سال پہلے (جب یہ کہانی مجھ تک پہنچی اس سے لگ بھگ پندرہ سال قبل) اس میں ایک خاص موڑ آیا اور اسی موڑ نے ان ماں بیٹے کی زندگی کو ایک نئے ڈھب پر ڈال دیا تھا جس کی دشواری اور تکلیف کو وہ ایک طویل عرصے سے برداشت کرتے چلے آ رہے تھے اور جب یہ تکلیف برداشت کی حدود پھلانگنے لگی تو وہ قانونی مدد حاصل کرنے کے لئے میرے پاس پہنچ گئے تھے۔

طارق کے دادا یعنی نادرہ خاتون کا سسر کسی سرکاری محکمے میں باعزت پوسٹ پر کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوا تو اسے فنڈز کے ذیل میں محکمے سے بہت کچھ ملا تھا۔ رقم حبیب اللہ کے ہاتھ آئی تو سب سے پہلے سر چھپانے کے ٹھکانے کا خیال ذہن میں آیا۔ اس سے پہلے کی زندگی کرائے کے مکانوں میں بسر ہوئی تھی۔

حبیب اللہ نے اچھے وقتوں میں ناظم آباد میں دو سو گز کا ایک مکان خرید لیا۔ یہ نام کو ایک مکان تھا لیکن اسے رہائش کے قابل بنانے کے لئے اس پر رقم خرچ کرنے کی ضرورت تھی۔ دو سو گز کے پلاٹ پر صرف دو تین گزارہ لائق کمرے بنے ہوئے تھے۔ اگر موجودہ حالت میں بھی وہاں رہائش اختیار کی جاتی تو ان کمروں کو ٹھیک کروانے کے لئے بیس تیس ہزار کا خرچہ تو تھا ہی۔ حبیب اللہ کے صرف دو بیٹے تھے، حسیب اللہ اور نجیب اللہ۔ ان میں نجیب اللہ بڑا یعنی طارق کا تایا تھا۔ حسیب اللہ، طارق کے والد کا نام تھا۔ یہ دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔

ایک روز حبیب اللہ نے دنوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''مجھ سے تم لوگوں کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ میں نے زندگی بھر کیا ہے۔ اب آپ لوگوں کی باری ہے۔''

حسیب اللہ کسی ٹیکسٹائل مل میں بوائلر انجینئر تھا مگر نجیب اللہ روزگار کے حوالے سے فارغ ہی گھوم رہا تھا۔ چھوٹی موٹی ملازمت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اس کی پسند کا روزگار اسے مل نہیں رہا تھا۔ بہر حال، جوائنٹ فیملی کی خامیاں اپنی جگہ لیکن ایک خوبی یہ ضرور ہے کہ اگر ایک آدھ نہیں بھی کما رہا ہو تو گزارہ ہوتا رہتا ہے۔

حسیب اللہ نے باپ سے کہا۔ ''ابو! آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ .... میں ہوں نا۔ آپ

آرام کریں۔''

حبیب اللہ نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں فکر کیسے نہ کروں؟ دراصل تم تو اپنے ہاتھ پاؤں کے ہو گئے ہو۔ تم نے اپنی گھریلو اور بیرونی ذمے داریوں کو بڑے اچھے انداز میں سنبھال رکھا ہے لیکن ......''

''لیکن'' کے بعد حبیب اللہ نے جملہ ادھورا چھوڑا تو حسیب اللہ فوراً باپ کی بات کی تہہ میں پہنچ گیا ...... وہ جلدی سے بولا۔ ''بھائی اگر اپنے معیار کو تھوڑا نیچے لے آئیں تو میں انہیں کل ہی کسی فیکٹری میں ملازمت دلوا سکتا ہوں۔ اللہ کے کرم سے میری اچھی خاصی جان پہچان ہے۔''

''تم کیا کہتے ہو؟'' حبیب اللہ نے براہِ راست نجیب اللہ سے پوچھا۔

وہ قدرے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''ابو! میں نے آپ کو کئی مرتبہ بتایا ہے کہ میرا رجحان کاروبار کی طرف ہے۔ نوکریوں دوکریوں میں کچھ نہیں رکھا۔ انسان ساری زندگی غلامی کرے اور آخر میں دونوں ہاتھ خالی!''

نجیب اللہ کے انداز میں اچھی خاصی کڑواہٹ پائی جاتی تھی۔ حسیب اللہ چھوٹا بھائی ہونے کے ناتے نجیب اللہ کے سامنے زیادہ زبان نہیں کھولتا تھا لیکن باپ کی موجودگی نے اس کی ہمت بندھائی اور اس نے اپنے مؤقف کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بھائی جان! بالکل فارغ رہنے سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان چھوٹی موٹی نوکری کر لے۔ اور آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آخر میں دونوں ہاتھ خالی!'' وہ لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ ابو جی ہی کو دیکھ لیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں اچھی خاصی رقم ملی ہے۔ اور کچھ نہیں، کم از کم ہم لوگ اپنے گھر کے تو ہو ہی گئے ہیں۔''

''لگتا ہے حسیب! تمہارے کندھے اس گھر کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے کچھ زیادہ ہی تھک گئے ہیں۔'' نجیب اللہ نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ میں کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ بہت جلد تم مجھے اپنا کاروبار کرتے ہوئے دیکھو گے۔''

حبیب اللہ نے فوراً صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے بیٹوں کے درمیان کسی قسم کی تلخی یا رنجش جنم لے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حسیب اللہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر نجیب اللہ سے کہا۔

''نجیب! تم جانتے ہو اپنا کاروبار شروع کرنے کے لئے رقم کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ تمہارے پاس نہیں ہے اور تم ......''

نجیب اللہ، باپ کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''میں رقم کا بندوبست کرنے کی ہی کوشش میں تو لگا ہوا ہوں۔''

حبیب اللہ نے بڑی فکرمندی سے بیٹے کو دیکھا اور کہا۔ ''میں محسوس کر رہا ہوں تم کہیں سے قرض حاصل کرنے کی کوشش میں ہو۔''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

حبیب اللہ نے پوچھا۔ ''تمہارے ذہن میں کون سا کاروبار ہے؟''

''میں کپڑے کی دکان کھولنا چاہتا ہوں۔''

''تمہارے خیال میں یہ کام شروع کرنے کے لئے کتنی رقم کی ضرورت ہوگی؟''

''دس پندرہ ہزار ہاتھ میں ہوں تو کپڑے کی دکان کھولی جا سکتی ہے۔'' نجیب اللہ نے بتایا۔ ''کچھ رقم ادا کر دی جائے تو اُدھار کپڑا بھی آسانی سے مل جاتا ہے۔ پھر خود بہ خود ہی رولنگ بن جاتی ہے۔''

''ہوں........'' حبیب اللہ نے گمبھیر انداز میں ہنکارا بھرا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس دوران حسیب اللہ اپنے والد کی ہدایت کے مطابق بالکل خاموش بیٹھا ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سنتا رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد حبیب اللہ نے نجیب اللہ سے استفسار کیا۔

''تمہیں کپڑے کی خرید و فروخت کا کچھ تجربہ بھی ہے؟''

''انسان جس کام میں ہاتھ ڈال دے، اس کا تجربہ بھی حاصل ہو ہی جاتا ہے۔''

''مجھے تمہاری بات سے مکمل اتفاق تو ہے بہر حال........'' حبیب اللہ جملہ نامکمل چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم قرض حاصل کرنے کے سلسلے میں کہاں کوشش کر رہے ہو؟''

''ایک خان صاحب سے میری بات چل رہی ہے۔''

''یعنی سود پر قرض؟'' حبیب اللہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

''جی۔'' نجیب اللہ نے مختصراً کہا۔

''میں تمہیں ایسی حماقت کی اجازت نہیں دے سکتا۔'' حبیب اللہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کون سی دلدل میں قدم رکھنے والے ہو۔''

نجیب اللہ نے قدرے زہریلے انداز میں کہا۔ ''اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں۔''

''نہیں........تم ایسا نہیں کرو گے۔'' حبیب اللہ قطعیت سے بولا۔ ''تم چند روز خاموش بیٹھو۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔ اور تم اس سلسلے میں کسی خان صاحب سے کوئی ڈیل نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' نجیب اللہ نے بڑی فرمانبرداری سے کہا۔ ''اگر آپ میرے لئے رقم کا انتظام کررہے ہیں تو مجھے کسی سے کوئی ڈیل کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔''

بعد میں حبیب اللہ نے باپ کو تنہا دیکھ کر مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ''ابو! میں جانتا ہوں، آپ کے پاس رقم موجود نہیں۔ آپ کہیں سے قرض لے کر ہی بھائی جان کو دیں گے۔ بھائی جان کو اس کام کا تجربہ بھی نہیں۔ یہ قدم اٹھانے سے پہلے ایک مرتبہ ٹھنڈے دماغ سے ضرور سوچ لیجئے گا۔''

''میں تمہاری بات کی اہمیت سے انکار نہیں کروں گا حبیب!'' حبیب اللہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن میں نجیب کی اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ انسان خلوصِ نیت سے اگر کوئی نیا کام شروع کرے تو اسے بہت جلد تجربہ بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ بس شرط یہی ہے کہ وہ پہلے اس کام کے لئے سنجیدہ ہو جائے۔''

حبیب اللہ نے باپ کو اٹل دیکھا تو کہا۔ ''ابو! اگر آپ کہیں تو میں اپنی فیکٹری سے کچھ قرض لے لوں؟''

''کیا وہ لوگ تمہیں پندرہ ہزار تک قرض دے دیں گے؟''

''کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے......'' حبیب اللہ نے اسے اجازت دے دی۔

حبیب اللہ نے حسبِ پروگرام کوشش کی اور اسے فیکٹری سے پندرہ تو نہیں البتہ پانچ ہزار روپے بطور قرض مل گئے۔ حبیب اللہ نے اپنے تعلقات کو آزمایا اور چند روز میں دس ہزار روپے جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ ٹھیک ایک ماہ کے بعد نجیب اللہ ناظم آباد ہی میں کپڑے کی دکان کھول کر بیٹھ گیا۔

انسان کسی کام کی ٹھان لے اور اس کی کوشش کا زاویہ مثبت اور قبلہ درست ہو تو اللہ بھی مدد کرتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے نجیب اللہ کی دکان ٹھیک ٹھاک چلنے لگی۔ حبیب اللہ نے جو دس ہزار اِدھر اُدھر سے پکڑ کر بیٹے کو دیئے تھے، ان کی واپسی ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کس طریقے سے، یہ بات حبیب اللہ کو معلوم نہ تھی البتہ اس نے اپنی فیکٹری سے جو قرض لیا تھا وہ اسے اپنی تنخواہ میں سے تھوڑا تھوڑا کٹوا کر ادا کرنا پڑتا تھا جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے حبیب اللہ نے نجیب اللہ کو بتایا ہی نہ ہو کہ اسے جو پندرہ ہزار روپے مہیا کئے جارہے ہیں، اس میں پانچ ہزار حبیب اللہ کے دیئے ہوئے ہیں۔

بہرحال...... حبیب اللہ خوش تھا کہ اس کا بڑا بھائی ایک طویل عرصہ بیکار رہنے کے بعد

کہیں سیٹ تو ہوا۔ وہ بڑے دل اور وسیع ظرف کا مالک تھا۔ لہٰذا اس نے کبھی اپنے بھائی جان کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ اسے کوئی رقم واپس لوٹانا ہے۔"

حبیب اللہ کی شادی نجیب اللہ سے دو سال پہلے ہوئی تھی لیکن اس کی صرف ایک ہی اولاد تھی یعنی طارق۔ جبکہ نجیب اللہ چار بچوں کا باپ تھا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ کسی بھی گھر میں سربراہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ جب تک حبیب اللہ کا سایہ ان کے سر پر موجود رہا، دونوں بھائیوں، ان کی بیویوں اور اولادوں میں کوئی بڑا جھگڑا یا فساد نہیں ہوا۔ چھوٹی چھوٹی ناراضگی اور رنجش تو فیملی لائف کا حصہ ہے لیکن کبھی کوئی ایسا تنازع سامنے نہیں آیا جو کسی ہنگامے پر منتج ہو۔ مگر حبیب اللہ کے انتقال کے بعد امن و امان کی یہ صورتِ حال زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔

وہ بھائی جو طویل عرصے تک بیکار رہا تھا اور حبیب اللہ نے ہی حقیقی معنوں میں گھر کا خرچہ اپنے ذمے اٹھا رکھا تھا، اُسے اب یہ نظر آنے لگا کہ وہ حبیب اللہ سے زیادہ کما رہا ہے لیکن گھر میں خرچہ مشترکہ ہو رہا ہے لہٰذا یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔ نجیب اللہ کی اس سوچ میں اس کی بیوی بہار بیگم کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ گاہے بہ گاہے اُسے احساس دلاتی رہتی تھی کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔

جب دلوں میں فرق آجائے تو زیادہ عرصے تک ساتھ نبھانا اذیت ناک اور ناممکن ہو جاتا ہے۔ حبیب اللہ اپنے بڑے بھائی اور بھاوج کے بدلتے ہوئے تیوروں کو بہ خوبی محسوس کر چکا تھا۔ وہ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ دوسری پارٹی علیحدگی کی خواہاں ہے۔ امن وسکون اور بھائی چارے کی فضا کو قائم رکھنے کے لئے حبیب اللہ اس علیحدگی میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اتنا کماتا تھا کہ اپنی مختصر سی فیملی کو بہت اچھے طریقے سے رکھ سکتا تھا۔ اگر گھر کا بٹوارا ہو جاتا تو اس کے ہاتھ ایک بڑی رقم آسکتی تھی جس سے وہ اپنے لئے ایک چھوٹا سا مناسب گھر خرید سکتا تھا۔ واضح رہے کہ کسی زمانے میں حبیب اللہ نے جو بے سروسامان گھر خریدا تھا وہ اب عالیشان دو منزلہ مکان کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کی تعمیر و ترقی میں دونوں بھائیوں نے حسب توفیق اور بقدرِ نیت حصہ لیا تھا۔ جب موروثی جائیداد کی تقسیم کا معاملہ کھل کر سامنے آیا تو ایک دن بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی سے کہا۔

"حبیب! میں چاہتا ہوں کہ اس گھر کو فروخت کئے بغیر ہم آپس میں کچھ طے کر لیں۔"

حبیب اللہ نے کہا۔ "بھائی جان! اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ آپ کے ذہن میں کوئی آئیڈیا ہو تو بتائیں؟"

"ہوں!" نجیب اللہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

حسیب اللہ سوالیہ نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینے لگا۔

چند لمحات کی خاموشی کے بعد نجیب اللہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دیکھو حسیب! ایسا کرتے ہیں کہ دو تین مختلف پراپرٹی ایجنٹس سے اس مکان کی قیمت لگانے کو کہتے ہیں۔ اس طرح ہمیں بہ خوبی یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس وقت مکان کی مارکیٹ ویلیو کیا ہے۔ اس طرح........!“

”لیکن آپ تو مکان کی فروخت کے خلاف ہیں؟“ حسیب اللہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

”بالکل........وہ تو میں تمہیں بتا چکا ہوں۔“

”پھر؟“ حسیب اللہ کی آنکھوں میں حیرت اُمڈ آئی۔

نجیب اللہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”اگر مجھے اور تمہیں اس مکان کی موجودہ قیمت کا اندازہ ہو جائے تو ہم آپس میں کوئی بہتر فیصلہ کر سکیں گے۔ ہم دونوں بھائی ہیں اور ابو کی وراثت کے برابر حقدار ہیں۔ وراثت کے نام پر ہمارے درمیان صرف یہی ایک مکان ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ مکان ہم میں سے کسی ایک کے پاس موجود رہے۔ دوسرا اپنا حصہ لے کر الگ ہو جائے۔“

وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا تو حسیب اللہ بڑی گہری نظر سے اپنے بھائی کو تکنے لگا۔ وہ اس کی گفتگو کا مقصد تو سمجھ گیا تھا تاہم کچھ کہنے کی بجائے خاموش رہا۔ وہ چاہتا تھا اس نے جو سمجھا ہے، نجیب اللہ اپنی زبان سے کہہ دے۔ نجیب اللہ تھوڑے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

”اس علیحدگی کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ اس مکان کی نصف قیمت میں تمہیں یا تم مجھے ادا کر دو۔ قیمت وصول کرنے والا مکان کے حق سے دستبردار ہو جائے گا اور ہمارے درمیان پکی دستاویز تیار کر لی جائے گی کہ ایک نے اپنا حصہ وصول کر کے مکان کو کلی طور پر دوسرے کی ملکیت اور تصرف میں دے دیا ہے۔ میری بات تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے نا؟“

حسیب کوئی ناسمجھ یا نادان بچہ نہیں تھا کہ بڑے بھائی کی بات کو سمجھنے کے لئے اسے کوئی دشواری پیش آتی۔ اس نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”آپ کی تجویز تو بالکل واضح ہے۔ لیکن کیا ایسا کرنا ٹھیک ہو گا؟“

”بات ٹھیک اور غلط کی نہیں میاں!“ نجیب اللہ نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”ہم دونوں بھائی ہیں۔ مانا کہ ہم کسی بھی نازک موقع پر دست و گریباں نہیں ہوں گے لیکن اس سلسلے میں ہم اپنی بیویوں اور اولادوں کی کوئی گارنٹی نہیں دے سکتے اور نہ ہی لے سکتے ہیں۔ یہ بات

تم نے اچھی طرح محسوس کر لی ہوگی کہ ہمارے درمیان تنازعات اُٹھنے لگے ہیں۔ اس سے پہلے کہ کوئی بڑا فتنہ سر اُبھارے، ہمیں الگ ہو جانا چاہیے۔"

حبیب اللہ خاصا دُکھی ہو گیا۔ اس نے شکستہ انداز میں کہا۔ "ابو جب تک زندہ تھے ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی لیکن ان کے جاتے ہی......."

اس نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ نجیب اللہ نے سرسری انداز میں کہا۔ "بہرحال، اب ابو ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں جو ہمارے مسئلوں اور جھگڑوں کو نمٹاتے رہیں گے۔ میں نے جو تجویز تمہارے سامنے رکھی ہے وہی ہمارے مسائل کا حل ہے۔ تم اس تجویز پر ٹھنڈے دل سے غور کرو اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر مجھے بتاؤ کہ تمہیں یہ مکان چاہیے یا اپنا حصہ۔ اگر مکان کو تم اپنے پاس رکھتے ہو تو پھر حصے کی رقم تم مجھے دو گے اور اگر تمہیں مکان نہیں چاہیے تو میں حصہ دینے کو تیار ہوں۔"

"میں اتنی بڑی رقم ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" حبیب اللہ نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

نجیب اللہ دوٹوک انداز میں بولا۔ "تو پھر تم اپنے حصے کی رقم لے کر الگ ہو جاؤ۔"

حبیب اللہ بڑی حیرت اور بے یقینی سے بڑے بھائی کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

الغرض، ان کے درمیان طے پایا کہ ایک ماہ تک وہ مکان کی مارکیٹ ویلیو معلوم کرنے کی کوشش کریں گے، اس کے بعد اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کریں گے۔ یہ بات تو طے تھی کہ حبیب اللہ وہ مکان حاصل کرنے کے لئے رقم کا بندوبست نہیں کر سکتا تھا جبکہ نجیب اللہ با آسانی اُسے اُس کا حصہ ادا کرنے کی پوزیشن میں تھا۔ یہی نظر آ رہا تھا کہ حبیب اللہ کو رقم لے کر اس گھر کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا اور اس نے اپنی فیملی کو بھی تیار کر لیا تھا۔ وہ ایک عملی اور حقیقت پسند شخص تھا۔ زمانے کی اُونچ نیچ پر اس کی گہری نظر تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ ایک ماہ گزرتا اور ان کے درمیان فیصلے کی گھڑی آن کھڑی ہوتی، ایک اندوہ ناک واقعہ پیش آ گیا۔ اس واقعے نے نجیب اللہ کا کام آسان اور حبیب اللہ کے لواحقین کی زندگی مشکل بنا دی۔

حبیب اللہ جس فیکٹری میں کام کرتا تھا اس کے بوائلر میں ایک خوف ناک حادثہ رونما ہوا....... حبیب اللہ اس ٹیکسٹائل مل میں بوائلر انجینئر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور اتفاق سے حادثے کے وقت وہ بوائلر کے قریب موجود تھا لہٰذا دیگر دو افراد کے ساتھ وہ بھی لقمۂ اجل بن گیا۔

نجیب اللہ نے چھوٹے بھائی کی الم ناک موت کا صدمہ اٹھایا اور حتیٰ المقدور خود کو سوگوار ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ حسیب اللہ کی حادثاتی موت کی وجہ سے جائیداد کی تقسیم والا معاملہ فی الحال کھٹائی میں پڑ گیا۔ مگر اِدھر اُس کا چہلم ہوا۔ اُدھر نجیب اللہ نے اپنی بھاوج اور بھتیجے کی طرف سے نظر پھیر لی۔ نظر کے اس پھراؤ میں اس کی بیوی بہار بیگم کا غالب ہاتھ تھا۔ کہاں تو وہ حسیب اللہ کو مکان کی آدھی قیمت دینے کو تیار تھا اور کہاں اب وہ مرحوم بھائی کی فیملی کو اس گھر پر بوجھ سمجھنے لگا تھا۔

دونوں بھائیوں کے درمیان حسیب اللہ کی موت سے قبل مکان کے سلسلے میں جو ''مذاکرات'' چل رہے تھے، نادرہ خاتون اس سے بہ خوبی آگاہ تھی۔ جب اس نے جیٹھ جی کی نگاہ میں ٹیڑھ محسوس کیا تو وہ ایک فیصلہ پر پہنچ گئی۔ حسیب اللہ کی حادثاتی موت پر ٹیکسٹائل مل والوں نے اسے کچھ رقم بطور ''اشک شوئی'' دی تھی۔ اس نے سوچا اگر نجیب اللہ اپنے ارادے اور وعدے کے مطابق مکان کا حصہ ان کے حوالے کر دے تو وہ ماں بیٹا کہیں بھی جا کر رہ لیں گے۔ نادرہ بیگم نے اچھی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ فتنہ پرور جیٹھانی بہار بیگم کے ساتھ اب ایک چھت کے نیچے گزارہ نہیں ہو سکے گا اس لئے بہتر ہو گا کہ علیحدگی ہی اختیار کر لی جائے۔ بہار بیگم تو حسیب اللہ کی زندگی میں نشتر چبھونے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی اور اب تو اس کے ''کھیلنے'' کے لئے میدان خالی پڑا تھا۔ اور سب سے تشویش ناک بات یہ تھی کہ نجیب اللہ پوری طرح اپنی بیوی کی مٹھی میں تھا۔ چنانچہ نادرہ بیگم نے ایک روز اپنے جیٹھ نجیب اللہ سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''بھائی صاحب!'' اس نے موقع ملتے ہی نجیب اللہ سے کہا۔ ''میں کسی لمبی چوڑی تفصیل یا بحث میں نہیں پڑنا چاہتی۔ آپ سے ایک مختصر سی بات کہنا ہے۔''

''ہاں کہو!'' نجیب اللہ نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''میں خود بھی طول طویل قصے کہانیوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اگرچہ نجیب اللہ کا یہ انداز کسی بھی حوالے سے مناسب نہیں تھا۔ نادرہ خاتون اس کی بیوہ بھاوج تھی۔ اس کے چھوٹے بھائی کو موت کے منہ میں اُترے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ نادرہ اس کی توجہ، محبت اور ہمدردی کی مستحق تھی مگر وہ اپنے فرائض کے بالعکس ردِعمل ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے باوجود بھی نادرہ نے زیادہ محسوس نہ کیا۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کے تمام تر رویوں کا دارومدار توقعات پر ہوتا ہے۔ مرزا غالب نے بہت خوب کہا ہے.......جب توقع ہی اُٹھ گئی غالب، کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی۔

نادرہ خاتون بھی اپنے جیٹھ نجیب اللہ سے کسی قسم کی کوئی توقع نہیں رکھتی تھی لہٰذا اس کے نامناسب اور غیر انسانی رویے پر اسے ذرا افسوس نہ ہوا۔ نجیب اللہ کے اُکھڑے ہوئے اور کھردرے انداز کے جواب میں اُس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بھائی صاحب!........ حسیب کی زندگی میں آپ کی مکان کے سلسلے میں اس سے کوئی بات چیت چل رہی تھی۔ حسیب تو اب زندہ نہیں رہا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم لوگ آپ لوگوں کے لئے بوجھ نہ بنیں........ اگر آپ ہمیں ہمارا جائز حصہ دے دیں تو ہم یہاں سے جانے کو تیار ہیں۔''

نجیب اللہ نے بڑی توجہ سے بھاوج کی بات سنی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بھائی کی زندگی میں تو وہ مکان کی مالیت کا نصف اُسے دینے کو تیار تھا لیکن حسیب اللہ کی وفات کے بعد اس کی نیت میں فتور پیدا ہو گیا تھا........ نجیب اللہ ایک ایسا موقع پرست اور عیار شخص تھا کہ حالات کے مطابق کینچلی بدلنے میں مہارت رکھتا تھا........ بھائی کی بات اور تھی لیکن بھاوج اور بھتیجے کو وہ سوکھا ہی ٹرخانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ بڑے شاطرانہ انداز میں اس نے نادرہ خاتون سے کہا۔

''ہم بھائیوں کے درمیان اس مکان کے سلسلے میں جو بات ہو رہی تھی، اس کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟''

نادرہ نے چونک کر اپنے جیٹھ کو دیکھا اور اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''یہی کہ آپ حسیب کو اس مکان کی آدھی قیمت دینے کو تیار تھے۔''

''تمہاری معلومات انتہائی ناقص ہیں۔'' نجیب اللہ نے کہا۔ ''شاید حسیب اللہ نے تمہیں صحیح صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا تھا۔''

''آپ بتا دیں، صحیح صورتِ حال کیا تھی؟'' نادرہ نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

نجیب اللہ نے اپنی مرضی کی وضاحت پیش کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ہم صرف دو بھائی تھے۔ ابو کی چھوڑی ہوئی ہر شے پر ہمارا برابر کا حق ہے اور اس سلسلے میں یہ مکان سب سے زیادہ اہم ہے۔ ہم دونوں وراثت کے قانون کے مطابق اس ترکے میں برابر کے حق دار ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ایک بہت ہی باریک نکتے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

نجیب اللہ یہاں تک پہنچنے کے بعد لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا تو نادرہ منتظر نظر سے اسے دیکھنے لگی کہ پتہ نہیں وہ کون سا نکتہ بیان کرنے والا ہے۔ وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ''یہ دیکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم دو بھائیوں کے درمیان کون سے مکان کو برابر تقسیم ہونا چاہئے؟''

''کیا مطلب؟'' نادرہ نے اُلجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا اس کے علاوہ کوئی اور مکان بھی ہے؟''

''ہاں!'' نجیب اللہ نے بڑی مکاری سے اثبات میں گردن ہلائی اور کہنے لگا۔ ''ایک مکان تو یہ ہے جس میں ہم اس وقت رہائش پذیر ہیں اور دوسرا مکان وہ تھا جو کسی زمانے میں ابو نے اپنے فنڈز کی رقم سے خریدا تھا۔''

''یہ وہی مکان تو ہے۔'' نادرہ متعجب نگاہ سے اسے دیکھنے لگی۔

وہ خباثت بھرے لہجے میں بولا۔ ''جس شخص نے بھی ماضی والے اُس مکان کو دیکھا ہوگا، وہ بڑے دعوے سے کہہ سکتا ہے کہ یہ وہ مکان نہیں۔ اس کا رنگ ڈھنگ، آن بان اور قدر و قیمت اُس بے سروسامان مکان سے بالکل مختلف اور جدا ہے۔ کیا تمہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا؟''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔'' نادرہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''گاہے بہ گاہے اس مکان کی تعمیر و ترقی کا کام جاری رہا ہے اور دیکھنے میں اب یہ پہلے والا وہ مکان نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اول آخر یہ وہی مکان ہے۔''

نجیب اللہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''نادرہ! میری بات غور سے سنو۔ یہ میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ آئندہ میں اس موضوع پر کسی بحث مباحثے کے موڈ میں نہیں ہوں۔'' اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے خاموش ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ابو نے کسی زمانے میں جو مکان خریدا تھا اُس میں حسیب برابر کا حق دار تھا۔ اُس دور کی مالیت کے حساب سے اگر آپ لوگوں کو آدھا حصہ چاہئے تو میں دینے کو تیار ہوں۔ لیکن اگر آپ لوگ آج کی مارکیٹ ویلیو کی بات کریں تو یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ اس مکان کو یہاں تک پہنچانے میں صرف اور صرف میرا پیسہ خرچ ہوا ہے۔''

نجیب اللہ کی بدنیتی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ بھائی کی آنکھ بند ہوتے ہی اس نے اپنی پالیسی کو بڑی مکاری سے تبدیل کر لیا تھا۔ نادرہ جانتی تھی کہ اس مکان کی ''ترقی'' میں نجیب اللہ سے زیادہ حسیب اللہ نے رقم خرچ کی تھی لیکن وہ حقیقت کو ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ نجیب اللہ ان تمام تر حقائق سے بہ خوبی واقف تھا مگر اس کی نیت کا فتور پوری آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آ گیا تھا۔ وہ احسان فراموش شخص یہ بھی بھول گیا تھا جب وہ کپڑے کا کاروبار شروع کر رہا تھا تو حسیب نے اپنی مل سے قرضہ لے کر اُس کی مدد کی تھی۔ قرضے کی یہ رقم اُس نے اپنی تنخواہ سے قسط وار کٹوائی تھی۔

نادرہ خاتون کو خاموش اور سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھا تو نجیب اللہ نے فیصلہ کن لہجے

میں کہا۔ ''تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ لیکن میں سوچنے سمجھنے کے لئے تمہیں زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔ تمہیں چند دنوں میں کسی فیصلے تک پہنچنا ہو گا۔'' وہ لمحہ بھر کو رُکا، پھر وضاحت کرنے والے انداز میں بولا۔ ''ایک بات ذہن میں رہے کہ تمہیں فیصلہ ماضی والے مکان کا حصہ لینے یا نہ لینے کے بارے میں کرنا ہے اور جہاں تک ایک ساتھ رہنے کا تعلق ہے تو وہ اب ممکن نہیں رہا۔ تم ماں بیٹے کو اپنا الگ بندوبست کرنا ہو گا۔''

اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ نجیب اللہ اس وقت اپنی بیوی کی زبان بول رہا تھا۔ اس واہیات صورت حال نے نادرہ کے رگ و پے میں ایک اشتعال سا بھر دیا۔ اگر وہ پیسے والی ہوتی تو ابھی ایک تگڑی رقم اپنے جیٹھ کے منہ پر مار کر کہتی، لو اُٹھاؤ اپنا حصہ اور چلتے پھرتے دکھائی دو۔ ہم یہ مکان اپنے پاس رکھیں گے۔ لیکن....... چونکہ وہ صاحبِ ثروت نہیں تھی اس لئے یہ جرأت مدانہ قدم نہ اُٹھا سکی۔ اس محرومی اور شکست کے احساس نے اس کے اشتعال میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ جذباتی اور مشتعل انسان اکثر اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ نادرہ نے بھی کچھ ایسا ہی کیا۔

وہ نجیب اللہ کی طرف دیکھتے ہوئے زہریلے انداز میں بولی۔ ''اگر تم ہمیں اس مکان کی موجودہ مالیت کا نصف دینے پر تیار ہو تو ہم یہاں سے چلے جاتے ہیں ورنہ.......''

نادرہ نے جملہ ادھورا چھوڑا تو نجیب اللہ نے جلدی سے پوچھا۔ ''ورنہ کیا؟''

''ورنہ یہ کہ ہمیں خیرات میں کچھ نہیں لینا۔'' نادرہ نے پھنکار سے مشابہہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں پورا حصہ چاہئے۔ نہیں تو کچھ بھی نہیں چاہئے۔''

''تمہاری مرضی ہے۔'' نجیب اللہ نے کندھے اُچکا دیئے۔ پھر خشک لہجے میں پوچھا۔ ''آپ لوگ کب تک یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے؟''

نادرہ پر اس وقت ایک عجیب سا جنون سوار تھا۔ اس نے غصیلے لہجے میں کہہ دیا۔ ''ابھی.......اور اسی وقت۔''

یہ نادرہ کا ایک جذباتی جملہ تھا جس پر فوری طور پر عمل درآمد ممکن نہیں تھا تاہم وہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی اور آنے والے چند روز میں وہ اپنے بیٹے کو لے کر کورنگی شفٹ ہو گئی۔ کورنگی میں نادرہ کا ایک بھائی رہتا تھا۔ وہ سیدھی اُسی کے گھر پہنچی تھی۔ نادرہ کا بھائی اختر جمال غیر شادی شدہ تھا اور اس گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اختر جمال کی عمر پچاس کے اریب قریب تھی۔

نادرہ خاتون کی اس حرکت (فیصلے) کے بارے میں جس نے بھی سنا، اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اُس کا بھائی اختر جمال پیش پیش تھا۔ اس کا متفقہ خیال یہی تھا کہ

نادرہ کو اپنے حق سے دستبردار نہیں ہونا چاہئے۔ مگر وہ جیٹھ کے رویے سے اس قدر دل برداشتہ ہو چکی تھی کہ اس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ اختر جمال نے تو مقدمہ کرنے کا مشورہ بھی دیا لیکن وہ نہیں مانی۔ وہ ناظم آباد والے گھر یعنی اپنے سسرال سے اپنا سارا سامان لے آئی تھی اور پیچھے پلٹ کر دیکھنے کو تیار نہیں تھی۔ یہ ''مدعی سست اور گواہ چست'' والی صورتِ حال تھی۔ لہٰذا سب اپنی اپنی کہہ کر خاموش ہو بیٹھے۔ بھائی نے زیادہ زور اس لئے بھی نہیں دیا کہ کہیں بہن یہ نہ سمجھے کہ بھائی اُسے اپنے لئے بوجھ سمجھتا ہے۔

اختر جمال اپنے حال میں مست رہنے والا ایک الگ تھلگ انسان تھا۔ اُس نے شادی کی تھی اور نہ ہی آئندہ ایسا کوئی ارادہ رکھتا تھا۔ وہ ایسی کھری اور مبنی بر حقیقت باتیں کرتا تھا جو عام طور پر لوگوں کو پسند نہیں آتی تھیں لہٰذا وہ دوسروں سے کٹ کر تنہا زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ وہ کھسکا ہوا ایک سنکی شخص ہے۔ اسے اپنے بارے میں لوگوں کی اس رائے سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اختر جمال کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع ایک بسکٹ فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ آمدنی اتنی تھی کہ بہن اور بھانجا اس کے لئے کوئی بوجھ نہیں بن سکتے تھے۔

نادرہ خاتون جب ناظم آباد سے کورنگی پہنچی اس وقت طارق کی عمر دس گیارہ سال تھی۔ وہ چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ لوگ ان دنوں جس قسم کے حالات کا شکار تھے ان میں طارق کا تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں تھا لیکن اختر جمال نے بہن پر زور دیا کہ وہ طارق کو کم از کم میٹرک تک ضرور پڑھائے۔ اس کی تعلیم کے اخراجات وہ خود اٹھائے گا۔ وہ خود زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن تعلیم کی قدر و قیمت سے آگاہ تھا۔ پھر میٹرک کی اس زمانے میں اچھی خاصی ویلیو بھی تھی۔ آج کل تو ایم اے پاس بھی ڈی ویلیو ہو کر رہ گئے ہیں۔ مسابقت کے اس دور میں تعلیم یافتہ شخص کے لئے بھی زندگی جس قدر مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے ایسا حال پہلے کبھی کسی نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔

طارق نے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر اپنے ماموں کے مشورے پر ٹائپنگ کورس کر لیا۔ اُس زمانے میں کمپیوٹر کی ریس شروع نہیں ہوئی تھی اور میٹرک پاس ٹائپسٹ کو با آسانی کلرک کی نوکری مل جاتی تھی۔ اختر جمال نے اپنے تعلقات کو استعمال کر کے طارق کو اسی بسکٹ فیکٹری کے دفتر میں رکھوا دیا جہاں وہ خود ایک طویل عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس کی تنخواہ بارہ سو روپے لگی جو ان ماں بیٹے کے اخراجات کے لئے کافی تھی۔

اختر جمال جس دو کمروں کے کوارٹر میں رہتا تھا وہ کرایے کا تھا۔ طارق کی نوکری لگ گئی تو

وہ برابر گھر کے اخراجات میں شیئر کرنے لگا۔ اس طرح چند سال راضی خوشی گزر رہے تھے کہ اختر جمال کا انتقال ہو گیا۔ عمر کے آخری دنوں میں وہ بیمار رہنے لگا تھا اور طبعی موت سے پہلے وہ پورا ایک ماہ ڈیوٹی پر نہیں جا سکا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ وہ ماں بیٹا اسی کورنگی والے کوارٹر میں رہائش پذیر رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کوارٹر کے کرائے میں تھوڑا تھوڑا اضافہ ہوتا رہا اور آج کل وہ لوگ اس کوارٹر کا تین سو روپے دے رہے تھے۔ طارق کی تنخواہ بارہ سو سے بڑھ کر اٹھارہ سو تک جا پہنچی تھی۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ان ماں بیٹے کی زندگی میں ایک مرتبہ پھر بھونچال سا آ گیا۔

طارق کو کسی طرح پتہ چلا کہ اس کی تائی بہار بیگم نے ناظم آباد والا آبائی گھر فروخت کر دیا تھا اور اب وہ لوگ گلشن اقبال کے کسی فلیٹ میں منتقل ہو چکے تھے۔ طارق نے اس خبر پر آنکھیں بند کر کے یقین نہ کیا اور اپنے ذرائع استعمال کر کے تصدیق کر لی۔ اس دوران اس کے تایا نجیب اللہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ نجیب کے انتقال کے بعد نوشاد علی نامی ایک شخص کا ان کے گھر آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ بہار بیگم کے بچے نوشاد علی کو ماموں کہتے تھے۔ اس بات کی تصدیق نہ ہو سکی کہ نوشاد علی، بہار بیگم کا سگا بھائی تھا یا بچوں کا نام نہاد ماموں۔ بہرحال، طارق نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ ناظم آباد والے دو منزلہ آبائی گھر کو بیچ کر گلشن چورنگی کے قریب ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں دو لگژری فلیٹ خریدے گئے تھے۔ ایک فلیٹ میں اس کی تائی بہار بیگم اپنے چار بچوں کے ساتھ رہائش پذیر تھی جبکہ دوسرا فلیٹ ''ماموں'' کے تصرف میں تھا۔

طارق نے اپنی ماں کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اس نے پوری توجہ سے بیٹے کی بات سنی اور آخر میں کہا۔ ''بیٹا! وہ لوگ مکان کو بیچیں یا آگ لگا دیں، ہماری بلا سے۔ اللہ نے ہمیں ہر شے دے رکھی ہے۔ ہمیں اس مکان سے کیا لینا دینا؟''

طارق کو ماں کا خیال پسند نہ آیا۔ وہ قدرے جذباتی لہجے میں بولا۔ ''امی! وہ گھر میرے دادا کا تھا۔ اس پر جتنا حق تایا اور اس کے بچوں کا ہے، اتنا ہی حق ابو اور ہمارا بھی ہے۔ کسی زمانے میں آپ اس حق سے کنارہ کشی اختیار کر کے یہاں چلی آئی تھیں۔ اُس وقت میں بہت چھوٹا تھا لہٰذا ان معاملات کو نہیں سمجھتا تھا ورنہ میں آپ کو اس وراثت سے دستبردار نہ ہونے دیتا۔ لیکن اب مجھے ہر بات کا شعور ہے۔ وہ لوگ اکیلے اس آبائی گھر کو ہضم نہیں کر سکتے۔ میں اپنا حق وصول کر کے رہوں گا اور آپ کے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی کا حساب بھی لینا ہے مجھے۔''

طارق اس وقت خاصے خطرناک موڈ میں نظر آتا تھا۔ نادرہ نے اُس کے یہ تیور دیکھے تو گھبرا گئی۔ بڑے میٹھے لہجے میں سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''بیٹا! میں نے ہمیشہ لڑائی جھگڑے سے دور رہنے کی کوشش کی ہے۔ اب اس عمر میں تم مجھے کن جھمیلوں میں ڈالنا چاہتے ہو؟''

طارق اپنی بات پر اڑا رہا اور خاصے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''امی! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوں گا اور اس سلسلے میں آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟ اس میں لڑائی جھگڑے والی کوئی بات نہیں۔ میں ہر کام طریقے سلیقے سے کروں گا۔ بس آپ میرے ساتھ جڑی رہیں۔ میں نے اپنے ذہن میں ایک خاکہ سا بنا لیا ہے۔ ہم حق پر ہیں۔ یقیناً اللہ بھی ہماری مدد کرے گا۔''

بیٹے کو جب اپنے ارادے میں اٹل دیکھا تو مجبوراً نادرہ خاتون کو اس کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری تائی نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے لیکن بہرحال، وہ رشتے میں تمہاری بزرگ ہے۔ تم ادب، تمیز سے بات کرنا........ بلکہ میں تو کہتی ہوں تم مجھے بہار بیگم سے بات کرنے دو۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔ ''ان لوگوں سے براہِ راست آپ بات کریں گی اور نہ ہی میں۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' نادرہ خاتون نے اُلجھن زدہ نظر سے بیٹے کو دیکھا۔

بیٹے نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''امی! آپ جس عورت کو بہار بیگم کہہ رہی ہیں نا........ میری نظر میں اس کا نام خزاں بیگم ہونا چاہئے۔ میری معلومات کے مطابق دادا جان کے انتقال کے بعد تایا نے ہمارے ساتھ جو بھی برا سلوک کیا اس میں اسی خزاں بیگم کا ہاتھ ہے۔ تایا اپنی بیوی کی اُنگلی پکڑ کر چلنے کے عادی تھے اور اسی بری عادت........ بلکہ علت میں وہ رشتوں کی پہچان بھی بھول گئے۔ آپ کی زبانی میں نے ماضی کے تمام واقعات سن رکھے ہیں اور یہ سب کچھ میرے ذہن پر نقش ہے........''

وہ سانس ہموار کرنے کے لئے لمحہ بھر کو متوقف ہوا، پھر جذباتی بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں جانتا ہوں، نجیب تایا پہلے کچھ بھی نہیں تھے۔ ابو کی کوششوں اور پیسوں سے انہوں نے کپڑے کا بزنس شروع کیا تھا۔ بعد ازاں ہمارے آبائی مکان کی تعمیر و ترقی میں تایا کے ساتھ ساتھ ابو کا پیسہ خرچ ہوتا رہا ہے۔ اگر انصاف کی بات کی جائے تو ابو اور تایا مذکورہ مکان پر ایک سا حق رکھتے تھے۔ لیکن ابو کی حادثاتی موت نے سب کچھ پلٹ کر رکھ دیا۔ تایا کی

آنکھیں بدل گئیں اور انہوں نے ہمیں بیکار سمجھتے ہوئے گھر سے نکال دیا۔''

وہ ایک مرتبہ پھر لمحاتی وقفے کے لئے خاموش ہوا، پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''جب ہمیں ہمارے آبائی گھر سے بے دخل کیا جا رہا تھا تو اس وقت تک ایک طرح سے میں بچہ ہی تھا۔ مجھے ان حالات کا زیادہ شعور نہیں تھا۔ لیکن اب میں بچہ رہا ہوں اور نہ ہی کمزور ہوں۔ اگر گھی سیدھی اُنگلی سے نہ نکلا تو میں مجبوراً اُنگلی کو ٹیڑھا بھی کرلوں گا۔''

''طارق! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟'' نادرہ خاتون یک لخت بے حد پریشان ہو گئی۔ ''تمہارے ارادے مجھے ٹھیک نہیں لگ رہے۔''

''میرے ارادے بالکل ٹھیک ہیں امی!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔''

''مگر........ کیسے ٹھیک کرلو گے؟'' نادرہ کے استفسار میں ہلکا سا احتجاج شامل ہو گیا۔

طارق چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظروں سے سامنے بیٹھی ماں کو دیکھتا رہا، پھر بڑے گمبھیر انداز میں بتانے لگا۔ ''ہم ان لوگوں کو بالکل تنگ نہیں کریں گے۔ بالکل سیدھا راستہ اختیار کرتے ہوئے پہلے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ انصاف حاصل کرنے کا قانونی طریقہ اپنائیں گے۔ اور اگر سیدھی راہ پر کوشش کرنے سے ہمیں ہمارا حق نہ ملا تو پھر........''

طارق بڑے خطرناک اور سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ نادرہ کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ اچانک گہری تشویش نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ فکرمند تو تھی ہی، بے حد اضطراری لہجے میں اس نے بیٹے سے کہا۔

''دیکھو طارق! جہاں تک قانون کی مدد سے انصاف حاصل کرنے کی بات ہے تو میں قدم قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔ لیکن اگر تم نے اس سلسلے میں کوئی سنگین قدم اُٹھایا تو میں تمہیں دودھ نہیں بخشوں گی۔''

''امی! آپ بہت زیادہ جذباتی ہو رہی ہیں۔'' طارق نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انشاء اللہ! کوئی سنگین قدم اُٹھانے کی نوبت نہیں آئے گی۔''

وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئی۔

اور........ اب وہ دونوں میرے سامنے بیٹھے تھے۔

***

سالوں پر محیط اپنی زندگی کی دُکھ بھری داستان کو مجھ تک پہنچانے کے بعد وہ اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات تھے کہ میں اُن کی

کہانی سننے کے بعد فوراً حرکت میں آ جاؤں گا اور چٹکی بجاتے میں اُن کا جائز مطالبہ پورا کروانے میں اہم رول ادا کروں گا۔ اور اس میں اُن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ہر مؤکل بڑی آس لے کر کسی وکیل کے پاس پہنچتا ہے اور اس کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وکیل جادو کی چھڑی گھما کر پلک جھپکتے میں اس کا کام کر دے۔

میں نے بڑے انہماک اور توجہ سے ان ماں۔ بیٹے کی کہانی سنی اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس میں کوئی شک دکھائی نہیں دیتا تھا کہ ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی تھی مگر یہ تصویر کا ایک رُخ تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا ضروری تھا۔ دوسرے رُخ کی جھلک اسی وقت نظر آ سکتی تھی جب مخالف پارٹی میرے رابطے میں آتی۔ اگر میں اس کیس کو ہاتھ میں لے کر کام شروع کر دیتا تو جلد ہی دوسری پارٹی کے منظر عام پر آنے کا امکان تھا۔

میں نے موجودہ صورتِ حال پر غور کیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نادرہ خاتون اور طارق کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ لوگوں نے مجھ تک جو معلومات پہنچائی ہیں ان کی روشنی میں آپ حق پر نظر آتے ہیں۔ لیکن خود کو حق دار ثابت کرنے کے لئے عدالت کو حقائق اور ثبوت فراہم کرنا پڑتے ہیں۔ آپ اس سلسلے میں مجھ سے کیا تعاون کر سکتے ہیں؟''

نادرہ خاتون نے گول مول جواب دیا۔ ''آپ جو کہیں گے، ہم کرنے کو تیار ہیں۔''

میں نے اپنی وضاحت میں صورتِ حال کی تفصیل میں جاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں! یہ بات تو سامنے آ چکی کہ آپ کی جیٹھانی بہار بیگم آبائی گھر کو فروخت کر کے ناظم آباد سے گلشن اقبال شفٹ ہو چکی ہے۔ اُس نے وہاں ایک فلیٹ خریدا ہے یا دو .... اس معاملے کا آپ کے کیس سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی اس بات کا واسطہ ہے کہ کوئی نام نہاد ماموں (بچوں کا) بھی ایک فلیٹ کا مالک بن بیٹھا ہے۔ سب سے اہم اور قابلِ ذکر ہے، ناظم آباد والا آبائی مکان جو اب فروخت ہو چکا ہے۔''

میں نے تھوڑا توقف کیا پھر بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر طارق! جب تک آپ کے دادا زندہ تھے، مذکورہ دومنزلہ مکان ان کی ملکیت تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد از روئے قوانینِ وراثت وہ مکان تمہارے باپ حبیب اللہ اور تایا نجیب اللہ کا ہو گیا۔ تمہارے والد کے انتقال کے بعد حالات میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی اور تمہاری والدہ کو وہ گھر چھوڑ کر کورنگی میں اپنے بھائی اختر جمال کے یہاں سکونت اختیار کرنا پڑی۔ ایک طویل عرصہ گزر جانے کے بعد آپ لوگوں کو معلوم ہوا کہ آپ کی تائی بہار بیگم نے مذکورہ آبائی گھر فروخت کر دیا ہے۔ یہاں پر ایک انتہائی اہم پوائنٹ اُبھر کر سامنے آتا ہے۔''

میں نے بات کو ادھورا چھوڑ کر باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہ بڑی توجہ سے میری بات سن رہے تھے۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات کو ذہن میں بٹھالیں کہ اس وقت تک کوئی شخص کسی جائیداد کو فروخت نہیں کر سکتا جب تک اسے اس کی فروخت کا حق حاصل نہ ہو۔ یعنی وہ شخص یا تو مالک ہو اور یا پھر مالک کا منتخب کردہ نامزد مختارِ خاص جسے قانونی طور پر اصل مالک نے مذکورہ جائیداد کی خرید و فروخت کا حق دے رکھا ہو۔ آپ لوگوں کا ناظم آباد والا آبائی گھر بہار بیگم نے فروخت کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ یا تو اس گھر کی مالک تھی اور یا پھر اس فروخت کے سلسلے میں اس کے پاس پاور آف اٹارنی تھا۔ اگر وہ اس گھر کی مالک تھی تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپنے شوہر کے انتقال کے بعد اس نے وہ گھر اپنے نام منتقل کروالیا تھا۔ اگر واقعی اس گھر کا انتقال بہار بیگم کے نام ہو چکا تھا تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نجیب اللہ نے اپنی زندگی میں وہ گھر اپنے نام کروالیا تھا اور یہ اسی صورت ممکن تھا کہ اس نے اپنے مرحوم چھوٹے بھائی اور اس کے لواحقین یعنی آپ دونوں کی طرف سے کوئی کلیئرنس پیش کی ہو، کوئی ایسا چکر چلایا ہو جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ اس نے آپ لوگوں کو آپ کا جائز حق ادا کر دیا ہے۔ لہٰذا اب اس مکان سے آپ لوگوں کا کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا۔ عدالت ہر بات کے لئے ثبوت مانگتی ہے۔ مکار اور عیار لوگ پیسے کے بل بوتے پر ہر قسم کے ثبوت تیار کر اور کروا لیتے ہیں۔ اور خاص طور پر جب دوسری پارٹی منظر عام سے ہٹ جائے تو یہ کام اور بھی آسان ہو جاتا ہے۔ ان بہت سے اگر مگر اور چونکہ چنانچہ کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نجیب اللہ نے آپ لوگوں کو اس گھر سے بے دخل کرنے کے بعد کوئی نہ کوئی ایسا قانونی چکر ضرور چلایا ہوگا جس کے نتیجے میں وہ اس غیر منقولہ جائیداد کا بلا شرکت غیرے مالک بن گیا ہوگا۔''

میں نے لحاتی توقف کر کے اپنی سانس درست کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کیس کو زندہ کرنے کے لئے ہمیں ماضی کے دھندلکوں میں جھانکنا ہوگا۔ برسوں سے ظلم اور ناانصافی کی راکھ میں دبی ایک سنگین حقیقت کی چنگاری کو دوبارہ ہوا دینا ہوگی۔ جب تک وہ چنگاری ایک مرتبہ پھر شعلے کا روپ نہیں دھارے گی، ہم اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔ دشمن پر وار کرنے کے لئے اس کی کمزوریوں کو نگاہ میں لانا ہوتا ہے....... اور اس سلسلے میں آپ کو میری مدد کرنا ہوگی۔''

''ہم ہر قسم کی مدد اور تعاون کے لئے تیار ہیں۔'' طارق نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ حکم کریں۔''

اس پیشہ ورانہ ملاقات کے دوران ان کے حالات سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے میں اپنے ذہن میں ایک مناسب سالائحہ عمل تیار کر چکا تھا۔ اسی پلاننگ کے تحت میں نے انہیں ضروری ہدایات دیں اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''آپ میری ہدایت پر عمل کریں اور جلد از جلد مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ میں اپنی ڈوریاں ہلاتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے آپ فوری طور پر عدالت میں کیس دائر نہیں کر رہے؟'' طارق نے فوراً درست اندازہ قائم کرلیا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''کوئی بھی عمارت کھڑی کرنے کے لئے سب سے پہلے بنیاد رکھی جاتی ہے۔ عمارت کو جتنا بھی بلند اور محفوظ بنانے کا ارادہ ہو، بنیاد کو اتنا ہی زیادہ مضبوط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کیس بھی ایک عمارت کی طرح ہوتا ہے۔ اگر اس کی مضبوط بنیاد ہمارے ہاتھ میں نہیں ہوگی تو ہماری کامیابی مشکوک ہو جائے گی۔ تیاری کے بغیر اکھاڑے میں اترنے والوں کو ہمیشہ منہ کی کھانا پڑتی ہے اسی لئے میں نے آپ کے ذمے ایسے کام لگائے ہیں جو ہماری کامیابی کو یقینی بنائیں گے۔''

نادرہ خاتون میری بات کی تہہ میں پہنچ گئی۔ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اُس نے کہا۔

''وکیل صاحب! آپ فی الحال کس قسم کی ڈوریاں ہلانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''میں آپ کی جیٹھانی مسماۃ بہار بیگم کے نام ایک نوٹس ارسال کرنا چاہتا ہوں۔ اس نوٹس کے جواب میں دوسری طرف سے جو ردِ عمل سامنے آئے گا اس کو دیکھتے ہوئے ہم اپنی حکمت عملی ترتیب دیں گے۔''

''ہاں، یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔'' نادرہ خاتون نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ ''اور جب تک مذکورہ نوٹس کا کوئی جواب نہیں آ جاتا، آپ لوگ اپنا ہوم ورک مکمل کرلیں۔ آپ میرا مطلب تو سمجھ رہے ہیں نا؟''

''جی وکیل صاحب!'' نادرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''میں تو آپ کی بات اچھی طرح سمجھ رہی ہوں مگر آپ طارق کو نصیحت کر دیں کہ یہ ایسے ویسے خیالات کو ذہن سے نکال دے۔ اس کی طرف سے مجھے ایک دھڑکا سا لگا ہوا ہے۔''

میں نے طارق کی طرف دیکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں نادرہ خاتون سے کہا۔ ''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ماشاء اللہ بڑا ہونہار اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ میں اسے اس معاملے کی اُونچ نیچ اچھی طرح ذہن نشین کروا دوں گا۔ ویسے بھی.......''

میں نے لمحہ بھر کا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''ویسے بھی اب آپ لوگوں نے یہ کیس میرے ہاتھ میں دے دیا ہے لہٰذا اگر مجھے بتائے بغیر آپ کوئی بھی قدم اُٹھائیں گے یا اس کیس کے حوالے سے آپ کسی اور شخص سے کسی بھی نوعیت کی کوئی ڈیل کریں گے تو میں اسی لمحے اس کیس میں سے اپنا ہاتھ اُٹھا لوں گا۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام........!''

''نہیں بیگ صاحب!'' طارق نے عجلت آمیز لہجے میں کہا۔''میں آپ سے پوچھے بنا اور آپ کو بتائے بغیر ایک اِنچ بھی اِدھر سے اُدھر نہیں ہلوں گا۔ انشاء اللہ آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں ملے گا۔''

میں نے اس کے بعد نادرہ خاتون اور طارق سے چند اہم کاغذات کی تیاری کے سلسلے میں ضروری گفتگو کی، اپنی فیس وصول کی اور انہیں پندرہ روز بعد دوبارہ رابطہ کرنے کا کہہ کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔ طارق نے بڑے جوش بھرے انداز میں مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا اور نادرہ خاتون مجھے دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہو گئی۔

جاتے جاتے میں نے طارق کے ذمے یہ کام بھی لگا دیا کہ وہ پہلی فرصت میں مجھے اپنی تائی بہار بیگم کا پوسٹل ایڈریس لا دے۔ ایسا پتہ جس پر بھیجا جانے والا رجسٹرڈ نوٹس اس تک پہنچ جائے۔

اگلے روز وہ مذکورہ ایڈریس لے کر میرے پاس آ گیا۔ یہ ایڈریس ایک معروف اپارٹمنٹس بلڈنگ کے ایک فلیٹ کا تھا جو گلشن چورنگی کے نزدیک ایک بارونق علاقے میں واقع تھی۔

میں نے نادرہ خاتون کے کیس پر بہت غور کیا۔ یہ سراسر رِسک لینے والی بات تھی۔ میری جگہ اگر کوئی اور وکیل ہوتا تو شاید اس معاملے میں ہاتھ نہ ڈالتا کیونکہ ایسے معاملات میں کمائی کم اور جھمیلے زیادہ ہوتے ہیں جن میں اُلجھنے کے بعد بہت سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے نادرہ خاتون اور اس کے بیٹے نے کسی دروغ گوئی سے کام نہ لیا ہو۔ ان کے ساتھ ماضی میں واقعی بہت زیادتی ہوئی ہو۔ اس کیس کے سلسلے میں، میں نے اپنا ایک ذہن بنا لیا تھا۔ اگر میرے بھیجے گئے نوٹس کے جواب میں دوسری طرف سے شدید یا خفیف ردِّعمل دیکھنے کو ملتا تو مجھے اپنی پلاننگ پر عمل کرنے میں آسانی رہتی۔ میں کچھ اس نوعیت کی سیٹنگ چاہتا تھا کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے........ یعنی عدالت کا منہ دیکھے بغیر ہی یہ کیس حل ہو جائے۔

وکالت، قانون اور انصاف کی تعلیم دیتے وقت ہمیں سکھایا گیا تھا کہ عدالت اور مقدمے

بازی کو ناگزیر بنانے کی کوشش نہیں کرنا چاہئے۔ ایک سمجھ دار، بردبار اور تجربہ کار وکیل وہ ہے جو دونوں پارٹیوں کو اس طرح ہینڈل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو کہ انہیں ایک دوسرے سے نمٹنے کے لئے عدالتی بکھیڑوں میں نہ اُلجھا پڑے۔ وکیل کے دفتر کو ایک طرح سے مصالحتی کونسل کا کردار ادا کرنا چاہئے۔ اسی قسم کا تصور پولیس اسٹیشن کے حوالے سے بھی ہونا چاہئے۔ ایک تھانہ انچارج کو درحقیقت کسی ثالث کی طرح اپنے فرائض ادا کرنے چاہئیں۔ لیکن عام طور پر ایسا ہوتا نہیں ہے اور اس کی بھی بہت سی وجوہات ہیں۔

دراصل بات یہ ہے کہ پولیس اور وکیل لوگوں کی نظر میں اتنے قابلِ اعتبار نہیں ہیں جیسا کہ انہیں ہونا چاہئے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ رقم وصول کر کے مخالف پارٹی کے ساتھ مل جائیں گے۔ لوگوں کا ایسا سمجھنا بھی مکمل طور پر غلط نہیں۔ بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ لوگوں کی آراء کی تصدیق میں چند مثالیں بھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ لیکن یہ قطعی مناسب نہیں کہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں کسی ایک شخص یا معدودے چند افراد کی ''کارکردگی'' کو فارمولا بنا کر دوسروں پر تھوپ دیا جائے۔ ہر محکمے میں کالی بھیڑوں کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو کیس عدالت میں قدم رکھے بغیر مصالحت کی راہ اختیار کرتے ہوئے نمٹا لیا جائے وہ سب سے کامیاب کیس کہلانے کا مستحق ہے۔ اور وہ وکیل جو اس طریقۂ کار سے دونوں فریقوں کو مطمئن کر کے معاملہ سیٹل کر دے وہ واقعی تعریف کے قابل ہے کیونکہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا نظر آتا ہے۔

آئندہ دو روز میں نادرہ اور طارق نے ابتدائی معلومات مجھے فراہم کر دیں اور پندرہ روز بعد دوبارہ حاضر ہونے کا وعدہ کر کے میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔ میں نے ان نکات کی مدد سے ایک طویل نوٹس تیار کروایا۔ اس نوٹس میں بعض ایسی باتیں بھی تھیں جن کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا۔ لیکن وقت پڑنے پر ان کی توجیہہ پیش کر کے میں سچویشن کو ٹیکل کر سکتا تھا۔ درحقیقت یہ اندھیرے میں چلائے ہوئے وہ تیر تھے جن میں سے اگر ایک بھی نشانے پر جا بیٹھتا تو اس معاملے کا پانسہ ہماری جانب پلٹ سکتا تھا۔

اس رجسٹرڈ نوٹس کو حوالۂ ڈاک کرنے کے بعد میں جواب کا انتظار کرنے لگا۔

***

چند روز کے بعد ایک پستہ قامت شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ اچھے اور برے چہرے سب اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ہیں لہٰذا اس سلسلے میں کسی برے چہرے کے حامل شخص کو مذاق یا تنقید کا نشانہ بنانا مستحسن عمل نہیں۔ لیکن مذکورہ شخص کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں دورِ

گزشتہ کے ریل کے انجن کا تصور جاگ اُٹھا تھا۔ آج کل اس شکل کے انجن صرف پہاڑی علاقوں میں ریل کو کھینچنے کے کام آتے ہیں یا پھر ننھے منے بچوں کی نظموں میں جگہ پاتے ہیں جیسے......ریل کا انجن پیارا پیارا، چھک چھک، چھک چھک کرنے والا۔

میں نے متذکرہ بالا شخص کا پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

اس پر نگاہ پڑتے ہی میں نے یہ اندازہ تو لگا لیا تھا کہ وہ اس وقت خاصا برہم تھا۔ لیکن ظاہر ہے، میں اس کی برہمی کا سبب نہیں جانتا تھا۔ وہ میری پیشکش کے جواب میں بڑے پھوہڑ پن سے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا تو میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

اُس نے میرے سوال کے جواب میں اپنی جیبوں کو ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ ''مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ آپ ہی ہیں؟''

''جی، میں ہی ہوں۔'' میں نے بڑی باریک بینی سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

وہ برہم تو تھا ہی، اس کے علاوہ خاصا نروس بھی دکھائی دیتا تھا۔ پستہ قامت اور مائل بہ فربہی بدن نے اس کی برہمی میں ایک عجیب سا مضحکہ خیز تاثر پیدا کر دیا تھا۔ اپنے چہرے کے خطوط سے وہ ایک ایسا شخص نظر آتا تھا جسے جلد غصہ آ جاتا ہو اور غصے کی حالت میں اسے خود پر کنٹرول نہ رہتا ہو۔ یہ تصور کرنے میں مجھے قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ غیظ و غضب کے عالم میں وہ کتنے خطرناک انداز میں دھواں اور سیٹی ایک ساتھ دیتا ہوگا۔ اس کے چہرے کی رنگت کے طفیل بڑے دعوے سے کہا جا سکتا تھا کہ وہ طیش میں لال پیلا ہونے کی بجائے بینگنی رنگ اختیار کر جاتا ہوگا۔

جب میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں یہ تصدیق کر دی کہ میں ہی مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہوں تو وہ اپنی جیب میں سے ایک پیکٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے غصیلے لہجے میں مستفسر ہوا۔

''یہ کارنامہ یقیناً آپ ہی نے انجام دیا ہے؟''

اس کے ہاتھ میں موجود پیکٹ کو دیکھتے ہی میں پہچان گیا تھا۔ یہ بھورے رنگ کا وہی رسٹرڈ نوٹس تھا جو چند روز قبل میں نے طارق کی تائی بہار بیگم کے نام پوسٹ کیا تھا۔ لیکن سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی میں انجان بن گیا۔

''کیا ہے یہ؟'' میں نے اس کے ہاتھ سے وہ لفافہ لیتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔
''آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہونا چاہئے کہ یہ کیا ہے۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ اسے آپ کے دفتر سے روانہ کیا گیا ہے اور بھیجنے والے کا نام مرزا امجد بیگ ہے........ مرزا امجد بیگ یعنی آپ۔''

میں نے مذکورہ لمبوترے براؤن لفافے کو اپنے ہاتھوں میں گھماتے پھراتے ہوئے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ہاں، یہ کچھ جانا پہچانا تو لگ رہا ہے۔ بہر حال، مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ؟'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''اس حرکت کا آخر مقصد کیا ہے؟''

''آپ کی تعریف؟'' میں نے اُس کے انداز پر مشتعل ہوئے بغیر استفسار کیا۔

وہ غصے سے بولا۔ ''میں اپنا تعارف تو بعد میں کراؤں گا، پہلے مجھے معلوم ہونا چاہئے، آپ اس قسم کے نوٹس سے آخر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ ایک بات کان کھول کر سن لیں کہ ہم بلیک میلنگ جیسے اوچھے ہتھکنڈوں میں آنے والے نہیں ہیں۔''

اُس کے بات کرنے کا انداز اخلاق سے گرا ہوا تھا لیکن میں نے ضبط کے بندھن کو بڑی مضبوطی سے تھامے رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شاید یہ نوٹس غلط ہاتھوں میں چلا گیا ہے۔ میں نے اسے کسی بہار بیگم کے نام پوسٹ کیا تھا اور آپ یقیناً بہار بیگم نہیں ہیں۔ بہار بیگم ہرگز ایسی نہیں ہوسکتیں، بہر حال۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد استفساریہ انداز میں کہا۔

''آئی ایم سوری مسٹر........؟''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بے ساختہ بولا۔ ''نوشاد علی۔''

''اوہ........!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کو جو تکلیف ہوئی اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ یہ مجھے ڈاک والوں کی غفلت لگتی ہے۔ کہاں کا خط کہاں پہنچا دیا۔ بہر حال........ مسٹر نوشاد علی!'' میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے بھی سنگین غلطی ہوئی ہے۔ جب یہ رجسٹری آپ کے نام نہیں تھی تو آپ نے وصول ہی کیوں کی؟ اور اگر کسی غلط فہمی میں وصول کر لی تھی تو اسے کھولنا نہیں چاہئے تھا........ میں دیکھ رہا ہوں آپ نے اس رجسٹرڈ لیٹر کا اچھا خاصا پوسٹ مارٹم کر ڈالا ہے۔'' بات کے اختتام پر میں نے حقارت بھرے انداز میں منہ سے ''چچ چچ'' کی آواز نکالی۔

میری سیکرٹری نے جب اس ''توا'' مارکہ ریل کے انجن کو میرے چیمبر میں بھیجا تھا تو اس کا نام بھی بتایا تھا لیکن اس وقت میں نے اس نام پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی اور سمجھا تھا، ہوگا کوئی

نوشادعلی۔ لیکن اس رجسٹرڈ نوٹس کے ریفرنس سے میں اس کے تاریخ و جغرافئے سے بہ خوبی آگاہ ہوگیا تھا۔ وہ نجیب اللہ مرحوم کے بچوں کا نام نہاد ماموں نوشادعلی تھا۔
میری ''پچ پچ'' نے اس کی برہمی میں کچھ ایسا اثر دکھایا جیسے جلتی پر مٹی کا تیل دکھاتا ہے۔ وہ پھنکار سے مشابہہ لہجے میں بولا۔
''مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اور نہ ہی یہ نوٹس غلط ہاتھوں میں پہنچا ہے۔''
''اچھا!'' میں نے بڑی سنجیدگی سے اس کا مذاق اُڑایا۔''تو بہار بیگم آپ ہی ہیں؟''
وہ ایک دم ہتھے سے اُکھڑ گیا۔''مسٹر بیگ!'' اس کی شخصیت کی 'روشنی' میں کہا جا سکتا ہے، وہ یکلخت 'پٹڑی' سے اُتر گیا تھا۔ دھمکی دینے والے انداز میں اس 'چھک چھک ریل کے انجن' نے مجھ سے کہا۔''آپ مجھے جانتے نہیں ہو کہ میں کتنا خطرناک آدمی ہوں۔''
''وہ تو آپ نہ بھی بتائیں تو شکل ہی سے نظر آرہا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔''آپ کو بھی زبان کھولنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ آپ اس وقت ایک وکیل کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ کے تعارفی الفاظ ایک سنگین نتیجے کی حامل دھمکی کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ بعد میں آپ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں۔''
میرے ان سخت اور دھمکی آمیز الفاظ نے اس کے چہرے کے تاثرات میں نمایاں تبدیلی کو اُبھارا، میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ اپنی غصیلی اور دھونس دھاندلی بردار بنیاد سے تھوڑا سا ہل گیا تھا تاہم جلد ہی اس نے اپنی کمزوری پر قابو پالیا اور بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔
''آپ مجھے قانون وغیرہ سے ڈرانے کی کوشش نہ کریں۔ میں نے پولیس، کورٹ بہت دیکھ رکھی ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' میں نے بے پرواہی سے شانے اُچکا دیئے۔''پھر تو کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی معاملے میں آپ سے عدالت میں ہی ملاقات ہوگی۔''
''عدالت میں جو ہوگا، اسے بھی ہم دیکھ لیں گے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔''فی الحال تو آپ مجھے اس نوٹس کے بارے میں بتائیں؟''
رجسٹرڈ نوٹس والا مذکورہ مستطیل لفافہ میری نگاہ کے سامنے میز پر رکھا تھا۔ میں نے با آہستگی وہ لفافہ اُٹھا کر میز کی دراز میں رکھ دیا، پھر نوشادعلی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔
''یہ بہت اچھا ہوا کہ میرا بھیجا ہوا نوٹس غلط ہاتھوں میں کھیلنے کے بعد واپس میرے پاس

پہنچ گیا۔اب مجھے مسماۃ بہار بیگم سے براہِ راست بات کرنے میں آسانی رہے گی۔''
میں نے پہلی مرتبہ اس کے انداز میں لچک پیدا ہوتے دیکھی۔ وہ قدرے سلجھے ہوئے لہجے میں بولا۔''میں بہار بیگم کی طرف ہی سے آیا ہوں۔آپ کو جو بھی کہنا ہو، مجھ سے کہہ سکتے ہیں۔''
''سوری مسٹر! میں قانونی معاملات میں غیر متعلقہ افراد سے بات نہیں کرتا۔''
''میں غیر متعلق نہیں ہوں۔'' وہ وضاحتی لہجے میں بولا۔''بہار بیگم میری چھوٹی بہن ہے۔''
میں نے چبھتے ہوئے انداز میں پوچھا۔''آپ بہار بیگم کے بڑے بھائی ہیں؟''
''جی .... بالکل!'' وہ قدرے گڑبڑاتے ہوئے بولا۔
''لگتے تو نہیں ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
وہ میرے طنز کی حقیقت تک نہ پہنچ سکا، جلدی سے بولا۔''دراصل میں اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا ہوں۔عمر میں، میں بہار بیگم سے پانچ چھ سال بڑا ہوں مگر لگتا نہیں ہوں۔''
بات ختم کر کے وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے میں اُس کی پیش کردہ وضاحت سے کلی طور پر مطمئن ہو گیا ہوں۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اگر آپ واقعی بہار بیگم کے بڑے بھائی ہیں تو پھر اس نوٹس کے سلسلے میں آپ سے بات ہو سکتی ہے۔آپ کو کیا کنفیوژن ہے؟''
وہ بتانے لگا۔''آپ نے اس نوٹس میں جو دعوے کئے ہیں ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ....میرا مطلب ہے نادرہ خاتون نے آپ کے سامنے غلط بیانی کی ہے۔وہ اور اس کا بیٹا طارق، ناظم آباد والے گھر پر کسی قسم کا حق نہیں رکھتے۔شاید انہوں نے آپ کو حقائق سے آگاہ نہیں کیا ورنہ آپ جیسا قابل وکیل اس کیس کو ہاتھ میں لینے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔''
آخری جملہ اس نے مجھے مکھن لگانے کے لئے ادا کیا تھا۔ وہ خاصا ہوشیار اور چالباز شخص دکھائی دیتا تھا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ میں اُس کی دھونس میں نہیں آیا تو اس نے اپنے رویے میں نمایاں تبدیلی کر لی تھی۔ شائستہ تو وہ اب بھی نہیں تھا تاہم اس کے انداز میں معقولیت در آئی تھی۔ میں نے سر دست اسی کو گھسنے کا فیصلہ کیا اور اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''میں آپ کی بات کو یکسر رد نہیں کروں گا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے، میرے پاس آنے والا ہر شخص خود کو بے قصور، حق دار اور مظلوم ظاہر کرتا ہے اور مجھ سے ہر ممکن مدد کا امیدوار نظر آتا ہے اس لئے اس بات کے امکانات بہرحال موجود ہیں کہ نادرہ خاتون نے مجھ سے دروغ گوئی کی ہو۔ بہرحال ....'' میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور نہایت ہی

رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''نوشاد صاحب! اس نوٹس میں نادرہ خاتون کی طرف سے جو بلند و بانگ دعوے کئے گئے ہیں انہیں تھوڑی دیر کے لئے فراموش کر کے آپ مجھے حقیقت سے آگاہ کریں۔ میں آپ کی زبان سے ان حقائق کی نقاب کشائی ہوتے ہوئے سننا چاہتا ہوں۔''

وہ بڑی آسانی سے میرے پھیلائے ہوئے نادیدہ جال میں قدم رکھ بیٹھا۔ چند لمحات تک اس نے مجھے تعریفی انداز میں دیکھنے کا عمل جاری رکھا اور یہ ٹٹولنے کی کوشش کرتا رہا کہ مجھ پر اعتماد کرنا چاہئے یا نہیں۔ پھر وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات نے مجھے بتا دیا کہ وہ مجھے اعتماد میں لینے کا حامی ہے۔ گویا میری چال صد فیصد کامیاب رہی تھی۔

''بیگ صاحب!......'' وہ 'مسٹر بیگ' سے 'بیگ صاحب' پر آتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''میں اس نوٹس کی ترسیل کے سلسلے میں آپ کو قصوروار سمجھ رہا تھا لیکن آپ سے ملنے کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں غلطی پر تھا۔ آپ انتہائی معقول اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ یقیناً نادرہ بیگم ہی نے آپ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ نہیں کیا۔ وہ نہایت ہی مکار اور چالاک عورت ہے۔ اسے جیسے ہی معلوم ہوا، بہار بہن نے ناظم آباد والا گھر فروخت کر دیا ہے، وہ موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے سامنے آ گئی اور آپ کو آلۂ کار بنانے کی کوشش کر ڈالی۔ اس سے کوئی یہ پوچھے کہ پندرہ سال تک اپنی زبان پر مہر لگائے کیوں بیٹھی تھی؟''

اچانک اس کے چہرے پر نادرہ خاتون کے لئے ناگواری کے تاثرات اُبھر آئے تھے۔ میں نے اس موقع پر کوئی مداخلت ضروری نہ جانی اور خاموش بیٹھا اسے سنتا رہا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔

''بیگ صاحب! میں آپ کو حقیقت بتاتا ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ میرا بہنوئی نجیب اللہ...... اللہ اُسے جنت نصیب کرے، بڑا ہی اصول پرست اور ایمان دار شخص تھا۔ حبیب اللہ کی وفات کے بعد نادرہ کے شوہر حسیب نے جائیداد کے بٹوارے کی آواز اُٹھائی تو نجیب کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو سمجھانے کی حتیٰ الامکان کوشش کی لیکن وہ اپنی بیوی نادرہ کی پٹی پر چڑھا ہوا تھا لہٰذا کوئی بھی معقول بات سننے اور سمجھنے کو تیار نہ ہوا۔ اس پر نجیب نے مجبور ہو کر اس پر واضح کر دیا کہ وہ اپنا آبائی گھر فروخت نہیں ہونے دے گا۔ اگر اُسے بٹوارے اور اپنا حق وصول کرنے کا زیادہ ہی شوق ہے تو مکان کی موجودہ مالیت کا نصف وہ اسے دینے کو تیار ہے۔ حسیب فوراً اس تجویز پر تیار ہو گیا۔ چنانچہ نجیب نے جائیداد کے ماہرین سے مکان کی مارکیٹ ویلیو نکلوائی اور اس رقم

کا نصف حسیب کے حوالے کر دیا۔''

وہ یہاں تک بتانے کے بعد سانس لینے کے لئے متوقف ہوا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''لیکن بعد کے حالات سے تو ثابت ہوتا ہے کہ حسیب کے پاس کوئی بڑی رقم موجود نہیں تھی۔ نادرہ نے اس رقم کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں کیا؟''

نوشاد علی اچھی خاصی تیاری کے بعد میرے پاس آیا تھا۔ اس مکار کے پاس ممکنہ ہر سوال کا جواب موجود تھا، معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے کہا۔

''بیگ صاحب! یہ نادرہ بیگم خود کو بڑی ہوشیار اور چالاک سمجھتی ہے۔ لیکن اس کا خاوند اس سے دس ہاتھ آگے تھا۔ حسیب نے نادرہ کو رقم کی ہوا بھی نہ لگنے دی۔ دراصل وہ گزشتہ چند برس سے اچھا خاصا مقروض چلا آ رہا تھا۔ اُس نے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ نجیب سے حاصل ہونے والی رقم کو اپنے قرضے چکانے میں خرچ کر دیا۔ نادرہ کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ اس کا شوہر جائیداد کا حصہ وصول کر چکا ہے۔ ممکن ہے چند روز بعد یہ بات کسی اور ذرائع سے کھل کر سامنے آ جاتی، لیکن حسیب کی خوش قسمتی کہ زندگی نے اُسے اتنی مہلت نہ دی۔ یہ بات طے تھی کہ اپنا حصہ حاصل کرنے کے بعد اسے وہ گھر چھوڑ کر اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کرنا تھا۔ وہ اب اس گھر پر کوئی حق نہیں رکھتا تھا۔ نجیب اللہ ہی اس آبائی مکان کا بلاشرکت غیرے مالک و مختار تھا۔ مگر وقت نے اچانک کروٹ لی۔ اُس کی فیکٹری کے بوائلر میں ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ دنیا چھوڑ کر چلا گیا۔'' وہ ایک مرتبہ پھر لمحہ بھر کو خاموش ہوا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''حسیب کی موت کے کچھ عرصے بعد نادرہ نے اپنے جیٹھ سے مکان کے بٹوارے کی بابت استفسار کیا۔ وہ دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والی بات چیت سے تو واقف تھی لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اُس کا شوہر مکان میں اپنے حصے کی رقم وصول کر چکا ہے۔ جب نجیب نے اُسے حقیقت حال سے آگاہ کیا تو وہ فوراً ہتھے سے اُکھڑ گئی۔ نجیب جب اس کی کسی چالبازی میں نہ آیا تو نادرہ نے پسپائی اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی اور اپنے بیٹے کو لے کر اپنے بھائی کے پاس کورنگی چلی گئی۔ پندرہ سال گزر جانے کے بعد پتہ نہیں اس کے پیٹ میں کیوں مروڑ اُٹھ رہی ہے؟''

میں بڑی توجہ اور دلچسپی سے اپنے سامنے بیٹھے ریل کے قدیم انجن کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ابھی ابھی مجھے جو کہانی سنائی تھی وہ اس کہانی کے بالکل برعکس تھی جو میں نادرہ خاتون کی زبانی سن چکا تھا۔ اس شاطر شخص کے گرد اپنا شکنجہ مزید ٹائٹ کرنے کی خاطر میں نے اس سے پوچھا۔

''مسٹر نوشاد علی! یہ تو آپ بڑی عجیب و غریب داستان سنا رہے ہیں۔ بہر حال آپ کی باتوں میں مجھے اچھا خاصا وزن محسوس ہو رہا ہے۔ یہ نادرہ خاتون تو واقعی بڑی عیار اور فتنہ پرور عورت ہے۔''

میرے ان کلمات سے وہ یہی سمجھا کہ میں اس کے شیشے میں اتر چکا ہوں۔ مجھے اپنا ہم نوا پاتے ہی اس نے کہا۔''وہ دغا باز عورت اب اگر آپ کے دفتر کے زینے چڑھے تو اُسے بری طرح ڈانٹ کر بھگا دیجئے گا۔''

''یہ تو مجھے کرنا ہی ہے۔ لیکن سلیقے سے۔'' میں نے اُس کی خوشی کی خاطر گمبھیر انداز میں کہا۔''اس سلسلے میں آپ کو مجھ سے تعاون کرنا ہوگا۔''

اندرونی خوشی سے اس کا چہرہ باغ و بہار ہو گیا۔ گویا میں نے اس کے دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رقصاں شیطنت نے مجھے بتا دیا کہ وہ نادرہ خاتون کے لئے کس قسم کے معاندانہ اور خبیثانہ خیالات رکھتا تھا۔ مجھے اپنی راہ میں ہموار دیکھتے ہی وہ پوری سفاکی سے بولا۔

''آپ حکم کریں بیگ صاحب! چوبیس گھنٹے کے اندر اندر آپ نوشاد علی کی طاقت دیکھ لیں گے۔

''حکم کریں'' کے الفاظ اُس نے اتنی سنگینی سے ادا کئے تھے کہ مجھے یوں محسوس ہوا، وہ کہہ رہا ہو کہ اگر آپ کا اشارہ ہو تو وہ نادرہ خاتون کو دائمی خاموشی سے بھی ''سرفراز'' کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ کمینہ شخص پرت پرت کھل کر سامنے آ رہا تھا۔ میں نے اس کی سفاک آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نوشاد علی! مجھے آپ کی صلاحیت میں کسی قسم کا کوئی شک نہیں۔ لیکن ہمارے درمیان ایک واضح فرق پایا جاتا ہے۔''

''کیسا فرق؟'' اس نے آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔''آپ ہر کام طاقت کے بل بوتے پر کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ جبکہ میں کاغذ اور قلم کی مار مارنے کا قائل ہوں۔''

میرے معنی خیز انداز نے اُسے اُلجھن میں ڈال دیا۔ وہ بے خبری میں میرے بچھائے ہوئے جال میں قدم رکھ چکا تھا اور میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کے گرد اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا چلا جا رہا تھا۔ اُس کی اُلجھن کو رفع کرتے ہوئے میں نے اُسے بتایا۔

''میں نے نادرہ خاتون کے سلسلے میں آپ سے جس تعاون کی درخواست کی ہے اس کا

تعلق کاغذ اور قلم سے ہے۔ اگر آپ میری مدد کرنے کو تیار ہو جائیں تو میں اس دروغ گو عورت کو ایسی مصیبت میں پھنساؤں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گی، کس وکیل سے پالا پڑا تھا۔''

انسانی نفسیات سے کھیلنا دنیا کا سب سے بڑا اور دلچسپ کھیل ہے۔ بلاشبہ علم نفسیات تمام علوم کا باپ ہے۔ میں اس وقت نوشاد علی کی مخصوص نفسیات سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان جس شخص کو ناپسند کرتا ہو، اس سے نفرت کرتا ہو، ایسے شخص کے خلاف بات سن کر بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے۔ نوشاد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ نادرہ خاتون ان لوگوں کے لئے ایک دشمن کی حیثیت رکھتی تھی لہٰذا میرے منہ سے اس کی مخالفت میں خارج ہونے والا ہر لفظ اس کے لئے طمانیت کا باعث تھا۔ ان لمحات میں، میں دراصل اُسے قلبی سکون فراہم کر رہا تھا۔

اُس کی باچھیں ایک فوری مسرت کے باعث بے حد چوڑی ہو گئیں۔ رازدارانہ لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کاغذ قلم کے حوالے سے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں بیگ صاحب؟''

میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''کاغذ قلم تو میں نے محاورتاً استعمال کیا ہے۔ دراصل اس سے میری مراد قانونی دستاویز تھی۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''قانونی دستاویز........ میں کچھ سمجھا نہیں بیگ صاحب!''

وہ پوری طرح میرے ٹرانس میں آ چکا تھا۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''نوشاد صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ کا بہنوئی نجیب اللہ مرحوم خاصا عاقل اور بردبار شخص تھا۔ مجھے یقین ہے جب اس نے اپنے چھوٹے بھائی حبیب اللہ کو مکان کے نصف حصے کی مد میں ایک بڑی رقم ادا کی ہوگی تو اس ادائیگی کے سلسلے میں کوئی پکا کاغذ ضرور تیار کیا ہوگا۔ میرا مطلب ہے، اسٹامپ پیپر پر باقاعدہ قانونی دستاویز، جس پر دونوں مرحومین کے علاوہ دو گواہان کے دستخط اور نام و پتہ بھی درج ہوگا؟''

''جی ہاں!........ بالکل۔'' وہ بڑی شدت سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بہت ضروری تھا۔ اس دستاویزی ثبوت کے بغیر حبیب اللہ کا وہ آبائی مکان نجیب اللہ کے نام منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ دو بھائیوں کی وراثت کا معاملہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ جب تک حبیب اللہ کی دستبرداری کا ٹھوس ثبوت عدالت میں پیش نہ کیا جاتا، اس مکان کی رجسٹری نجیب اللہ کے نام نہیں ہو سکتی تھی۔''

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! آپ قانون اور قانونی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ نجیب اللہ نے حسیب اللہ کی موت کے کچھ عرصہ بعد ہی مکان کی رجسٹری اپنے نام کروالی تھی۔ نادرہ بیگم تو کسی بھی صورت حق جتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ پتہ نہیں، بیٹھے بٹھائے اس کے دماغ میں یہ کیڑا کیوں کلبلایا ہے؟''

''نوشاد صاحب! کیڑا کلبلایا ہے تو اس کیڑے کو شانت بھی کرنا پڑے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگر آپ مجھے اس اسٹامپ پیپر کی ایک کاپی لا دیں تو میں نادرہ خاتون کو ایسے چکر میں پھنساؤں گا کہ نانی، دادی روزانہ خواب میں آئے گی۔ اور اگر اصل دستاویز مل جائے تو کیا کہنے۔'' میں لمحہ بھر کو ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا، پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے لئے میری ایک شرط ہوگی۔''

''کیسی شرط؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے خالص کاروباری لہجے میں کہا۔ ''میرے لئے سب سے اہم میری فیس ہے۔ اگر میں آپ کی موافقت میں کام کروں گا تو آپ کو میری فیس بھی ادا کرنا ہوگی۔''

وہ مکار اور ظالم شخص ہر حوالے سے نادرہ اور اس کے بیٹے کا برا چاہتا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ سفاکی بھرے لہجے میں اس نے کہا۔ ''مجھے منظور ہے بیگ صاحب! اگر آپ نادرہ بیگم کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں تو میں آپ کی فیس ادا کرنے کو تیار ہوں۔ بتائیں، آپ کی فیس کتنی ہے؟''

میں نے اُسے اپنی فیس کی رقم کے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''آپ آئندہ جب میرے پاس آئیں تو وہ دستاویز بھی ساتھ لیتے آئیں۔ اسی وقت میں فیس بھی وصول کرلوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔ پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب میں چلتا ہوں...... انشاء اللہ بہت جلد دوبارہ ملاقات ہوگی۔''

''انشاء اللہ!'' میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

رخصت ہونے سے قبل اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! ہم صرف یہ چاہیں گے کہ نادرہ نامی وہ عیار عورت کبھی ہماری راہ میں نہ آئے۔ آپ اس پر ہاتھ ہلکا ہی رکھئے گا۔ میں آپ کو جو دستاویز یا اس کی کاپی فراہم کروں گا اسے کسی حساس شعبے میں نہ استعمال کیجئے گا۔ کسی کو مارنے سے ڈرانا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ بے فکر ہو جائیں۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ریل کا قدیم انجن مجھے ذرا پسند نہیں آیا تھا۔ اسے اعتماد میں لے کر میں نے اس کی عیاریوں کی قلعی کھول دی تھی۔ اگر وہ مذکورہ دستاویز یا اس کی فوٹو کاپی لے کر میرے پاس آ جاتا تو ان لوگوں کے فراڈ ہونے پر مُہر ثبوت ثبت ہو جاتی۔

اب تک جو حالات و واقعات مجھ تک پہنچے تھے ان کی روشنی میں مجھے نادرہ خاتون مظلوم اور بہار بیگم ظالم نظر آ رہی تھیں۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ نجیب اللہ اور حسیب اللہ کے درمیان اس نوعیت کی کوئی دستاویز تیار نہیں ہوئی تھی۔ نجیب اللہ نے اپنی بھاوج کو آبائی مکان سے بے دخل کرنے کے بعد یقیناً ایسی کوئی دستاویز بیک ڈیٹ میں تیار کروائی ہو گی تا کہ وہ مکان اپنے نام کروانے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ حسیب اللہ کی موت کے بعد یہ کام نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔

بڑے افسوس کے ساتھ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار ہوں کہ ہمارے یہاں اس قسم کی اپنی مرضی کی دستاویزات تیار کروالی جاتی ہیں۔ اگر انسان پیسہ خرچ کرنے کی استطاعت رکھتا ہو تو ''کام'' کرنے والوں کی کمی نہیں۔ اس ''شعبے'' کے ''ماہرین'' تو ایسا کام کر دکھاتے ہیں کہ اگر ان کی تیار کردہ دستاویز کے ساتھ اصل دستاویز کو رکھ کر دیکھا جائے تو ان کی پراڈکٹ کے مقابلے میں اصل جعلی نظر آنے لگتی ہے۔

ازیں علاوہ اگر نوشاد علی مذکورہ دستاویز یا اس کی کاپی مجھے فراہم کر دیتا تو اس کی پوزیشن اور بھی مشکوک ہو جاتی کیونکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لئے ہم فرض کر لیتے ہیں (اگرچہ یہ ممکن نظر نہیں آتا) کہ حسیب اللہ کی حادثاتی موت سے قبل دونوں بھائیوں کے درمیان واقعی اگر ایسی کوئی قانونی دستاویز تیار ہو گئی تھی تو اسے ان کے ناظم آباد والے گھر کی فائل میں موجود ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ اسی مکان سے متعلق تھی۔ ایک بھائی دوسرے بھائی سے اپنا حصہ لے کر حقِ وراثت سے دستبردار ہوا تھا۔ یہ ثبوت اس وقت کام آیا ہو گا جب نجیب اللہ نے آبائی مکان کو اپنے نام کروایا ہو گا۔ جب تک مذکورہ مکان نجیب اللہ کے قبضے اور ملکیت میں رہا یا اس کی موت کے بعد بہار بیگم کے پاس رہا، مکان کے کاغذات کی فائل بھی اسی کے پاس رہی ہو گی۔ اب چونکہ وہ اس مکان کو کسی دوسری پارٹی کے ہاتھ فروخت کر کے ناظم آباد سے گلشن اقبال شفٹ ہو چکی تھی لہٰذا مکان کی فائل اس کی دسترس سے نکل کر اس کے نئے مالکان کے قبضے میں پہنچ گئی ہو گی۔ اگر دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والا وہ معاہدہ ابھی تک ''زندہ'' تھا تو اسے مذکورہ فائل کے اندر موجود ہونا چاہئے تھا۔ اور اس صورت میں نوشاد علی وہ دستاویز مجھے

ہرگز فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ساری تفصیل ایک مفروضے پر منتج تھی اور وہ یہ کہ اگر بالفرض دونوں بھائیوں کے بیچ واقعی کوئی ایسی قانونی دستاویز تیار ہوئی تھی تو؟

مجھے یقین تھا، ایسا کچھ نہیں ہوا ہوگا۔

✵✵✵

نادرہ خاتون اور طارق مجھ سے ملنے آئے تو میں نے انہیں نوٹس کی ترسیل اور نوشاد علی سے ہونے والی ملاقات کے بارے میں مختصراً بتایا۔ تاہم اس میں سے چند ایک باتیں میں نے دانستہ حذف کر دی تھیں۔ ان کے ذکر کی ابھی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً یہی کہ میں نے اس کے سامنے نادرہ اور طارق کو برا بھلا کہا تھا اور اس سے فیس لے کر ان کے خلاف کام کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ مصلحت کا تقاضا تھا۔ پوری بات سننے کے بعد نادرہ خاتون نے کہا۔

''وہ مکار شخص جھوٹ بولتا ہے۔ حسیب اللہ کی دنیا مجھ سے اور طارق سے شروع ہو کر ہمی پر ختم ہو جاتی تھی۔ مکان کے بٹوارے کے سلسلے میں اگر اُس نے کوئی تحریری معاہدہ کر کے نجیب اللہ سے رقم وصول کی ہوتی تو سب سے پہلے وہ مجھے بتاتا۔'' وہ لمحہ بھر کو تنفس درست کرنے کے لئے تھمی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اور یہ قرضے والی بات بھی بالکل بکواس ہے۔ میں حسیب اللہ کے ایک ایک معاملے سے واقف تھی۔ وہ مجھ پر اندھا اعتماد کرتا تھا اور مجھ سے کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔ اگر اس نے کسی سے قرض، اُدھار اُٹھا رکھا ہوتا تو مجھے ضرور بتاتا۔ مجھے تو یہ نام نہاد ماموں ہی فراڈ لگتا ہے۔ پتہ نہیں، یہ اچانک کہاں سے آن ٹپکا ہے۔ میں بارہ تیرہ سال تک ناظم آباد والے گھر میں رہی ہوں۔ بہار بیگم کی شادی مجھ سے دو سال بعد میں ہوئی تھی۔ لگ بھگ دس سال تک ہم دونوں ایک ہی چھت کے نیچے رہی ہیں۔ اس دوران میں نے کبھی کسی نوشاد علی کو بہار بیگم کے بھائی کی حیثیت سے گھر میں آتے جاتے نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی اس کا تذکرہ سننے میں آیا۔ یہ کوئی بہت ہی خطرناک کردار معلوم ہوتا ہے۔''

طارق اس کے خاموش ہوتے ہی بول اٹھا۔ اس کا مخاطب میں تھا۔ ''بیگ صاحب! امی بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ نوشاد علی کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ میری تحقیق کے مطابق وہ کوئی سال بھر پہلے ''پیدا'' ہوا ہے۔''

طارق نے لفظ ''پیدا'' پر اچھا خاصا زور ڈالا تھا۔ میں نے وضاحت کی خاطر اس سے پوچھ لیا۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں یہ کہنا چاہتا ہوں بیگ صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''کہ آج

کل میری تحقیق و تفتیش کا محور و مرکز بہار بیگم اور نوشاد علی ہیں۔ ملازمت کے بعد مجھے جتنا بھی وقت ملتا ہے، میں انہی کی کھوج میں صرف کرتا ہوں۔ نوشاد علی کا کردار، تایا نجیب اللہ کے انتقال کے بعد منظر عام پر آیا ہے۔ بہار بیگم اور نوشاد علی کے رنگ روپ، خدوخال اور رکھ رکھاؤ میں اتنا زیادہ فرق موجود ہے کہ وہ کسی بھی صورت بہن بھائی نہیں ہو سکتے۔ میری تحقیق کے مطابق نوشاد علی کوئی اچھا انسان نہیں۔ مجھے تو وہ کوئی جرائم پیشہ شخص لگتا ہے جس نے تائی بہار بیگم کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے۔''

طارق کی تحقیق و تفتیش بڑے درست زاویے پر تھی، بس فرق اتنا تھا کہ مجھے جن باتوں کا شک تھا، طارق بڑے دعوے سے ان کی تصدیق کر رہا تھا۔ نوشاد علی کی شخصیت اور باتوں سے میں نے یہی تصور قائم کیا تھا کہ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔

نادرہ خاتون نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ''وکیل صاحب! وہ تو آپ سے وعدہ کر کے گیا ہے کہ دستاویز کی نقل (کاپی) یا پھر اصل دستاویز لا کر آپ کو دکھائے گا۔ اگر واقعی اس کے پاس ایسی کوئی دستاویز موجود ہوئی تو ہمارا کیس تو بالکل ہی کمزور ہو جائے گا۔''

نادرہ خاتون اور طارق قانونی باریکیوں اور موشگافیوں سے واقف نہیں تھے اور انہیں قانون پڑھانے کی میرے پاس کوئی فرصت نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے بڑی سادگی سے اسے تسلی دی۔

''آپ فکرمند نہ ہوں خاتون! وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔''

''آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں بیگ صاحب......؟'' طارق نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ تمہارے باپ اور تمہارے تایا کے درمیان ایسا کوئی معاہدہ ہوا ہی نہیں تھا تو وہ کہاں سے یہ دستاویز لے کر آئے گا۔ کیا تم نے اپنی والدہ کی بات غور سے نہیں سنی؟''

''سنی ہے...... بہت غور سے سنی ہے۔'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''لیکن جرائم پیشہ لوگوں سے کسی بھی کمینگی کی توقع رکھنی چاہئے۔ نوشاد علی کا جن لوگوں کے ساتھ زیادہ اٹھنا بیٹھنا ہے وہ سب خاصے بدنام ہیں۔ اگر واقعی کوئی مذکورہ دستاویز کہیں موجود نہیں تو نوشاد علی ایسی دستاویز تیار تو کروا سکتا ہے نا...... اُس کے تو یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''بائیں ہاتھ کا کھیل؟...... کیا مطلب؟''

''مطلب بالکل واضح ہے بیگ صاحب!'' وہ تلخی سے مسکرایا۔ ''نوشاد علی کوئی بھی جعلی دستاویز تیار کروانے کی مالی صلاحیت بھی رکھتا ہے اور سورس بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو

بہت زیادہ محتاط رہ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے بیگ صاحب!''

اس کی ہمدردانہ اور دوستانہ وارننگ کے جواب میں، میں نے کہا۔ ''تمہارے مشورے کا شکریہ طارق! تم فکر نہ کرو، میں اپنے ہر کیس میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا عادی ہوں۔'' پھر لمحہ بھر کے توقف کے بعد میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''تم نے مردود نوشاد کی کسی سورس کا ذکر کیا تھا؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے عرض کیا ہے نا، میری ریسرچ کے مطابق نوشاد علی کا اُٹھنا بیٹھنا اچھے لوگوں کے ساتھ نہیں۔ ان میں ایک سلطان نامی پراپرٹی ایجنٹ ہے جس کی شہرت اس حوالے سے خراب ہے کہ وہ جعلی کاغذات بنا کر پراپرٹی فروخت کرنے کا ماہر ہے۔ وہ ایسے گھروں پر خصوصی نظر رکھتا ہے جو عرصے سے بند پڑے ہوں اور کوئی ان کی دیکھ بھال نہ کر رہا ہو۔ یا پھر ایسے گھر جن کے مالکان ملک سے باہر گئے ہوں اور یہاں ان کی نگرانی کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اس قسم کی جائیداد سلطان کے لئے آسان شکار ثابت ہوتی ہے۔ وہ ایسے گھروں کی فائل تیار کروا کے انہیں کسی مناسب پارٹی دیکھ کر اس کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے۔''

طارق سانس لینے کے لئے لمحہ بھر کو متوقف ہوا تو میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے سلطان پراپرٹی ایجنٹ کا نیٹ ورک خاصا دور تک پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ کسی غیر منقولہ جائیداد کے ایسے کاغذات تیار کروانا جو متعلقہ محکمے سے ویری فائی بھی ہو جائیں، کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ جائیداد کا خریدار رقم کی ادائیگی سے قبل اس گھر کی فائل حاصل کر کے اسے چیک کروانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ مطمئن ہونے کے بعد ہی وہ پے منٹ کے لئے تیار ہوتا ہے۔''

''میں ان کے نیٹ ورک کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں بیگ صاحب!'' طارق معنی خیز انداز میں بولا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر حیرت بھری نظر سے اس کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

اس نے بتایا۔ ''صرف چار افراد مل کر یہ گیم چلا رہے ہیں۔''

''کون سے چار افراد؟'' بے اختیار میری زبان سے نکل گیا۔

طارق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''بیگ صاحب! میں نے پچھلے دنوں نوشاد علی پر بڑی ''محنت'' کی ہے۔ جب انسان کے سر پر پڑتی ہے تو وہ مشکل سے مشکل کام بھی کر گزرتا

ہے۔ میں نے جن چار افراد کا ذکر کیا ہے نا، ان میں دو تو نوشاد علی اور سلطان احمد ہیں۔ سلطان احمد چھ ماہ تک ایک جگہ ٹھہرتا ہے۔ دو چار لمبے لمبے ہاتھ مارنے کے بعد وہ اپنی اسٹیٹ ایجنسی کو شہر کے ایک حصے سے اٹھا کر دوسرے حصے میں لے جاتا ہے تاکہ وہ ہر لحاظ سے محفوظ رہے۔ اس نے اسٹیٹ کے کاروبار میں اپنے ساتھ ایک چھیل چھبیلی عورت بھی رکھی ہوئی ہے جسے وہ اپنی سیکرٹری ظاہر کرتا ہے۔ نازیہ نامی وہ عورت گاہکوں کو پھنسانے اور رجھانے کے فرائض انجام دیتی ہے۔ میں نے اچھی طرح معلوم کرلیا ہے کہ نازیہ، سلطان کی سیکرٹری نہیں بلکہ ''بزنس پارٹنر'' ہے۔ یہ احتیاط اس لئے بھی برتی جا رہی ہے کہ اگر کبھی ان پر برا وقت آن پڑے تو دونوں ایک ساتھ مصیبت کے منہ میں نہ جا گریں۔ ایک پھنسے تو دوسرا اسے اس مصیبت سے نکالنے کے لئے آزاد ہو۔''

نادرہ خاتون ہکا بکا بیٹھی اپنے بیٹے طارق کو دیکھ رہی تھی۔ طارق کی فراہم کردہ معلومات پر میں بھی حیرت زدہ تھا۔ اس نے بہت کم دنوں میں نوشاد علی اور اس کے حواریوں کے بارے میں بیش بہا اور حیرت انگیز حقائق جمع کر لئے تھے۔ میں اس کے ٹیلنٹ کو مان گیا اور تعریفی لہجے میں کہا۔

''طارق! لگتا ہے تم نے ان لوگوں پر پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔''

''کرنا پڑتا ہے بیگ صاحب!'' وہ فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے جن چار افراد کا ذکر کیا ہے ان میں سے تین تو یہ ہو گئے۔ چوتھا کون ہے؟''

اُس نے اُلجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔ ''میں نے تو ابھی آپ کو صرف دو افراد کا انٹروڈکشن دیا ہے بیگ صاحب! نوشاد علی اور سلطان احمد۔''

''اس کا مطلب ہے نازیہ اس چنڈال چوکڑی میں شامل نہیں؟''

''بالکل نہیں جناب!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''اس کی حیثیت تو شامل باجا جیسی ہے۔''

''اوہ.......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر پوچھا۔ ''باقی دو افراد کون ہیں؟''

وہ گمبھیر انداز میں بتانے لگا۔ ''ان دو میں سے ایک شخص کا تعلق آپ کے پیشے سے ہے بیگ صاحب! وہ بھی عدالت میں آپ کی طرح کالا کوٹ پہن کر گھوم رہا ہوتا ہے۔ میں عدیل مگسی کی بات کر رہا ہوں۔ کیا آپ اس نام کے کسی وکیل کو جانتے ہیں؟''

عدیل مگسی کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایک بدنام اور کرپٹ وکیل تھا۔ بھاری رقم

وصول کر کے مخالف پارٹی کی گود میں جا بیٹھنا اُس کا طرۂ امتیاز تھا۔ اُس کی اس ''صلاحیت'' سے تقریباً ہر معقول وکیل واقف تھا۔ میں نے طارق کے سوال کے جواب میں سر کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔

''ہاں، میں عدیل مگسی سے واقف ہوں.......اور اس کے کارناموں سے بھی۔''

وہ سلسلۂ حیرت انگیز معلومات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''چوتھا آدمی بھی آپ کے محکمے ہی سے وابستہ ہے۔ وہ باقاعدہ وکیل تو نہیں تاہم ادھر عدالت ہی میں ہوتا ہے۔ میں جان نہیں سکا کہ وہ وہاں کس حیثیت سے کام کرتا ہے۔ البتہ میں نے یہ معلوم کرلیا ہے کہ آف دی ریکارڈ وہ جعلی دستاویز تیار کرنے کا ماہر ہے۔''

''نام کیا ہے اس کا؟'' میں نے تشویش بھرے انداز میں دریافت کیا۔

''صفدر.......صفدر علی!'' طارق نے بتایا۔ ''نوشاد علی، سلطان احمد، عدیل مگسی اور صفدر علی سے برابر ملتا رہتا ہے۔ اسی لئے میں نے یہ خدشہ ظاہر کیا ہے کہ کہیں وہ جعلی دستاویز تیار کرا کے ہمارے لئے کوئی مشکل نہ کھڑی کر دے۔''

میں صفدر علی اور اس کے کالے کرتوتوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔ میں نے سوچا، یہ اچھا موقع ہے اسے بھی رگڑنے کا۔ اگر نوشاد علی، صفدر علی سے کوئی جعلی دستاویز بنوا کر میرے پاس لاتا تو میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کوئی دلچسپ کھیل، کھیل سکتا تھا۔ ان لمحات میں میرا ذہن بڑی تیز رفتاری سے ایک منصوبے کو ترتیب دینے میں مصروف تھا۔

میں نے باری باری ان ماں بیٹے کی طرف دیکھا، پھر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں ان شیطانوں کا گیم سمجھ گیا ہوں۔ ان جیسے لوگوں سے نمٹنا مجھے آتا ہے۔''

''آپ فی الحال کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟'' طارق نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

میں نے بتایا۔ ''میں نوشاد علی کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ مذکورہ دستاویز مجھ تک پہنچائے، پھر میں کوئی عملی قدم اٹھاؤں گا۔ میں دراصل مخالف پارٹی کو باندھ کر مارنا چاہتا ہوں۔ اور تم نے مجھے جو معلومات فراہم کی ہیں وہ اس مشن کے سلسلے میں بہت مفید ثابت ہوں گی۔''

''اس کا مطلب ہے آپ سر دست کیس کو عدالت میں نہیں لے جا رہے؟''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''میں نے اس گیم کے لئے جو گراؤنڈ تیار کیا ہے اگر نوشاد علی نے مجھے اس گراؤنڈ پر کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا تو مجھے یقین ہے، کیس عدالت میں جائے بغیر ہی ہم اپنا مقصد حال کرلیں گے۔''

نادرہ نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور طارق کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بیٹا! وکیل صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہمیں تو اپنا حق حاصل کرنے سے غرض ہے۔ وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد ملے یا عدالت کا منہ دیکھے بغیر ہی حاصل ہو جائے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

طارق نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

***

نوشاد علی ال محسوس بہ قدیم ریلوے انجن ایک مرتبہ پھر میرے چیمبر میں موجود تھا اور اس بار وہ اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اپنے ساتھ ایک کنٹراسٹ کو بھی لے کر آیا تھا۔ وہ دونوں ''اندھیرا اُجالا'' کی عملی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا، رات اور دن ایک ساتھ میرے چیمبر میں جلوہ افروز ہوں۔

میں نے حسب معمول پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے اپنی میز کے سامنے بچھی آرام دہ کرسیوں کی جانب اشارہ کر دیا۔

ان دونوں نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد نشستیں سنبھالیں اور نوشاد علی اپنا سیاہ دہانہ پھیلاتے ہوئے اپنے ساتھ لائی ہوئی شخصیت کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! یہ میری بہن بہار بیگم ہے۔''

میرے ذہن میں ایک جملے نے بے ساختہ وجود پایا۔ ''لگتی تو بالکل بھی نہیں۔'' مگر میں نے اس جملے کو ذہن سے نکل کر زبان تک نہیں آنے دیا اور زیرلب مسکراتے ہوئے بہار بیگم کی طرف دیکھ کر کہا۔

''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

بہار بیگم نے میری بناوٹی مسکراہٹ کا دل کھول کر جواب دیا۔ وہ بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بھائی صاحب نے آپ کی اتنی تعریف کی ہے کہ آپ سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا۔ اور دیکھ لیں، اس وقت آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔''

اس نے ''دیکھ لیں'' کے الفاظ دعوت دینے والے انداز میں ادا کئے تھے۔ بہار بیگم کی عمر پینتالیس سال کے قریب رہی ہو گی لیکن اس ادھیڑ عمری میں بھی اس کی رعنائی قابلِ دید تھی۔ اس نے خود کو بہت سنبھال سینچ کر رکھا ہوا تھا۔ بالکل محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ چار بچوں کی ماں ہو گی۔ بہار بیگم کی بڑی بیٹی کی عمر میری معلومات کے مطابق اکیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی۔ عام طور پر شوہر کی وفات کے بعد بیوی ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ہے لیکن نجیب اللہ کی موت نے بہار بیگم کی بہار کو خزاں کی نظر سے بچائے رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا

کہ شوہر کی موت اسے خاصی راس آئی ہے۔
میں نے بہار بیگم کی بات کے جواب میں کہا۔ ’’سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔‘‘
’’بیگ صاحب انکساری سے کام لے رہے ہیں۔‘‘ نوشاد علی نے لقمہ دیا۔
وہ ایک مرتبہ پھر فراخ دلی سے مسکرائی اور بولی۔ ’’ہاں، ہاں........ میں سمجھ رہی ہوں۔‘‘
’’بیگ صاحب!‘‘ نوشاد علی بڑی بے تکلفی سے بولا۔ ’’باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ بڑی پیاس لگی ہے۔ کچھ پینے کے لئے تو منگوائیں۔‘‘
بہار بیگم نے نوشاد علی کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ’’بھائی صاحب! اس ’’کچھ‘‘ کی وضاحت بھی کر دیں۔‘‘
میں فوراً اُس کے اشارے کی تہہ میں اتر گیا اور بہار بیگم سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ’’تو آپ کے بھائی صاحب یہ شوق بھی رکھتے ہیں؟‘‘
وہ بدستور شرارتی انداز میں بولی۔ ’’بھائی صاحب نے بڑے نرالے شوق پال رکھے ہیں۔‘‘
’’اس کی مذاق کی عادت ہے بیگ صاحب!‘‘ نوشاد علی جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ’’میرا مطلب تھا حلق خشک ہو رہا ہے۔ کوئی کولڈ ڈرنکس وغیرہ منگوالیں۔‘‘
نوشاد علی نے پچھلی ملاقات میں ایسی بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ لیکن نام نہاد بہن کے سامنے وہ کچھ زیادہ ہی اسمارٹ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کا یہ انداز مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا بلکہ ایک دم زہر لگا۔ تاہم میں نے اپنے محسوسات کو خود تک محدود رکھا اور انٹرکام پر سافٹ ڈرنکس کے لئے آرڈر دے دیا۔ میں اس سے زیادہ اخلاق کا مظاہرہ اور کیا کر سکتا تھا۔
نوشاد علی نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک اسٹامپ پیپر نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ’’بیگ صاحب! آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ میں نے دونوں بھائیوں کے درمیان ہونے والے جس قانونی معاہدے کا ذکر کیا تھا نا، یہ وہی ہے........ فوٹو کاپی کیا، آپ اصل ہی رکھ لیں۔ بہن بہار بیگم نے برسوں سے اسے اپنے پاس محفوظ رکھا ہوا ہے۔‘‘
بہار بیگم نے کہا۔ ’’داشتہ آید بکار........ کے مصداق یہ احتیاط کام آ گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا، کبھی اس کی ایسی سنگین ضرورت بھی پیش آئے گی۔ بہر حال، ایک شے رکھی ہوئی تھی، اب کام آ رہی ہے۔‘‘
میں بہار بیگم اور ’’خزاں بھائی‘‘ سے توجہ ہٹا کر اس قانونی دستاویز کا معائنہ کرنے لگا جو نوشاد علی نے مجھے فراہم کی تھی۔ اس دستاویز کی فراہمی نے ان دونوں کا فراڈ ہونا ثابت کر دیا۔ اس سلسلے میں مجھے جو ایک دو فیصد شک تھا، وہ بھی جاتا رہا۔ یہ وہ دستاویز تو نہیں تھیں جو کبھی

مرحوم نجیب اللہ نے اپنے بھائی حسیب اللہ کا حصہ ہضم کرنے کے لئے کسی جعل ساز سے تیار کروائی ہو گی۔ کیونکہ مذکورہ دستاویز کو تو اصولی طور پر اس مکان کی متعلقہ فائل میں ہونا چاہئے۔ تاہم نوشاد علی کی فراہم کردہ یہ دستاویز تیار کرتے وقت جعل ساز نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اسٹامپ پیپر نسبتاً پرانا استعمال کیا جائے۔ اس اسٹامپ پیپر کی حالت دیکھ کر کہا جا سکتا تھا کہ وہ خاصا پرانا ہے لیکن وہ بہر حال پندرہ سولہ سال پرانا ہرگز ہرگز نہیں تھا۔

میں نے مذکورہ اسٹامپ پیپر سے نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تو وہ دونوں بڑی اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ نوشاد علی نے اضطراری لہجے میں مجھ سے دریافت کیا۔

''بیگ صاحب! آپ کو یقین آ گیا نا، میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی؟''

''یقین تو مجھے آپ کی بات سنتے ہی آ گیا تھا۔'' میں نے اسے خوش فہمی اور غلط فہمی کے درمیان لٹکائے رکھا اور کہا۔ ''یہ تو میں نے نادرہ خاتون کو سبق سکھانے کے لئے منگوایا ہے۔''

اس موقع پر بہار بیگم سلور اسکرین کی سپر ہٹ ملکہ جذبات بن گئی۔ اس نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نادرہ کی دشمن نہیں ہوں۔ آخر کو وہ میری دیورانی ہے لیکن اس ہمدردی اور خیال کے باوجود بھی میں اُسے ایسی حرکت کی اجازت نہیں دے سکتی جیسی اس نے کی ہے۔ میں اس کا برا نہیں چاہتی ہوں۔ اسے نقصان پہنچا کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہو گی۔ سانپ کو مارنے سے بہتر ہوتا ہے اس کا زہر نکال دیا جائے۔ آپ کچھ ایسا بندوبست کر دیں کہ آئندہ کبھی وہ ایسی اوچھی حرکت کی جرأت نہ کر سکے۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوئی پھر براہِ راست میری آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولی۔

''آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا بیگ صاحب؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں نادرہ کا ایسا انتظام کروں گا کہ وہ آئندہ کے لئے آپ کے خلاف سوچنے کا تصور بھی نہیں کرے گی۔''

وہ معنی خیز انداز میں دھیرے دھیرے سر کو اثباتی جنبش دینے لگی۔ پھر خاصے ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ ''میں نہیں جانتی ان لوگوں کے آج کل مالی حالات کیسے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاشی عفریت نے اس کی مت مار دی ہو اور اس نے سوچا ہو اپنے مالی حالات درست کرنے کے لئے یہ مکان والا کارڈ کھیل کر دیکھ لیں۔''

وہ تھوڑے توقف کے بعد رازدارانہ انداز میں بولی۔ ''بیگ صاحب! اگر آپ کو محسوس ہو کہ نادرہ کی حالت پتلی ہے تو میں سامنے آئے بغیر اس کی تھوڑی بہت مدد کرنے کو بھی تیار

ہوں۔ دس بیس ہزار سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اتنی تو میں زکوٰۃ نکال دیتی ہوں۔ وہ چاہے کتنی بھی دشمن بن رہی ہے لیکن میں تو یہ سوچتی ہوں کہ آخر کو وہ نجیب کی بھاوج اور بھتیجا ہیں۔''

میں نے اس کی جذباتی اداکاری کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں اس پہلو کو بھی چیک کرلوں گا۔''

نوشاد علی نے اپنی دنیا دکھاوے کی بہن سے کہا۔ ''بہار بیگم! ایسے زبانی کلامی کام نہیں چلے گا۔ ابھی تم نے بیگ صاحب کی فیس تو ادا کی نہیں اور ان سے بڑے بڑے وعدے لے رہی ہو۔''

''اوہ.......!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنے پیور لیدر ہینڈ بیگ کے ساتھ مصروف ہوگئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ بیگ کو بیگ کی قوت سے فتح کرنے نکلی ہو۔

اسی وقت آفس بوائے ہمارے لئے تین سافٹ ڈرنکس لے کر آ گیا۔ اس نے کولڈ ڈرنکس کو سلیقے سے ہمارے سامنے سجایا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔

بہار بیگم نے اپنے پرس میں سے چیک بک برآمد کی اور مجھ سے پوچھا۔ ''چیک چلے گا؟''

میں نے فی البدیہہ کہا۔ ''اگر بلینک ہو تو ضرور چلے گا۔''

''اب ایسی بھی نہیں ہو رہی۔'' اس نے گھور کر مگر بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم ویری سوری، میں چیکس وصول نہیں کرتا۔ اپنی فیس کیش کی صورت میں لیتا ہوں یا پھر پے آرڈر بھی قابل قبول ہوتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں، میں آپ کو کیش دے دیتی ہوں۔'' وہ جلدی سے چیک بک کو پرس میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو ہمارے چیک پر بھروسہ نہیں لیکن ہمیں آپ کی صلاحیت پر پورا اعتماد ہے۔''

''بات بے اعتمادی کی نہیں میڈم!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس میں نے اپنا ایک اصول بنا رکھا ہے۔''

''بہت اچھی بات ہے۔ انسان کو اصول پسند اور اصول پرست ہونا چاہئے۔'' بہار بیگم نے سرسری انداز میں کہا پھر میری فیس کی رقم کرارے نوٹوں کی صورت میں میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''گن لیجئے گا بیگ صاحب! انسان سے بھول چوک ہو جاتی ہے۔''

شاید وہ میرے پاس آنے سے پہلے بینک سے ہو کر آئی تھی۔ اس کے پرس میں سب سے بڑے والے نوٹوں کی پوری گڈی موجود تھی جس میں سے رقم گن کر اس نے میرے

حوالے کی تھی اور باقی گڈی کو واپس پرس میں رکھ لیا تھا۔ ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی کہ وہ دولت کی نمائش سے مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اس کی خواہش کی خاطر، چاہے دکھانے کے لئے سہی، میں مرعوب ہو گیا اور حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میڈم! آپ اتنی تگڑی رقم پرس میں لئے گھوم رہی ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے آپ کا بینک بیلنس خاصا صحت مند ہو گا۔''

وہ ایک ادا سے گردن اکڑاتے ہوئے نخوت سے بولی۔ ''آپ کی دعا سے اللہ کا بڑا فضل ہے۔''

میں نے اپنی فیس کی رقم گن کر تسلی کی پھر اس سلسلے میں بہار بیگم کو ایک رسید بنا کر دے دی۔ اس رسید سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ میں نے اس سے وہ رقم کس مد میں وصول کی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے محض اسے خوش فہمی میں مبتلا کرنے کے لئے فیس کی وصولی کا ناٹک رچایا تھا۔ اس وقت تک میرا ذہن وہ منصوبہ فائنل کر چکا تھا جس پر عمل کرتے ہوئے مجھے ان مکار اور دغاباز لوگوں سے نمٹنا تھا۔ یہ سچ ہے کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے رام نہیں ہوتے لیکن میں خود کو اندھیرے میں رکھ کر ان پر لاتیں چلانا چاہتا تھا۔ یہ اس کیس کی مجبوری تھی۔ اگر میں عدالت کے ذریعے نادرہ خاتون کو انصاف دلانے کی کوشش کرتا تو یہ بڑا پیچیدہ اور مشکل کام تھا۔ نادرہ کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ عدالت کی چوکھٹ سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے اسے اتنی مدت لگ جاتی کہ وہ مایوس ہو کر ہمت ہار بیٹھتی۔ اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اچھی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ نادرہ خاتون اور اس کے بیٹے کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی تھی اور زیادتی کرنے والے نجیب اللہ اور بہار بیگم ہی تھے۔ بہار بیگم اور اس کے ناقابل یقین بھائی صاحب نے عیاری اور مکاری کے ایسے جال پھیلا رکھے تھے کہ وہ ایک سنگین سزا کے مستوجب ٹھہرتے تھے۔ میں نے انہیں سزا دینے کے لئے ایک انوکھا منصوبہ ترتیب دے دیا تھا اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مجھے کسی عدالت میں آمد و شد کی ضرورت نہیں تھی۔ دھوکے باز کو خوب صورت دھوکے ہی سے مارنا چاہئے۔ محاوراتی زبان میں ایسے ہی مواقع کے لئے کہا جاتا ہے .... سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

مجھے صرف لاٹھی کو حرکت میں لانا تھا۔

وہ دونوں میرے چیمبر سے رخصت ہونے لگے تو بہار بیگم نے اچانک مجھ سے پوچھ لیا۔

''بیگ صاحب! کیا آپ کی شادی ہو گئی ہے؟'' یہ ایک غیر متوقع سوال تھا۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ابھی تک اس نعمت سے محروم ہوں۔''

''کیا زندگی بھر محروم رہنے کا ارادہ کر رکھا ہے.......؟'' اُس کے لہجے کی معنی خیزی بڑی خطرناک تھی۔

میں نے کہا۔''ایسی تو کوئی بات نہیں۔ یہ تو کفرانِ نعمت ہوگا۔''

''اس کا مطلب ہے آپ کفرانِ نعمت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔''

اُس کے پراسرار سوالات مجھے اُلجھانے لگے۔ آج تک کسی مؤکل نے مجھ سے اس قسم کی گفتگو نہیں کی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ نارمل رویہ رکھتے ہوئے سادگی سے کہا۔''جی ہاں، ایسی ہی بات ہے۔''

وہ باقاعدہ رشتے کرانے والی خالہ کا کردار ادا کرتے ہوئے بولی۔''کیا کہیں اس سلسلے میں کوئی بات چیت چل رہی ہے؟''

''ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

اس نے ذومعنی لہجے میں استفسار کیا۔''اگر آپ سنجیدہ ہیں تو میں کوشش کرتی ہوں۔''

بہار بیگم کے اس سوالیہ جملے کے دو معنی نکلتے تھے۔ ایک تو یہ کہ اگر میں شادی میں دلچسپی رکھتا ہوں تو وہ میرے لئے لڑکی دیکھنے کی کوشش کرے گی۔ دوسرے اس سلسلے میں وہ خود بھی کوشش کر سکتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کے شوہر نجیب اللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اگرچہ چار بچوں کی ماں تھی لیکن دیکھنے میں بالکل جوان اور دلکش نظر آتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی پینتالیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ لیکن بڑھتی ہوئی عمر نے اس کے سراپا اور بدن کی شادابی کو میلی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان عورتوں میں شمار کی جا سکتی تھی جو سدا بہار جوانی کی مالک ہوتی ہیں۔ ایک لحاظ سے وہ اسم بامسمٰی ثابت ہوئی تھی۔ ان زمینی حقائق کی روشنی میں اگر اس کی بات کا آخر الذکر مطلب بھی برآمد کیا جاتا تو وہ حق بجانب دکھائی دیتی تھی۔ مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

میرا ارادہ نہیں تھا اور میں یہ بات دوٹوک انداز میں کہہ کر بحث کے کسی بڑے در کو وا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے مصلحت آمیز انداز میں کہا۔''میں سوچ کر آپ کو بتاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے.......'' وہ بڑے دل موہ لینے والے اسٹائل میں مسکرائی اور کہا۔''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی بیگ صاحب! کہ سوچنے میں زیادہ وقت صرف نہ کیجئے گا۔''

''میں آپ کے اس زریں مشورے کو ذہن میں رکھوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ دونوں الوداعی سلام کر کے میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد

میں کافی دیر تک بہار بیگم کے بارے میں سوچتا رہا۔ میں نے اتنی کھلی ڈلی عورت اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ اس کی ہر بات ذہن میں سنسنی کو بیدار کرنے والی تھی۔ اپنی مخصوص سوچ کے مطابق ہر انسان اپنی مرضی کا مطلب اخذ کر سکتا تھا۔ اس نوعیت کی گفتگو کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس کے لئے بڑی احتیاط اور کمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ احتیاط اور بے احتیاطی اگر ایک کمال کے ساتھ ملا کر استعمال کی جائیں تو بڑی معنی خیز اور سنسنی آمیز گفتگو کی جا سکتی ہے۔

آئندہ روز، طارق اکیلا ہی مجھ سے ملنے آیا اور تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں استفسار کرنے لگا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ تسلی رکھے اور اطمینان سے بیٹھ جائے۔ میں نے بساط کو اپنے سامنے بچھا لیا ہے اور اس بساط پر اپنی مرضی اور پوزیشن کے مہرے بھی سجا لئے ہیں۔ چال چلنے میں ابھی کچھ ہی دیر باقی ہے۔ انشاء اللہ، بہت جلد میں اسے ایک بڑی خوشخبری سناؤں گا۔

اس نے پوچھا۔ ''مجھے آپ کی صلاحیتوں پر پورا اعتماد ہے بیگ صاحب! یہ بتائیں، اس دوران مجھے کیا کرنا ہوگا؟........ ہاتھ پر ہاتھ رکھے میں خالی تو نہیں بیٹھ سکتا نا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو طارق!'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''جن لوگوں کو کام کرنے کی عادت ہو جاتی ہے وہ فارغ نہیں بیٹھ سکتے۔ تمہارا بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔'' میں لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''پچھلے ایک ماہ میں تم نے خاصی دوڑ دھوپ کی ہے۔ یہ تمہاری محنت اور کوشش کا نتیجہ ہی ہے کہ میں تمہارے دشمنوں سے نمٹنے کے لئے ایک کامیاب لائحہ عمل ترتیب دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اب تمہیں چند روز تک آرام کرنا ہوگا۔ اپنے فیکٹری والے فرائض پر توجہ مرکوز رکھو، بہار بیگم اینڈ کمپنی کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ ان لوگوں کو میں بڑی چابک دستی سے ہینڈل کر لوں گا۔ بہت جلد وہ میری چال میں آ جائیں گے۔ جیسے ہی مجھے تمہاری اور نادرہ کی ضرورت محسوس ہوئی، میں تمہیں کال کر کے اس بارے میں بتا دوں گا۔''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے بیگ صاحب! میں آپ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے اسے یقین کی دولت سے بھر کر اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔

***

میں نے بہار بیگم اور اس کے نکٹیو نام نہاد بھائی صاحب نوشاد علی کو شکار کرنے کے لئے جو

حکمتِ عملی ترتیب دی تھی اس میں سرفراز شاہ کو ایک اہم کردار ادا کرنا تھا۔ سرفراز شاہ ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس کا تعلق اسی تھانے سے تھا جس کی حدود میں بہار بیگم اور نوشاد علی کی رہائش تھی۔ میں سرفراز کو ایک طویل عرصے سے جانتا تھا اور ہمارے درمیان بڑے خوش گوار تعلقات تھے۔ دوسروں کے ساتھ وہ جو بھی کرتا ہو لیکن آج تک میرے ساتھ وہ بڑا صاف رہا تھا۔ مجھے اُمید تھی وہ میرے لکھے ہوئے اسکرپٹ پر کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اس قسم کا کردار اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ سرفراز بنیادی طور پر ایک پیدا گیر پولیس والا تھا اور مذکورہ کردار اس کے مزاج سے لگا کھاتا تھا۔

اس دوران میں نے پراپرٹی ایجنٹ سلطان احمد، صفدر علی پر بھی خاصا کام کر لیا تھا اور طارق کی فراہم کردہ معلومات کو صد فیصد درست پایا تھا۔ عدیل مگسی کو میں پہلے ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ جب میں نے اپنے خفیہ ذرائع سے صفدر علی کی ٹوہ لگائی تو یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ پچھلے دنوں نوشاد، عدیل مگسی کی معیت میں کسی خاص کام کی غرض سے اس سے ملنے آیا تھا پھر وہ خاص کام بھی میری عقابی تحقیقاتی نگاہ سے اوجھل نہ رہ سکا۔ میں یہ معلوم کرنے میں کامیاب رہا کہ نوشاد علی نے مجھے وہ دستاویز فراہم کی تھی وہ حال ہی میں صفدر علی نے تیار کی تھی۔

کوئی بھی عملی قدم اٹھانے کے لئے میدان تیار ہو چکا تھا۔ میں نے تنقیدی نظر سے ایک مرتبہ پھر اپنے تصور میں بچھی بساط کا جائزہ لیا اور سب انسپکٹر سرفراز سے رابطے کے لئے اس کا فون نمبر ڈائل کرنے لگا۔ یہ اس پلاننگ کا سب سے اہم موڑ تھا۔

تیسری گھنٹی پر دوسری طرف سے ریسیور اُٹھا لیا گیا۔ پھر سرفراز شاہ کی شناسا آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

''ہیلو........شاہ جی! کیا حال چال ہے؟''

''اوہ، بیگ صاحب!' وہ میری آواز پہچانتے ہی بے تکلفی سے بولا۔ ''چال تو ٹھیک ہی ہے لیکن حال کچھ زیادہ اچھا نہیں۔''

''کیا اس شہر کے تمام مجرم ہڑتال پر چلے گئے ہیں؟'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''جو آپ کا حال متاثر ہو رہا ہے؟''

''نہیں، ایسی بات تو نہیں۔'' وہ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''آپ سے دوستی ہے اس لئے کچھ چھپاتا نہیں ہوں حالانکہ کسی کو یقین نہیں آتا کہ ایک وکیل اور پولیس والے کے بیچ ایسی گہری دوستی بھی ہو سکتی ہے۔''

''یہ اچھا ہی ہے کہ کسی کو یقین نہ آئے۔'' میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔''اس طرح ہماری دوستی بدخواہوں کی نظر سے بچی رہے گی۔'' میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''آپ اپنے حال کے بارے میں کچھ بتانے والے تھے؟''

''اوہ، ہاں......'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔''میں جال تو ہر وقت ڈالے رکھتا ہوں لیکن آج کل جال میں کچرا اور چھوٹی مچھلیاں ہی لگ رہی ہیں......کسی صحت مند مچھلی کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔''

''سمجھ لیں، آپ کا انتظار ختم ہو گیا۔'' میں نے خوشخبری سنانے والے انداز میں کہا۔ ''ایک چھوڑ، چار چار مچھلیاں آپ کی کارروائی کے لئے تیار ہیں۔خوب ہٹی کٹی اور پلی پلائی۔''

''ہوں......!'' اُس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آواز اُبھری۔''تو آپ مجھے کوئی ٹپ دے رہے ہیں۔''

''ارے یار! آپ ایسے چھوٹے الفاظ تو استعمال نہ کریں شاہ جی!'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔''ٹپ تو ویٹر وغیرہ کو دی جاتی ہے۔آپ تو ہمارے دوست ہیں۔میں آپ کو پیدا کی راہ دکھا رہا ہوں۔مشکل وقت میں ایک دوست دوسرے دوست کے کام نہ آئے تو ایسی دوستی کا کیا فائدہ؟''

''جی ارشاد بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔''میں پوری توجہ سے آپ کی بات سن رہا ہوں۔بتائیں، آپ میرے فائدے کی کون سی راہ سجھا رہے ہیں؟''

آئندہ چند منٹ میں، میں نے سب انسپکٹر سرفراز شاہ کو پراپرٹی ایجنٹ سلطان احمد، اس کی پارٹنر سیکرٹری نازیہ، عدیل مگسی، صفدر علی، نوشاد علی وغیرہ کے بارے میں تفصیلاً بتا دیا۔ان کے فراڈ گیم کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے سرفراز شاہ کو یہ بھی باور کرایا کہ کس طرح نوشاد علی نے بہار بیگم کے ساتھ مل کر نادرہ خاتون اور طارق کے ساتھ ناانصافی کا سلوک کیا ہے۔میں نے اسے نوشاد علی، بہار بیگم، نادرہ خاتون کی ہسٹری سے بھی آگاہ کر دیا۔اس نے بڑے صبر و سکون سے میری بات سنی اور آخر میں کہا۔

''بیگ صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں......یہ چاروں خاصی صحت مند مچھلیاں ہیں۔ایک دوسرے سے مربوط رہ کر یہ فراڈ گیم کو بڑی مہارت سے کھیل رہے ہیں۔ان پر ہاتھ ڈال کر میں اچھی خاصی پیدا کر سکتا ہوں۔لیکن......ایک مسئلہ ہے۔''

''کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔''یہ چاروں باہمی اتفاق سے اپنا کھیل، کھیل رہے ہیں لہٰذا ان کی زنجیر کو توڑنے

کے لئے کسی وزنی ہتھوڑے کی ضرورت ہوگی۔ایک بھرپور ضرب میں خود لگا لوں گا.......آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔''آپ کو کوئی ایسا پکا ثبوت چاہئے جس کی بنا پر آپ اپنے کھیل کا آغاز کر سکیں۔''

''جی ہاں.......آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

''ثبوت آپ کو میں فراہم کر دوں گا.......ایک دم ٹھوس!'' میں نے کہا۔''سمجھ لیں کہ وہ چاروں گھی سے بھرے ہوئے آڑھے ٹیڑھے برتن ہیں لیکن میں اپنی انگلی کو ٹیڑھا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ ٹھوس ثبوت مہیا کریں۔اُنگلی میں ٹیڑھی کر لوں گا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔''جتنا بھی گھی برآمد ہوگا، ففٹی ففٹی کر لیں گے۔''

''میں اس قسم کی چکنائی سے پرہیز کرتا ہوں۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں، سارا گھی میں رکھ لوں گا۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔''مجھے روغن کا کوئی پرہیز نہیں۔''

''اب ایسی بھی نہیں ہو رہی شاہ صاحب!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔''میں نے اس کیس میں آپ کی خدمات ایک خاص مقصد کے تحت حاصل کی ہیں۔''

''تو بتائیں بیگ صاحب! آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میں نادرہ خاتون اور طارق کا بھلا چاہتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوکے.......ڈن!'' وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔''میں ان چار بھینسوں میں سے جتنا دودھ نکالوں گا، اس کا نصف آپ کی پارٹی کو مل جائے گا۔''

اس کے بعد میں نے سرفراز شاہ کو بتا دیا کہ وہ کس طرح آگے بڑھے گا۔اسے سب سے پہلے جعلی دستاویزات تیار کرنے والے صفدر علی پر ہاتھ ڈالنا تھا۔ثبوت میں اسے مہیا کر دیتا۔وہ دستاویز جو نوشاد علی نے عدیل مگسی کے توسط سے صفدر سے تیار کروائی تھی۔جب صفدر پولیس کے شکنجے میں آ جاتا تو نوشاد علی اور عدیل مگسی کو گھیرنا آسان ہو جاتا اور پھر سلطان احمد اور اس کی سیکرٹری نازیہ بھی بچ نہ پاتے۔میری ہدایات سننے کے بعد سرفراز شاہ نے کہا۔

''بیگ صاحب! آپ اپنے ہم پیشہ عدیل مگسی کو اس گیم سے نکال دیں۔اس کی موجودگی میں کسی بھی وقت کوئی پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔میں یہ ساری کارروائی اپنے بل بوتے پر کروں گا۔اس کی خبر اوپر نہیں ہوگی۔اور مجھے اُمید ہے میں صفدر علی، نوشاد علی اور سلطان

اینڈ کمپنی کو با آسانی ڈیل کرلوں گا۔ اگر عدیل مگسی بھی اس فہرست میں شامل رہا تو معاملہ بگڑ سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے.......آپ جیسے مناسب سمجھو۔ مجھے تو نتائج چاہئیں۔''

''میں آپ کو ایک سو ایک فیصد نتائج دوں گا۔'' وہ پورے یقین سے بولا۔

اس کے بعد میں نے سرفراز شاہ کو اس کھیل کے دیگر راؤنڈز سے بھی آگاہ کر دیا جو اس سے پہلے مجھے کھیلنا تھے۔ ان راؤنڈز میں میری نوشاد علی اور اس کی نام نہاد بہن بہار بیگم سے ملاقات شامل تھی۔ علاوہ ازیں ایک ملاقات مجھے نادرہ بیگم اور اس کے بیٹے طارق سے بھی کرنا تھی۔ میں نے شاہ جی کو ان ملاقاتوں کے اہم نکات سے بھی روشناس کرا دیا۔ پوری کہانی سننے کے بعد وہ حیرت آمیز لہجے میں بولا۔

''بیگ صاحب! آپ نے کبھی ملکی سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں نہیں سوچا؟''

''شاہ جی! ملکی سیاست کا اس کیس سے کیا تعلق؟''

وہ بولا۔ ''یہ بات میں آپ کی منصوبہ بندی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہوں۔ آپ نے ان مجرموں کو گھیرنے اور پیٹنے کے لئے جو پلاننگ کی ہے وہ سیاست بازی کا عمدہ نمونہ ہے۔''

میں نے گول مول جواب دیا۔ ''ہاں شاہ جی!.......کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔''

اس کے بعد ہمارے درمیان الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا پھر اسے ٹھوس دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کا وعدہ کر کے میں نے ٹیلی فونک سلسلہ موقوف کر دیا۔

ہمارے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ پہلے میں اپنے حصے کا کام نمٹاؤں گا، اس کے بعد سرفراز شاہ حرکت میں آئے گا۔ کیونکہ اس کے ایکشن میں آ جانے کے بعد میں اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

دو روز بعد میں نے فون کر کے نوشاد علی اور بہار بیگم کو اپنے دفتر میں بلا لیا۔ جب وہ میرے سامنے آ کر بیٹھ گئے تو میں نے انہیں بتایا کہ میں نادرہ بیگم سے خاصی تفصیلی بات کر چکا ہوں اور نتائج حوصلہ افزاء برآمد ہوئے ہیں۔

بہار بیگم نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''اس نے کہا کیا ہے؟''

''کہنا کیا تھا؟'' میں نے اپنے لہجے میں ناگواری کا تاثر شامل کرتے ہوئے کہا۔ ''آپکا اندازہ بالکل درست تھا وہ ایک لالچی اور فتنہ پرور عورت ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ اس کے شوہر حسیب احمد اور اس کے بڑے بھائی نجیب احمد کے درمیان باقاعدہ ایک قانونی معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے حسیب احمد اپنا حصہ لے کر آبائی گھر کے حق سے دستبردار ہو گیا تھا، تو

نادرہ کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ میں نے فوراً وہ دستاویز نکال کر اس کے سامنے رکھ دی جو پچھلے دنوں آپ لوگ میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔ وہ اسٹامپ پیپر دیکھ کر تو گویا اس پر بجلی سی گر گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں مایوسی اور پریشانی کے سائے لہراتے ہوئے دیکھے۔ سچ پوچھیں تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ساری اُمیدوں پر گویا دیکھتے ہی دیکھتے پانی پھر گیا ہو۔ اس حالت میں دیکھ کر مجھے اس پر ترس بھی آیا اور میں نے صاف الفاظ میں اس سے کہہ دیا۔

''دیکھو نادرہ بیگم! اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دو کہ اس جائیداد میں سے تمہیں ایک پیسہ بھی ملے گا۔ تمہارا شوہر اپنے بھائی کے حق میں آبائی گھر سے دستبردار ہو گیا تھا لہٰذا مرحوم نجیب اللہ اس دستاویزی ثبوت کی روشنی میں بلاشرکت غیرے اس کا مالک بن گیا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد آپ...... یعنی بہار بیگم اس مکان کی مالک ہو گئیں اور اب اگر آپ نے وہ مکان فروخت کر دیا ہے تو اسے یعنی نادرہ کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔''

میری وضاحت سننے کے بعد اس کا منہ لٹک گیا اور بڑے خوشامدانہ انداز میں مجھے اپنی مفلسی اور تنگ دستی کے قصے سنانے لگی۔ اس وقت اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بھی نکل رہے تھے۔ میں نے اس کی افسوس ناک حالت کے پیشِ نظر کہہ دیا۔

''میں تمہارے حالات کو سمجھ رہا ہوں اور میں کوشش کروں گا کہ بہار بیگم سے کہہ کر تمہارے لئے کوئی مالی مدد کا بندوبست کر دوں۔'' پھر میں نے براہِ راست بہار بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے گزشتہ ملاقات میں مجھ سے کہا تھا کہ آپ کی نادرہ بیگم سے کوئی دشمنی نہیں، اسے نقصان پہنچا کر آپ کو کوئی خوشی نہیں ہو گی بلکہ ان خراب حالات میں آپ اس کی مالی مدد بھی کرنے کو تیار ہیں۔ لہٰذا میں نے نادرہ بیگم کو یقین دلایا ہے کہ میں اسے آپ سے پچیس ہزار تک دلوا دوں گا۔''

''میں نے دس بیس ہزار تک کی بات کی تھی بیگ صاحب!'' بہار بیگم نے یاددہانی کے انداز میں کہا۔ ''اور ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ آپ کوئی ایسا زبردست بندوبست کریں گے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے بلکہ سانپ کو مارنے کی بجائے اس کا زہر نکال لینا چاہئے۔''

''مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے یہی الفاظ استعمال کئے تھے کہ...... سانپ کو مارنے سے بہتر ہوتا ہے اس کا زہر نکال دیا جائے۔ آپ کچھ ایسا بندوبست کر دیں کہ آئندہ کبھی وہ ایسی اوچھی حرکت کی جرأت نہ کر سکے۔'' میں لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق بڑا پکا بندوبست کیا ہے۔ یہ دیکھیں!''
اتنا کہہ کر میں نے ایک فائل میں سے ایک ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپر نکال کر ان دونوں نام نہاد بہن بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ یہ اسٹامپ پیپر میں نے ان چکر بازوں کو چکمہ دینے کے لئے تیار کیا تھا تاکہ وہ ایک تو مجھ پر بھروسہ رکھیں کہ میں ان کے مقاصد کے لئے کام کر رہا ہوں، دوسرے وہ نادرہ خاتون کی طرف سے مطمئن ہو جائیں۔ وہ اسٹامپ پیپر درحقیقت نادرہ خاتون کی طرف سے ایک اقرار نامہ تھا جس کی رو سے وہ بہار بیگم کو حاصل کسی بھی مال و جائیداد میں کسی بھی قسم کی حصہ دار نہیں تھی اور نہ ہی کسی حوالے سے وہ بہار بیگم پر کسی نوعیت کی مقدمے بازی کا حق رکھتی تھی۔ یہ تحریر چونکہ سراسر بہار بیگم کے حق میں جاتی تھی لہٰذا خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ خوش تو نوشاد علی بھی تھا لیکن اس کی خوشی کے اظہار کے لئے ''پھوٹنے'' کا لفظ استعمال کرنا مناسب نہیں تھا...... یوں کہا جا سکتا تھا کہ خوشی اس کی باچھوں سے ٹوٹ رہی تھی۔

میں نے باری باری ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اس دستاویز پر صرف نادرہ خاتون کے دستخط ہونا باقی ہیں اور وہ دستخط میں آپ کی موجودگی میں کراؤں گا۔ جب آپ اپنے ہاتھوں سے اسے پچیس ہزار روپے ادا کر دیں گی۔ آپ جب کہیں، میں نادرہ خاتون کو بلا لیتا ہوں۔''

نوشاد علی نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کل ہی اسے بلا لیں۔ یہ معاملہ جتنی جلدی نمٹ جائے اتنا ہی اچھا ہے۔'' پھر اس نے تصدیق کی خاطر اپنی ''بہن'' کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے بہار بیگم؟''

''میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتی ہوں نوشاد بھائی!'' بہار بیگم نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں کل رقم لے کر آ جاتی ہوں، آپ اسے بلا لیں۔ اچھا ہے آپ کی موجودگی میں یہ ٹنٹا بھی نکل ہی جائے۔''

''لیکن......'' نوشاد علی نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''کل تو اتوار ہے......کیا چھٹی کے دن آپ کا دفتر کھلا ہوگا؟''

''میں عموماً چھٹی کے روز دفتر بند ہی رکھتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن اگر اس قسم کا کوئی پرائیویٹ کیس نمٹانا پڑ جائے تو سنڈے کو بھی دفتر کھولا جا سکتا ہے۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر کل صبح دس بجے آ جائیں۔ میں نادرہ خاتون کو بلا لیتا ہوں۔''

وہ دونوں مطمئن ہو کر میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔

اگلے روز دونوں پارٹیاں میرے پاس حاضر تھیں۔ میں نے اس سلسلے میں نادرہ خاتون اور طارق کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ انہیں کس نوعیت کے کردار ادا کرنا ہیں۔ وہ چونکہ مجھ پر پورا اعتماد کرتے تھے لہٰذا میرے اشاروں پر عمل کرنے کے لئے بھی تیار تھے۔ میں نے انہیں کہہ رکھا تھا کہ وہ یہاں سے نمٹنے کے بعد خاموشی سے اپنے گھر چلے جائیں۔ کوئی ضروری بات کرنا ہوگی تو میں انہیں فون کرلوں گا۔

قصہ مختصر، میں نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے وہ ڈیل کروا دی۔ دونوں پارٹیوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئیں۔

اُس زمانے میں پچیس ہزار کوئی ایسی معمولی رقم نہیں تھی کہ اسے ''بھاگتے چور کی لنگوٹی'' سے تشبیہہ دی جاتی۔ میں مانتا ہوں کہ یہ رقم ان کے حق سے خاصی کم تھی لیکن ''حق کی وصولی'' کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا تھا۔ ابھی شاہ جی کی کارروائی باقی تھی۔

میں نے دوپہر کے بعد سرفراز شاہ کو فون کیا اور پوچھا۔ ''شاہ جی! تیاری ہوگئی؟''

''تیاری مکمل ہے بیگ صاحب!'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''بس آپ کے اشارے کا منتظر ہوں۔ کہیں، آپ نے اپنا کام کرلیا؟''

''میں نمٹ چکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اب کسی بھی وقت اپنی کارروائی کر سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ کام ہو جانے کے بعد وہ دستاویز مجھ تک پہنچ جانی چاہئے۔ بہار بیگم اور اس کا ''بھائی'' کسی بھی وقت وہ دستاویز مجھ سے مانگ سکتے ہیں۔ شکر ہے وہ ابھی تک بھولے ہوئے ہیں۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں بیگ صاحب!'' سرفراز شاہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس سے ملتی جلتی دو تین اور دستاویزات ایک اور جعل ساز سے تیار کروالی ہیں۔ نوشاد علی والی دستاویز صفدر علی پر اثر ڈالنے کے لئے ہوگی۔ باقی کام خود بہ خود ہوتا چلا جائے گا۔ میرے لئے بس اتنا ہی کافی ہوگا کہ سلطان احمد یا نوشاد علی، صفدر سے اس نوعیت کے جعلی ڈاکومنٹس تیار کرواتے رہتے ہیں۔ باقی کے معاملات مجھے ڈیل کرنا آتے ہیں۔ میں آج کارروائی کے لئے نکل رہا ہوں۔ انشاءاللہ کل صبح آپ کو کوئی خوش خبری سناؤں گا اور نوشاد علی والی دستاویز بھی واپس کر دوں گا۔''

میں نے مطمئن ہونے کے بعد فون بند کر دیا۔

***

آئندہ روز علی الصباح سرفراز کا فون آ گیا۔ اس نے مسرت بھرے لہجے میں بتایا۔ ''بیگ

صاحب! کام ہو گیا۔ چور کی چونکہ کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہوتی اس لئے اسے ہلانا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ میں نے یہ معاملہ رفع دفع کرنے کے لئے ان سے مجموعی طور پر پچاس ہزار روپے ''وصول'' کر لئے ہیں اور اس وصولی کی کوئی رسید بھی نہیں دی۔''

''کمال ہے۔'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں تو توقع کر رہا تھا، آپ اس کام کو نمٹانے کے لئے دو تین دن تو لیں گے۔ لیکن آپ نے مجھے حیران کر دیا ہے۔''

''بس جناب! اپنے اپنے اسٹائل کی بات ہے۔'' وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''جو کام اوپر والوں کی لاعلمی میں کیا جائے اسے یونہی جھٹ پٹ نمٹانا پڑتا ہے۔ جب انہیں یہ محسوس ہو گیا کہ مقدمے بازی میں ان کا زیادہ خرچہ آئے گا اور ان کا وقت بھی ''ضائع'' ہو گا تو وہ پچاس ہزار پر راضی ہو گئے۔ ساتھ ہی میں نے انہیں یہ اجازت بھی دے دی کہ وہ میرا مہینہ باندھ دیں تو خاموشی سے اس کام کو جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس پیش کش میں انہیں زیادہ کشش نظر آئی اور وہ فوراً میری بات ماننے کے لئے تیار ہو گئے۔''

''یہ تو بڑی غلط بات ہے شاہ جی!'' میں نے شاکی لہجے میں کہا۔ ''گویا اب آپ اپنی سرپرستی میں یہ غیر قانونی کام کروائیں گے؟''

''بیگ صاحب! میرا خیال ہے آپ آم کھائیں۔ پیڑوں کا شمار میرے لئے چھوڑ دیں۔ قانونی اور غیر قانونی کاموں کی مجھے بڑی گہری پہچان ہے۔ آپ نے میرے ذمے جو کام لگایا تھا وہ ہو گیا۔ ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد میں وہ دستاویز اور ففٹی پرسینٹ انکم یعنی مبلغ پچیس ہزار روپے آپ تک پہنچا دوں گا۔ بہرحال.......'' اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور بولا۔

''ایسی صحت مند مچھلیاں اگر کہیں اور تیرتی ہوئی نظر آ جائیں تو مجھے بس ایک فون کر دیجئے گا۔ میں فوراً جال پھینک دوں گا۔''

میں نے دوستانہ بے تکلفی کا سہارا لے کر اسے اچھی خاصی کھری کھری سنا ڈالیں پھر فون بند کر کے سرفراز شاہ کے بارے میں سوچنے لگا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا کے مختلف محکموں کو سدھارنے کے لئے جتنے بھی فارمولے موجود ہیں انہیں ایک ساتھ بھی شاہ جی کے محکمے پر آزمایا جائے تو بھی بڑے مایوس کن نتائج برآمد ہوں گے۔

بہرحال، حسب وعدہ وہ ایک گھنٹے سے بھی پہلے مذکورہ دستاویز اور مبلغ پچیس ہزار روپے مجھ تک پہنچا کر واپس چلا گیا۔ اسی روز شام کو میں نے نادرہ خاتون اور طارق کو اپنے دفتر بلایا اور وہ رقم ان کے حوالے کر دی۔ علاوہ ازیں میں نے وہ پیسے بھی اس رقم میں شامل کر دیئے

تھے جو بطور فیس میں نے بہار بیگم سے وصول کئے تھے۔اس کے ساتھ ہی میں نے ان سے کہا۔
''آپ نے مجھے اپنا وکیل مقرر کیا تھا اور مجھ سے جو کچھ ہو سکا، میں نے وہ آپ لوگوں کے لئے کر دیا۔اس سے زیادہ ممکن نہیں۔آپ اسی کو غنیمت جانیں اور اللہ کا شکر ادا کریں۔''
نادرہ خاتون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''رب کا شکر تو میں ہر وقت ادا کرتی رہتی ہوں۔اس معاملے میں، میں آپ کی بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ یہ سب آپ کی غیر معمولی کوششوں سے ممکن ہو سکا ہے۔میں اپنے کیس کی صورت کو اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔واقعی اگر ہم عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے تو کامیابی کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔زیادہ سے زیادہ ہم نوشاد علی کو فراڈ ثابت کر دیتے لیکن........'' وہ خاموش ہو گئی۔
''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔'' میں نے اس کے ادھورے جملے کو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق مکمل کرتے ہوئے کہا۔''زمین و جائیداد کے مقدمات میں جتنی بھی دیر لگ جائے، کم ہے۔پھر اس حوالے سے آپ کا کیس بھی کوئی خاصا جاندار نہیں ہے۔آپ جس جائیداد میں سے حصہ لینے کی خواہش مند ہیں، وہ دو تین پارٹیوں کے ہاتھوں سے نکل کر کافی آگے بڑھ چکا ہے۔''
طارق نے کہا۔''بیگ صاحب! آپ نے تائی بہار بیگم سے ہمیں جو رقم دلائی، چاہے کسی بھی بنیاد پر وہ تو سمجھ میں آ رہی ہے لیکن ابھی جو آپ نے پینتیس چھتیس ہزار ہمیں دیئے ہیں اس کا سورس کیا ہے؟ میں باوجود کوشش کے بھی سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ یہ کس مد میں ہیں؟........ کیا یہ آپ نے اپنی طرف سے دیئے ہیں؟''
''نہیں........'' میں نے پوری قطعیت سے نفی میں گردن ہلائی۔''اس رقم کی ایک ایک پائی پر آپ کا حق ہے اور میں نے یہ ان لوگوں سے وصول کی ہے جو آپ کا حق کھائے بیٹھے ہیں۔کیسے وصول کی ہے، آپ لوگ اس چکر میں نہ پڑیں۔'' پھر میں نے سرفراز شاہ کے الفاظ دوہرا دیئے۔''آپ لوگ اپنے ذاتی باغ کے آم کھائیں۔یہ مت دیکھیں کہ آم کون سے پیڑ کے ہیں........اور کس پیڑ پر کتنے آم لگے ہوئے ہیں........کچھ نا معلوم بھی تو رہنا چاہئے۔''
وہ میرا بے حد شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔
تھوڑی دیر کے بعد بہار بیگم کا فون آ گیا۔''بیگ صاحب! ہم نے آپ کو ایک اسٹامپ پیپر دیا تھا جس پر میرے شوہر اور دیور کے مابین ہونے والے معاہدے کی تحریر تھی۔''
اس کے لہجے میں شامل پریشانی مجھ سے چھپی نہیں رہی تھی۔تاہم میں نے اس حوالے سے بہار بیگم سے کوئی استفسار نہیں کیا اور جواب دیا۔''جی ہاں........وہ میرے پاس محفوظ رکھا ہے۔اُس روز آپ لے جانا بھول گئیں اور میں آپ کو دینا۔بہر حال، وہ آپ کی امانت کے

طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔آپ جب چاہیں لے جاسکتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے........میں ایک گھنٹے میں آپ کے پاس پہنچ رہی ہوں۔"

اس نے کہیں قریب ہی سے مجھے فون کیا تھا۔ وہ آئی اور مذکورہ دستاویز لے کر چلی گئی۔ نہ میں نے اس سے پوچھا اور نہ ہی اس نے بتانے کی زحمت کی کہ وہ اس دستاویز کے فوری حصول کے لئے اتنی مضطرب کیوں تھی۔ میں اس دستاویز کا کارڈ کھیل کر جو بھی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا اس میں کامیاب ہو چکا تھا۔اب وہ سرکاری کاغذ کے اس نمونے کو کسی فائل میں لگاتی یا کہیں اور رکھ دیتی، میری بلا سے۔

دو روز بعد طارق نے مجھے فون کیا۔ وہ میری کوششوں کو سراہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر اس کا تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو شاید میں اتنی اچھی طرح کامیاب نہ ہوتا۔اس وضاحت کے اختتام پر میں نے اس سے پوچھا۔

"یار! یہ بتاؤ کہ آج کل تمہیں بسکٹ فیکٹری سے کتنی تنخواہ مل رہی ہے؟"

"اٹھارہ سو روپے۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تمہیں تمہاری صلاحیتوں کی بناء پر ایک پیشکش کر رہا ہوں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم اگر میرے پاس کام کرنا پسند کرو تو میں تمہیں ڈھائی ہزار روپے تنخواہ دوں گا۔اور فیکٹری کی بہ نسبت ٹائم بھی بہت کم........دوپہر دو بجے سے رات آٹھ بجے تک۔"

"بیگ صاحب! میں آپ کی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "لیکن میں نے ملازمت ترک کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔بسکٹ فیکٹری میں بھی یہ میرا آخری ماہ ہے۔آپ نے اپنی کوششوں سے ہمیں جو رقم دلوائی ہے میں اس سے کوئی بزنس کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"

ملازمت کی بہ نسبت ذاتی کاروبار کا فیصلہ زیادہ عقل مندی کا ثبوت تھا۔لہٰذا مجھے اپنی پیشکش کے ٹھکرائے جانے کا ذرا افسوس نہیں ہوا۔ میں نے اس کے فیصلے کو سراہتے ہوئے فراخ دلی سے کہا۔

"اوکے........بیسٹ آف لک!"

اُس نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد رابطہ ختم کر دیا۔

☆.....☆.....☆

خوش فہم

ایک بے تکلف دوست کے ساتھ پُر تکلف لنچ کر کے میں اپنے دفتر پہنچا تو میری سیکرٹری صوفیہ نے انٹرکام پر مجھ سے پوچھا۔

''سر! گرین ٹی چلے گی؟''

موسم کی مناسبت سے یہ ایک پُرکشش پیش کش تھی........وہ فروری کے ابتدائی ایام تھے۔ کوئٹہ کی طرف سے آنے والی برفیلی ہواؤں نے پورے کراچی اور اس کے گرد ونواح کو اپنی ٹھنڈی ٹھار لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ سردی کے موسم میں بھوک زیادہ لگتی ہے شاید اسی لئے میں لنچ میں کچھ زیادہ ہی کھا گیا تھا جس کے سبب معدے میں کچھ بھاری پن محسوس ہو رہا تھا۔ اس کیفیت میں گرین ٹی اکسیر کا کام کرتی ہے۔ میں نے صوفیہ کی پیش کش کے جواب میں خوش دلی سے کہا۔

''صوفی! نیکی اور پوچھ پوچھ........؟''

''سر! آپ مجھے صوفی نہ کہا کریں۔'' صوفیہ نے دھیرے سے احتجاج کیا۔

''کیوں، صوفی میں کیا خرابی ہے؟''

''بس، مجھے عجیب سا لگتا ہے۔''

''بھئی! صوفی صوفیہ کا مخفف ہے اور اس میں بڑی معصومیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں اس میں کیا عجیب لگتا ہے؟''

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ ''سر! جب آپ مجھے صوفی کہتے ہیں تو لگتا ہے جیسے میرے چہرے پر بال سے نکل آئے ہوں۔''

''تو یہ تمہاری سمجھ کا پھیر ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں زبر سے صَوفی کہتا ہوں اور تم پیش سے صُوفی سمجھ لیتی ہو۔ اینی ہاؤ........میں آئندہ خیال رکھوں گا۔ اور ہاں، وہ گرین ٹی فوراً بھیج دو۔''

''تھینک یو سر!'' یہ کہتے ہوئے صوفیہ نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نے ''تھینک یو'' کس سلسلے میں کہا تھا۔ میرے آئندہ اُسے صوفی نہ کہنے کے وعدے پر یا اس کی گرین ٹی والی پیش کش قبول کرنے پر؟

تھوڑی ہی دیر کے بعد آفس بوائے گرین ٹی لے کر میرے چیمبر میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک ریڈ نیوز بھی لایا تھا۔ چائے کی پیالی کو میز پر سجانے کے بعد اُس نے کہا۔

''بیگ صاحب! شمروز خان آپ سے ملنے آیا ہے۔''

میں نے آفس بوائے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے........ دس منٹ کے بعد اسے میرے پاس بھیج دینا۔''

شمروز خان کو میں کافی عرصے سے جانتا تھا۔ شمروز ایک پڑھا لکھا ''خان صاحب'' تھا۔ ایوب کے زمانے میں اس نے میٹرک پاس کیا تھا۔ اُن دنوں میٹرک کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی اور دور دراز چھوٹے علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا میٹرک پاس کرنا اور ہی زیادہ اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ آج کل ایم اے پاس کو اس قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا جو اس زمانے میں میٹرک پاس کی ہوتی تھی۔ شمروز خان کا تعلق صوابی سے تھا۔ وہ بڑی صاف اُردو بولتا تھا۔

والد کے انتقال کے بعد گھر کا شیرازہ بکھر گیا۔ تین بھائیوں میں سے ایک ماں کے پاس گاؤں میں رہ گیا اور آبائی زمینوں کی دیکھ بھال کر کے گھر چلانے لگا۔ شمروز خان اور نوروز خان نے شہروں کا رخ کیا تھا۔ نوروز خان کو لاہور پسند آ گیا اور شمروز نے کراچی میں ڈیرا ڈال لیا۔ دونوں کی بیویاں آبائی گاؤں ہی میں تھیں۔ یہ لوگ اپنی فیملی کو سپورٹ کرنے کے علاوہ ماں اور سب سے بڑے بھائی افروز خان کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے۔ فی زمانہ کسی کی مالی مدد کر دینا ہی سب سے زیادہ ''خیال رکھنا'' تصور کیا جاتا ہے اور اس کارِ خیر میں یہ دونوں بھائی کسی بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔

نوروز خان نے لاہور کے انارکلی بازار میں گھڑیوں کی چھوٹی سی دکان کھول لی تھی جبکہ شمروز خان کراچی میں ایک امریکی الیکٹریکل اینڈ مکینیکل کمپنی میں بطور اسٹور کیپر ملازم تھا۔ مذکورہ امریکی کمپنی کا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں۔ یہ کمپنی بجلی کی بہت سی گھریلو استعمال کی مصنوعات کے علاوہ بڑی معیاری اور عمدہ قسم کی سلائی مشینیں بھی بناتی تھی۔ اس کا انتظام و انصرام براہِ راست امریکیوں کے ہاتھ میں تھا۔ آج کل بھی یہ کمپنی موجود ہے لیکن اس کا سیٹ اپ مقامی لوگ چلاتے ہیں، امریکیوں کا اس میں عمل دخل نہیں رہا۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے، اس کی مصنوعات کا وہ پہلے والا معیار رہا اور نہ ہی لوگوں کا اس کمپنی پر وہ اندھا اعتماد۔ بہرحال،

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!

شمروز خان خاصا مستعد اور فعال شخص تھا۔ اسٹور کیپنگ کے ساتھ ہی وہ اندرونی سیاست میں بھی کود پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ یونین کا صدر بھی منتخب ہو گیا۔ ازاں بعد جب امریکی مالکان نے اس کمپنی کو الوداع کہنے کا فیصلہ کیا تو بہت کم عرصے کے دوران بہت سے ملازمین کو فارغ کر دیا گیا۔ مقامی لوگوں نے اس کمپنی کی باگ ڈور سنبھالی تو ان ملازمین کو نشانے پر رکھ لیا جو کسی بھی حوالے سے یونین سازی میں ملوث تھے چنانچہ سب سے پہلے شمروز خان کو نکال باہر کیا گیا۔

شمروز خان پڑھا لکھا ہونے کے باعث قانون قاعدے سے اچھی طرح آگاہ تھا لہٰذا اس نے نئے مالکان اور کمپنی کے خلاف عدالت میں مقدمہ کر دیا۔ یونین کا صدر ایک طویل عرصہ رہنے کے بعد اسے ہر قسم کی بھڈے بازی آ گئی تھی۔ وہ دو سال تک نئے مالکان کو عدالت میں گھسیٹتا رہا۔ شمروز کی خوش قسمتی کہ اسے ایک نہایت ہی تجربہ کار اور مخلص وکیل میسر آ گیا تھا۔ اس وکیل کی محنت اور شمروز کی کوشش نے کمپنی کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور اس زمانے میں وہ مذکورہ کمپنی سے دو لاکھ روپے وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ الگ بات کہ ان دو سالوں میں اس نے عدالتی اخراجات کی مد میں پچاس ساٹھ ہزار روپے اپنی جیب سے خرچ کر ڈالے تھے۔

ایک موٹی رقم شمروز کے ہاتھ آئی تو اس نے اپنا بزنس شروع کر دیا۔ اگرچہ اس کاروبار کو ناپسندیدہ نظر سے دیکھا جاتا ہے لیکن میں نے شمروز خان کو انتہائی اصول پسند، ایمان دار اور دیانت دار پایا تھا۔ وہ لوگوں کو سود پر قرض دیتا تھا۔ جس کثیر المنزلہ عمارت میں میرا دفتر تھا وہاں بھی چند افراد نے شمروز خان سے سود پر قرض لے رکھا تھا لہٰذا ہر ماہ اگائی (کلیکشن) کے سلسلے میں اُس کا ایک چکر اُدھر ضرور لگتا تھا اور وہ جب بھی مذکورہ عمارت میں آتا، مجھ سے ملاقات کئے بنا جاتا نہیں تھا۔ مجھ سے جان پہچان اور مراسم کا سبب ضیاء صاحب تھے۔ وہی سینئر اور تجربہ کار وکیل جنہوں نے شمروز خان کا کیس لڑ کر اسے کامیابی دلائی تھی۔ ضیاء صاحب ایک حوالے سے میرے استاد رہے تھے۔ میں نے جب وکالت کی پریکٹس کا آغاز کیا تو کچھ عرصہ اپرنٹس کی حیثیت سے ان کے ساتھ کام کرنے کا مجھے موقع ملا تھا۔ اس دوران میں نے ضیاء صاحب سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ ضیاء صاحب کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ ضیاء صاحب، شمروز خان کو اپنے دوستوں میں رکھتے تھے، اسی ناتے کی بناء پر میں بھی شمروز کو اپنا تعلق دار سمجھتا تھا۔ ویسے ہر شے سے قطع نظر شمروز خان ایک نائس انسان تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی شمروز خان میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ میں نے روایتی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ہمارے درمیان رسمی علیک سلیک ہو چکی تو میں نے پوچھا۔

''خان صاحب! آپ کے لئے کیا منگواؤں؟ چائے یا اور کچھ؟''

''چائے تو میں پی کر آ رہا ہوں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔'' آج کل موسم ایسا ہو رہا ہے کہ جتنی بھی چائے پی جائے، مزید پینے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ آپ یقیناً چائے پی کر آئے ہیں۔ ایک پیالی میری طرف سے بھی پی لیں۔''

''میں نے جس چائے کا ذکر کیا ہے وہ آپ ہی کے دفتر میں پی ہے بیگ صاحب!''

میں نے چونک کر سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' جب میں یہاں پہنچا، آپ کی سیکرٹری اور آفس بوائے گرین ٹی پی رہے تھے.......انہوں نے مجھے بھی اصرار کر کے سبز چائے کی ایک پیالی پلا دی ہے۔''

''اوہ!'' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

شمروز خان نے زیرِ لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔

میں نے ایک لمحے کے توقف سے استفسار کیا۔'' آج کی کلیکشن کیسی رہی؟''

وہ اپنی اگائی کے لئے ایک سے دس تاریخ تک ادھر آتا تھا اور وہ ماہِ فروری کے ابتدائی ایام ہی تھے۔ شمروز نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''بیگ صاحب! اگائی وغیرہ کا حال تو پہلے ہی جیسا ہے۔ لوگ شوق اور ضرورت کے تحت قرض تو لے لیتے ہیں اور دو چار ماہ تک باقاعدہ سود کی رقم بھی ادا کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے بعد عموماً ان کا رویہ ایسا ہو جاتا ہے جیسے میں ان کا مقروض ہوں۔ حالانکہ جب وہ مجھ سے قرض لے رہے ہوتے ہیں تو ان سے زیادہ کوئی یتیم اور مسکین نظر نہیں آتا۔ بعد میں اس قرض کی ادائیگی کو وہ بوجھ سمجھنے لگتے ہیں۔ اکثر تو گھر پر ہی نہیں ملتے، منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ بڑا عجیب وغریب بزنس ہے یہ بھی بیگ صاحب! آپ کی اس عمارت میں چار افراد نے مجھ سے قرض لے رکھا ہے جن میں ایک تو وکیل صاحب ہیں مگر ان چار میں سے صرف ایک شخص ایسا ہے جو سود کی رقم وقت پر ادا کر دیتا ہے۔ دو کبھی دیتے ہیں اور کبھی خوشامد درآمد کر کے مجھے کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتے ہیں۔ اور چوتھا تو پچھلے کئی ماہ سے ہاتھ ہی نہیں آ رہا۔ خیر، بڑے بکھیڑے ہیں اس کاروبار میں۔''

”بکھیڑے تو ہیں۔“ میں نے چٹکی لینے والے انداز میں کہا۔ ”لیکن اگر سود کی شرح کو دیکھا جائے تو آپ کا غم کافی حد تک ہلکا ہو جانا چاہئے۔ دیگر قرضہ دینے والے کمپنیوں یا بینکوں کے مقابلے میں آپ لوگ بہت زیادہ وصول کرتے ہو۔“

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں مانتا ہوں ......آپ کی بات کو درست تسلیم کرتا ہوں۔ مگر یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمارے بزنس میں کس قدر رِسک ہے۔ بینک یا دوسرے مالیاتی ادارے قرض دینے سے پہلے سو قسم کی کاغذی کارروائی کرتے ہیں۔ ویری فکیشن کی جاتی ہے۔ قرض کے خواہش مند کو دو ضامن پیش کرنا پڑتے ہیں۔ پھر کہیں جا کر اس کا قرضہ منظور ہوتا ہے۔ وہ خرچہ نما رشوت اس کے علاوہ ہے جو محکمے کے اندر خرچ کرنا پڑتی ہے۔ متعلقہ افراد میں سے ہر ایک کا حصہ بندھا ہوتا ہے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ مٹھائی کے نام پر ہزاروں روپے پیش کرنے کے بعد قرضے کا چیک ہاتھ میں آتا ہے۔ علاوہ ازیں اس پروسس کو مکمل ہونے میں جو وقت صرف ہوتا ہے، اس کا حساب بھی لگا لیں جبکہ........“

وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

”جبکہ ہم لوگ صرف گھر دیکھتے ہیں اور فوراً قرض دے دیتے ہیں۔ ہمارے پاس اس سلسلے میں ایسی کوئی دستاویز بھی نہیں ہوتی کہ جسے پیش کر کے عدالت کے ذریعے ہم اپنی ڈوبی ہوئی رقم حاصل کر سکیں۔ ویسے بھی آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ قرض کی واپسی کے لئے عدالتی چارہ جوئی عموماً نقصان دہ یا بے فائدہ ہی ثابت ہوتی ہے۔ قرض دار اگر رونی صورت بنا کر جج کے سامنے یہ کہہ دے کہ اسے کاروبار میں عظیم الشان خسارہ ہوا ہے اور اس وقت اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکے تو عدالت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ جو شخص اس حد تک مفلس اور قلاش ہو چکا ہو، اس سے عدالت کیا اور کون سی رقم نکلوا کر قرض خواہ کو دلوائے گی؟“

شمروز خان جو حقائق بیان کر رہا تھا اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی اور میں اس سلسلے میں اس سے کسی بحث کے موڈ میں نہیں تھا۔ لہٰذا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

”اور سنائیں خان صاحب! کیا خبریں ہیں؟“

وہ فوراً میرے اس سوال کی افادیت اور اہمیت تک پہنچ گیا۔ اس طرح چونکا جیسے اسے کوئی نہایت ہی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ میری طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

”بیگ صاحب! آج میں آپ کے پاس اپنے ایک ذاتی کام سے آیا تھا۔ لیکن گفتگو کا سلسلہ کسی اور جانب بہہ نکلا اور میں اپنی بات بھول ہی گیا۔“

میں نے ازراہِ مذاق کہا۔ ''کیا کسی قرض دار پر کوئی کیس کرنے کا پروگرام ہے؟''

''نہیں جناب! اللہ اس کی نوبت نہ لائے۔ مشکل، آسان جیسے بھی سہی، ہم اپنا پیسہ نکلوانے کا ہنر جانتے ہیں۔ میں دراصل داؤد خان کے سلسلے میں آپ سے ملنے آیا تھا۔ وہ بیٹھے بٹھائے ایک مصیبت میں آ گیا ہے۔''

یہ نام میرے لئے اجنبی تھا۔ میں نے متذبذب انداز میں استفسار کیا۔

''کون داؤد خان؟''

وہ بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میرے مقصد تک پہنچ گیا، جلدی سے بولا۔ ''داؤد میرا سگا بھائی نہیں۔ آپ یوں سمجھیں، وہ میرا پشتون بھائی ہے۔''

''اوہ........تو یہ بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''داؤد خان کس نوعیت کی مشکل کا شکار ہو گیا ہے؟''

''پولیس نے اُسے قتل کے الزام میں تھانے میں بند کر دیا ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''اس واقعے کو آج تیسرا دن ہے۔''

''اوہ!'' میرے لہجے میں تشویش در آئی۔ ''اس کا مطلب ہے وہ اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ پولیس ایک روز سے زیادہ کسی بھی گرفتار شدہ شخص کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتی۔ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر ضروری رپورٹ کے ساتھ ملزم کو عدالت میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے۔''

شمروز خان نے بتایا۔ ''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں بیگ صاحب! داؤد اس وقت عدالتی ریمانڈ پر پولیس کی کسٹڈی میں ہے۔ مجھے آج صبح ہی اس کے بارے میں پتہ چلا ہے۔ ورنہ میں اسی روز آپ کے پاس چلا آتا جب پولیس نے داؤد کو گرفتار کیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''داؤد خان نے کس کو قتل کیا ہے؟''

''مقتولہ کا نام یاسمین بتایا جاتا ہے۔'' شمروز نے جواب دیا۔

''مقتولہ کا ملزم کے ساتھ کیا تعلق تھا؟'' میں نے فوراً رف پیڈ اور قلم سنبھال لیا۔

اس موقع پر شمروز خان نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس نے مجھ سے کہا۔

''میرا خیال ہے، میں داؤد خان اور اسے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں پہلے آپ کو مختصراً بتا دوں تاکہ معاملہ سمجھنے میں آپ کو آسانی رہے۔ اس طرح آپ کا وقت بھی بچے

گا اور مجھے بھی تسلی رہے گی۔ آپ کیا کہتے ہیں؟"
"آپ کا خیال بہت نیک ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "شروع ہو جائیں۔"
اور وہ شروع ہو گیا........
شمروز خان کی زبانی مجھے داؤد خان کے حالات کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا اس میں سے غیر ضروری باتوں کو حذف کر کے میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ میرے ساتھ ساتھ آپ بھی اس کیس کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔

***

داؤد خان سے شمروز خان کا کوئی قریبی رشتہ نہیں تھا۔ جیسا کہ شمروز نے بتایا، وہ اس کا پشتون بھائی تھا اور اسی بھائی چارگی کے جذبے سے مجبور ہو کر شمروز اُسے اس مصیبت سے نکالنا چاہتا تھا۔ اُس کا یہ فعل لائق ستائش تھا۔ میں ہمہ تن گوش اس کا بیان سنتا چلا گیا۔
داؤد خان پیشے کے اعتبار سے ایک چوکیدار تھا۔ وہ گزشتہ پانچ ماہ سے "ڈائمنڈ ہائٹس" میں چوکیداری کر رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کسی اور بلڈنگ میں یہی کام کرتا تھا۔ "ڈائمنڈ ہائٹس" گھاس منڈی جیسے گنجان آباد علاقے میں واقع تھی۔ یہ ایک پانچ منزلہ عمارت تھی جس کے دو بلاکس تھے۔ اے اور بی۔ ہر بلاک میں تیس فلیٹ تھے۔ یعنی ہر منزل پر چھ فلیٹس۔ ایک منزل کے تمام فلیٹس ایک جیسی مکانیت پر مشتمل نہیں تھے۔ ان میں ایک کمرے سے لے کر تین کمروں تک کے فلیٹس تھے۔ اس رہائشی عمارت کا مین گیٹ ایک ہی تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوں تو بائیں جانب ایک مختصر سی کار پارکنگ تھی اور دائیں طرف اے بلاک واقع تھا۔ اسی کے متوازی بی بلاک کی عمارت کھڑی تھی۔ کسی زمانے میں اس پلاٹ پر ٹائیلوں کی ایک فیکٹری ہوا کرتی تھی۔ فیکٹری ختم ہوئی تو مالک نے وہ پلاٹ ایک بلڈر کو فروخت کر دیا۔
سننے میں آتا تھا کہ مذکورہ بلڈر نے پہلے اس پلاٹ پر صرف ایک بلاک ہی تعمیر کیا تھا۔ باقی ساری جگہ پارکنگ کے لئے تھی۔ بعد ازاں متعلقہ محکمے میں کوئی "ہنر مندی" دکھا کر دوسرے بلاک کی تعمیر کے لئے بھی اجازت لے لی تھی۔ دوسرے بلاک کی عمارت کھڑی ہوئی تو پارکنگ کا احاطہ آدھا رہ گیا۔ دوسرے بلاک کی تعمیر کے سبب وہاں رہائش پذیر فیملیز کی تعداد تیس سے بڑھ کر ساٹھ ہو گئی۔ چنانچہ پارکنگ کی تنگی داماں کی شکایت میں بھی کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ یہ ساری تفصیل خوانخواہ بیان نہیں کی جا رہی۔ اگر آپ کے ذہن میں یہ نقشہ موجود رہے گا تو کہانی کو انجوائے کرنے کا زیادہ لطف آئے گا۔ کیونکہ پوری کہانی اسی بلڈنگ میں گھومتی نظر آئے گی۔

''ڈائمنڈ ہائٹس'' میں دو چوکیدار تھے۔ داؤد دن کی ڈیوٹی پر مامور تھا جبکہ رات میں معراج ڈیوٹی دیتا تھا۔ دونوں چوکیداروں میں اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی تھی حالانکہ داؤد کو اس بلڈنگ میں نوکری کرتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ جبکہ معراج لگ بھگ چھ سال سے وہاں ملازمت کر رہا تھا۔ وہ دونوں باہمی اتفاقِ رائے سے اس طرح چھٹی بھی کر لیتے تھے کہ ایک کی جگہ اس روز دوسرے کو ڈیوٹی دینا پڑتی یعنی مذکورہ روز وہ پورے چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی رہتا۔ ویسے یہ بات یونین والوں سے طے تھی اور ڈائمنڈ ہائٹس کے تمام مکین بھی جانتے تھے کہ رات والا چوکیدار رات دو بجے کے بعد سو جاتا تھا اور رات دو بجے سے صبح چھ بجے تک بلڈنگ کے مین گیٹ کو اندر سے لاک کر دیا جاتا تھا۔

***

داؤد خان کو پولیس نے یاسمین نامی ایک سیلز گرل کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔ واقعات کے مطابق آٹھ فروری کی سہ پہر مقتولہ اپنی کمپنی کی تیار کردہ مختلف گھریلو استعمال کی اشیاء کی فروخت کے سلسلے میں ڈائمنڈ ہائٹس میں داخل ہوئی پھر اسے بلڈنگ سے رخصت ہوتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اگلے روز اس کی لاش سویپر کو اس ڈکٹ میں پڑی ملی جو دونوں بلاکس کے درمیان تازہ ہوا کی آمد و رفت کے لئے چھوڑا گیا تھا۔ آخری مرتبہ یاسمین کو داؤد کے ساتھ بہت گھل مل کر باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یاسمین لانڈھی کی رہنے والی تھی اور ''کے۔ کے ٹریڈرز'' کے لئے سیلز گرل کے طور پر کام کرتی تھی۔ وہ اور اس جیسی اور بہت سی لڑکیوں کو گھر گھر دستک دے کر کمپنی کی مصنوعات فروخت کرنا ہوتی تھیں اور اس کام کے لئے وہ شہر کے مختلف علاقوں میں گھومتی پھرتی تھیں۔ یاسمین کی بدقسمتی کہ وہ اس روز گھاس منڈی کے علاقے میں واقع ''ڈائمنڈ ہائٹس'' نامی بلڈنگ میں داخل ہوئی اور پھر زندگی اس سے روٹھ گئی۔ ''کے۔ کے ٹریڈرز'' کا دفتر اور گودام وغیرہ کورنگی کے علاقے میں تھا۔

جو واقعات سامنے آئے ان کی رو سے داؤد نے آٹھ فروری کی رات چھٹی کرتے وقت معراج سے کہا کہ وہ دوسرے روز یعنی نو فروری کو دیر سے ڈیوٹی پر آئے گا۔ اسے ایمرجنسی میں حیدر آباد جانا پڑ گیا ہے۔ آئندہ روز دوپہر تک وہ آ جائے گا۔ لیکن اگلے روز دوپہر سے پہلے ہی خاکروب نے یاسمین کی لاش دریافت کر لی اور دوپہر ڈھل جانے کے باوجود بھی جب داؤد حیدر آباد سے نہیں لوٹا تو اس کی ذات کے گرد شکوک وشبہات کا ایک حلقہ سا بنتا چلا گیا۔ داؤد کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہ اپنے چاچا کے پاس کھارادر میں رہتا تھا۔ جب پولیس کی تفتیش کا رخ داؤد کی جانب ہوا تو انہوں نے پہلی فرصت میں اس کے چاچا عبدالرحمٰن کے گھر پر چھاپہ

مارا۔ داؤد گھر کے اندر موجود تھا۔ پولیس اسے یاسمین کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئی۔ اگلے روز اسے عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ لے لیا گیا تھا۔ اس وقت وہ پولیس کی تفتیش پر تھانے میں بند تھا اور اس کا ہمدرد اور خیر خواہ پشتون بھائی شمروز خان میرے سامنے بیٹھا اس کی مظلومیت و بے گناہی کی داستان سنا رہا تھا۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔

''خان صاحب! آپ کی فراہم کردہ معلومات کافی نہیں ہیں....... اس سلسلے میں مجھے داؤد سے ایک ملاقات کرنا ہوگی۔ پھر ہی کوئی بات میری سمجھ میں آسکے گی۔''

شمروز نے مجھے متعلقہ تھانے کا نام بتایا اور کہا۔ ''ویسے تو یہ پولیس والے ریمانڈ والے ملزم سے کسی کو آسانی سے ملنے نہیں دیتے۔ لیکن میرا خیال ہے، آپ کو اس سلسلے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آج دفتر سے اُٹھنے کے بعد میں متعلقہ تھانے جا کر داؤد سے ملاقات کرلوں گا۔''

شمروز خان نے فیس کا ذکر چھیڑا تو میں نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ ''پہلے میں داؤد سے مل کر حالات و واقعات کا ایک رف سا اسکیچ بنا لوں، پھر فیس بھی لے لوں گا۔ آپ کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے نا!''

''جیسے آپ کی خوشی بیگ صاحب!'' شمروز نے دوستانہ انداز میں کہا۔

ایک دو ضروری باتوں کے بعد میں نے اسے رخصت کر دیا۔

اس روز اتفاق سے میرے ملاقاتیوں کی تعداد بہت کم رہی تھی۔ لہٰذا میں انہیں زیادہ سے زیادہ وقت دینے کے لئے آزاد تھا۔ اس مندی کا سب سے بڑا سبب تو موسم تھا۔ سردی نے اچانک ایسی شدت پکڑ لی تھی کہ آج کا کام کل پر ڈالنے کو جی چاہتا تھا۔ یہی سب دیکھتے ہوئے میں نے بھی دفتر سے جلدی اُٹھنے کا ارادہ کر لیا۔ میرا ارادہ ملزم داؤد سے ملاقات کرنے کا تھا۔

***

تھانے کے حاضر ڈیوٹی عملے کے ساتھ مجھے مکالمات کی چند ''اٹکھیلیاں'' کرنا پڑیں۔ اس کے بعد مجھے ملزم سے ملاقات کے لئے پندرہ بیس منٹ کی ''اجازت'' دے دی گئی۔ میں سیدھا حوالات میں پہنچ گیا۔ جس کانسٹیبل نے یہاں تک میری رہنمائی کی تھی، وہ تھوڑے فاصلے پر کھڑا ہو کر چوکنا نظر سے مجھے دیکھنے لگا جیسے اُسے خدشہ ہو کہ میں کوئی خطرناک جادوگر ہوں جو جادو کے زور پر داؤد کو مکھی بنانے کے بعد اس حوالات سے باہر نکال کر لے جاؤں گا۔ میں

مذکورہ کانسٹیبل کو اس کے ''حال'' پر چھوڑ کر داؤد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

داؤد خان درمیانے قد اور مناسب صحت کا مالک ایک عام سا شخص تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس اور پینتالیس کے درمیان قائم کیا۔ بعد میں میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس کی عمر چوالیس سال تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو داؤد خان حوالات کے بیچ بستہ فرش پر اُکڑوں بیٹھا تھا لیکن کانسٹیبل کی پکار پر اسے اٹھ کر کھڑا ہونا پڑا تھا اور تبھی میں نے اس کے قد کاٹھ، عمر اور صحت کے بارے میں اندازہ قائم کیا تھا۔

داؤد خان کو کانسٹیبل کی زبانی یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کا وکیل ہوں۔ رہی سہی تعارفی کسر میں نے نکال دی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ ہے۔ شمروز خان نے مجھے تمہارا وکیل مقرر کیا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں اُمید کی کرن چمکی۔ پھر اس نے دھیمے لہجے میں مجھے بتایا۔ ''شمروز خان میرے پاس ملنے کے لئے آیا تھا۔ میں نے پولیس والوں سے بھی بات کی ہے لیکن کوئی میری بے گناہی کا یقین کرنے کو تیار نہیں۔ شمروز خان نے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے لئے کسی چوٹی کے وکیل کا بندوبست کرے گا........ وہ چوٹی کے وکیل آپ ہی ہو نا؟''

میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''چوٹی اور ایڑی کا تو مجھے کوئی خاص اندازہ نہیں البتہ یہ ضرور ہے کہ شمروز نے مجھے تمہاری کہانی کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ میں اپنی وکالت کے جوہر دکھا کر تمہیں اس مصیبت سے نکال لوں۔''

''اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہو گی وکیل صاحب!'' وہ ممنونیت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اُمید افزاء انداز میں بولا۔ ''آپ یقین کریں، میں نے اُس لڑکی کو قتل نہیں کیا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''کوئی بھی قسم کھانے یا پینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''پولیس والوں نے تم سے ملاقات کے لئے مجھے بہت کم مہلت دی ہے اس لئے میں تم سے جو کچھ پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ اس بات کا فیصلہ میں خود کروں گا کہ تم نے کسی کو قتل کیا ہے یا نہیں۔ اگر میرا فیصلہ تمہارے حق میں ہوا تو سمجھ لو پھر تمہیں کسی قسم کی کوئی سزا نہیں ہو گی۔''

ابھی تک میں خود اس کیس کی صورت اور کیفیت سے پوری طرح واقف نہیں تھا لیکن آخری دو تین حوصلہ افزاء جملے میں نے اس لئے داؤد خان سے کہے تھے کہ وہ اندر سے مضبوط ہو جائے۔ یہ بہت ضروری تھا۔ اس طرح مجھے اپنے کام میں بہت آسانی رہتی۔ ان

باتوں سے قطع نظر کسی مصیبت زدہ شخص کو کوئی اُمید دلانا ایک نیک کام ہے، خاص طور پر وہ نیک کام جس پر کچھ خرچ نہ ہو رہا ہو، کرتے رہنا چاہئے۔ اس سلسلے میں کسی بخل سے کام لینا ٹھیک نہیں۔

داؤد خان کے کڑے انٹرویو کے بعد میں نے وکالت نامے پر اس کے دستخط لے کر اس کا وکیل بننے کا اعلان کر دیا۔ اس ملاقات میں ہونے والے سوال و جواب اور ان سے اخذ کردہ نتائج کے بارے میں فی الحال میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ عدالتی کارروائی کے دوران پرت در پرت یہ نکات کھلتے چلے جائیں گے۔ اس بات کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ داؤد خان قتل کے اس کیس میں ملوث نہیں۔ اسے ایک گہری سازش کے تحت اس معاملے میں گھسیٹا گیا تھا۔ اور مجھے اس کے تار و پود عدالت کے روبرو بکھیر کر اصل مجرم کو سامنے لانا تھا۔

***

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

میں نے اپنے وکالت نامے کے سامنے ملزم داؤد کی درخواست ضمانت دائر کر دی۔ وکیلِ سرکار نے ضمانت کے خلاف ایک لمبی چوڑی تقریر کر ڈالی۔ اپنی باری پر میں نے ملزم کی ضمانت کے حق میں دلائل دیئے لیکن جج نے داؤد خان کی درخواست ضمانت رد کر دی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت فوری طور پر ہونا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر وکیلِ صفائی کے پاس نہایت ہی ٹھوس جوازِ ضمانت موجود ہو پھر بھی اس درخواست کی منظوری میں چند ماہ لگ جاتے ہیں۔ میں نے اپنے مؤکل کی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لئے جو پوائنٹس جمع کئے تھے انہیں بہت سوچ سمجھ کر مناسب موقع پر استعمال کرنا تھا لہٰذا میں درخواست ضمانت کی نامنظوری پر بالکل مایوس نہیں تھا۔

جج نے ایک ماہ کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

اس روز شمروز خان کے علاوہ ملزم کا چاچا عبدالرحمٰن خان بھی عدالت میں موجود تھا۔ عبدالرحمٰن، داؤد کا ہم پیشہ تھا۔ ایک فیکٹری میں وہ رات کی ڈیوٹی کرتا تھا......کھارادر والے مکان میں داؤد اور عبدالرحمٰن کے سوا اور کوئی نہیں رہتا تھا۔ عبدالرحمٰن کی فیملی سرحد کے ایک گاؤں میں تھی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو عبدالرحمٰن نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ نے زیادہ زور نہیں دکھایا۔''

میرے جواب دینے سے پہلے ہی شمروز بول اُٹھا۔ ''چاچا! آپ کو عدالتی چکروں کا زیادہ

تجربہ نہیں ہے اس لئے پریشان ہو رہے ہو۔ داؤد نے کوئی مرغی نہیں چرائی یا کسی شخص کے ساتھ معمولی دنگا فساد نہیں کیا جو نہایت ہی آسانی سے پہلی پیشی پر اسے بری کر دیا جائے۔ میں آپ کو بتاتا........''

''شمروز خان!'' عبدالرحمٰن اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''داؤد نے کچھ نہیں کیا۔ چوری اور لڑائی بھڑائی تو پھر بھی دور کی بات ہے۔''

''آپ نے سننے سے پہلے ہی میری بات کاٹ دی چاچا!'' شمروز خان نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو اسی سلسلے میں کچھ بتا رہا تھا۔ بہرحال!'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''واقعی، داؤد نے کوئی جرم نہیں کیا۔ یہ بات ہم کہہ رہے ہیں اور اس لئے کہہ رہے ہیں کہ وہ ہمارا اپنا ہے۔ ہم جانتے ہیں، وہ بے گناہ ہے۔ لیکن عدالت کسی کی رشتے دار یا دوست نہیں۔ وہاں داؤد کو قتل کے ایک ملزم کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا جب تک بیگ صاحب یہ ثابت نہیں کر دیتے کہ داؤد بے گناہ ہے، عدالت اسے بری نہیں کر سکتی۔ یہ فوج داری کا کیس ہے چاچا! اس لئے ہمت جوان اور حوصلے بلند رکھو۔ بیگ صاحب بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔ انشاء اللہ فتح ہماری ہی ہوگی۔''

عبدالرحمٰن اُمید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

شمروز خان کا چونکہ خود بھی مختلف مقدمات کے سلسلے میں عدالت میں آنا جانا ہوتا رہا تھا لہٰذا ان معاملات کو وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس کی بریفنگ نے میری مشکل آسان کر دی ورنہ عبدالرحمٰن کو یہی بات سمجھانے کے لئے مجھے کافی دقت پیش آتی۔

''ٹھیک ہے بیگ صاحب!'' شمروز خان نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''داؤد کو تو عدالت نے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا ہے۔ اب ہماری ملاقات آئندہ پیشی پر ہی ہوگی۔ بیچ میں اگر آپ کو میری ضرورت پیش آ جائے تو مجھے فون کر کے بلا سکتے ہیں۔ ویسے مہینے کی ابتدائی تاریخوں میں میرا آپ کی بلڈنگ میں چکر تو لگے گا ہی۔''

میں نے گھمبیر انداز میں کہا۔ ''شمروز خان! عدالت نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر ہمیں ہوم ورک کے لئے اچھی خاصی مہلت فراہم کر دی ہے۔'' اتنا کہہ کر میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی، پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ایک دوسری عدالت میں میرا ایک نہایت ہی اہم کیس لگا ہوا ہے اس لئے مجھے فوراً وہاں پہنچنا ہوگا۔ آپ ایک آدھ روز میں میرے دفتر آ جائیں .... آپ سے کچھ ضروری

باتیں کرنا ہیں........ یوں سمجھیں، آپ کو کچھ کام سونپنا ہے۔''

''خیریت تو ہے نا، بیگ صاحب؟'' شمروز نے اُلجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں خان صاحب!'' میں نے جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''بالکل خیریت ہے۔ دراصل اس روز حوالات میں داؤد سے میری جو ملاقات ہوئی تھی اس میں، میں نے چند اہم نکات اپنے ذہن میں محفوظ کر رکھے ہیں۔ اسی سلسلے میں مجھے آپ کی مدد کی ضرورت پیش آئے گی۔ بہت سی باتوں کی وضاحت کے لئے آپ کو تھوڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑے گی۔ میں چاہتا ہوں جب کیس کی باقاعدہ سماعت شروع ہو تو اس وقت ہم ایک مضبوط بنیاد پر کھڑے ہوں۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' شمروز خان نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''انشاء اللہ! میں دو تین روز میں دفتر میں آ کر آپ سے ملتا ہوں۔''

اس کے بعد ان دونوں نے باری باری میرا شکریہ ادا کیا اور ایک سمت کو بڑھ گئے........ میں نے اس مذکورہ متعلقہ عدالت کا رخ کیا جہاں میرے ایک کیس کی سماعت شروع ہونے والی تھی۔

***

سب سے پہلے میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ذکر کروں گا۔ اس رپورٹ کے مطابق، مقتولہ یاسمین کی موت آٹھ فروری بروز ہفتہ سہ پہر چار اور پانچ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب وہ خطرناک چوٹ تھی جو کسی نوک دار شے سے ٹکرانے کے نتیجے میں مقتولہ کے سر میں لگی تھی۔ علاوہ ازیں مقتولہ کی گردن پر کچھ ایسے آثار بھی ملے تھے جیسے کسی نے اُس کا گلا دبانے کی کوشش کی ہو۔ مقتولہ کے لباس کی حالت بتاتی تھی کہ کسی درندہ صفت شخص نے اسے دبوچنے کے لئے کافی تگ و دو کی تھی اور اس کی اسی وحشیانہ کارروائی میں دو چار مقامات سے مقتولہ کا لباس پھٹ بھی گیا تھا۔ تاہم خیریت گزری کہ وہ ہوس پرست اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ مقتولہ کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بناتا، مقتولہ سر میں لگنے والی مہلک چوٹ کے سبب زندگی ہار گئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں چند ٹیکنیکل باتیں درج تھیں جن کے ذکر کی یہاں ضرورت ہے اور نہ ہی آپ کے لئے کسی دلچسپی کا باعث ہوں گی۔

یاسمین نامی اُس بدنصیب لڑکی کی لاش ڈائمنڈ ہائٹس کے ڈکٹ میں پڑی ملی تھی اور اسے گھریلو استعمال کی اشیاء کی فروخت کے سلسلے میں اس بلڈنگ میں چکراتے ہوئے بھی دیکھا

گیا تھا۔ لہٰذا یہ بات تو یقینی تھی کہ اس بے چاری سیلز گرل کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ ڈائمنڈ ہائٹس ہی میں پیش آیا تھا اور وہ درندہ بھی انہی فلیٹس میں سے کسی ایک میں موجود تھا جو اس کی موت کا ذمہ دار تھا۔

یاسمین .... جیسا کہ میں نے بتایا، لانڈھی کی رہنے والی تھی۔ اسے ''کے۔ کے ٹریڈرز'' میں کام کرتے ہوئے لگ بھگ آٹھ ماہ ہوئے تھے۔ یاسمین کی فیملی نہایت ہی مختصر تھی اور وہی اس مختصر سی فیملی کی کفیل بھی تھی۔ عرصہ ہوا، اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ بوڑھی والدہ دمے کی مریضہ تھی، اور بارہ سالہ ایک چھوٹا بھائی تھا جو غالباً چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔

اس فیملی کی فیور میں صرف ایک ہی پلس پوائنٹ تھا کہ وہ لوگ جس چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے تھے وہ ان کا اپنا تھا۔ لیکن گھر کے واحد کفیل کی حیثیت سے یاسمین کی اندوہ ناک موت نے اس مختصر سے گھرانے کی گویا کمر توڑ کر رکھ دی تھی .... اس سانحے کے جو بھی بد اثرات یاسمین کی ماں سعیدہ اور چھوٹے بھائی فرہاد علی پر مرتب ہوئے ہوں گے، انہیں بیان کئے بغیر بھی بڑی آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے .... اگرچہ میں داؤد کا وکیل تھا، اس کے باوجود بھی یاسمین کے پسماندگان کا غم مجھے اپنے سینے پر محسوس ہو رہا تھا۔ بلاشبہ ان لوگوں پر بہت ظلم ہوا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ میں اس کیس میں داؤد خان کی وکالت کر رہا تھا اور میری پہلی کوشش یہی تھی کہ اپنے مؤکل کو اس کیس میں سے اس طرح کھینچ کر باہر نکال لاؤں جیسے مکھن میں سے بال نکالا جاتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں تھا کہ میں یاسمین کی فیملی کا دشمن ہوں۔ میں نے اپنے ذہن میں یہ بات نقش کر لی تھی کہ مجھے داؤد کی بریت کے ساتھ ساتھ کوشش کر کے اس شخص کو بھی بے نقاب کرنا ہے جو اس سانحے کا اصل ذمہ دار تھا تاکہ اسے قرار واقعی سزا مل سکے۔ یہ میرے فرائض کا حصہ نہیں تھا لیکن ایسا سوچتے ہوئے اور ایسا کرنے کا تصور کرتے ہوئے مجھے روحانی سکون مل رہا تھا۔

دو روز کے بعد شمروز میرے دفتر آیا اور میں نے اس کے ذمے نہایت ہی اہم کام لگا دیا۔ اس نے میری مطلوبہ معلومات فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو گیا۔

آئندہ تین روز کی کوشش کے بعد اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اب میں ''ڈائمنڈ ہائٹس'' کے ایک ایک مکین کے بارے میں اہم اور ضروری معلومات رکھتا تھا۔ یاسمین کا قاتل اسی بلڈنگ میں کہیں چھپا بیٹھا تھا اور مجھے اس کو بے نقاب کر کے اپنے مؤکل کو باعزت بری کروانا تھا۔

آئندہ پیشی سے پہلے پہلے میں نے اپنا تحقیقی کام مکمل کرلیا۔

***

عدالت کی با قاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا۔

جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم داؤد خان نے میری ہدایت کے مطابق صحتِ جرم سے انکار کردیا۔

اس کے بعد ملزم کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ عدالت کے روبرو جو بھی بیان دیا جاتا ہے وہ حلفیہ بیان ہی کہلاتا ہے کیونکہ کسی بھی سلسلے میں زبان کھولنے سے پہلے حلف اُٹھاتے ہوئے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ میں جو کچھ بھی کہوں گا، سچ کہوں گا........اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

ملزم داؤد خان نے معزز عدالت کے روبرو جو بیان دیا وہ اس بیان کی ترقی یافتہ شکل تھی جو اس سے پہلے وہ پولیس کو دے چکا تھا اور اس کے بیان میں رونما ہونے والی یہ ''ترقی'' میری ہدایات کا نتیجہ تھی۔

داؤد کا بیان ریکارڈ ہو چکا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے قریب چلا گیا۔ چند لمحات تک وہ گہری نگاہ سے ملزم کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر سلسلۂ سوالات کا آغاز کرتے ہوئے اس نے داؤد خان سے پوچھا۔

''تمہیں ڈائمنڈ ہائٹس میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

''لگ بھگ پانچ چھ ماہ!'' ملزم نے جواب دیا۔

وکیلِ استغاثہ نے استفسار کیا۔ ''اس سے پہلے تم کہاں کام کرتے تھے؟''

''جمانی اسکوائر میں۔''

''یہ جمانی اسکوائر کہاں پر واقع ہے؟''

''کریم آباد کے علاقے میں۔''

''جمانی اسکوائر میں بھی تم چوکیداری ہی کرتے تھے یا کوئی اور کام؟''

''میں وہاں پر بھی چوکیدار ہی تھا۔'' ملزم نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ کے لہجے میں درشتی آتی چلی گئی۔ اس نے ملزم سے اگلا سوال خاصے جارحانہ انداز میں کیا۔

''جمانی اسکوائر کام چھوڑنے کا سبب کیا تھا؟''

میں وکیلِ استغاثہ کی جرح کے انداز کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ میرے مؤکل کو اس زاویے سے ضرور گھسنے کی کوشش کرے گا چنانچہ اس سلسلے میں، میں نے داؤد خان کو بہت کچھ گھول کر پلا دیا تھا لہٰذا وہ میری ہدایات اور رٹائے ہوئے سبق کی روشنی میں وکیلِ استغاثہ کے جواب میں بولا۔

''جمانی اسکوائر کی یونین کے صدر جمال الدین سے ان بن ہو گئی تھی۔ میں کافی دنوں سے تنخواہوں میں اضافے کے لئے اس سے کہہ رہا تھا لیکن وہ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ٹال دیتا۔ یونین والے مجھے جو تنخواہ دے رہے تھے اس میں میرا گزارہ نہیں ہوتا تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ جمال الدین کو میری مشکلات کی ذرا بھی پرواہ نہیں تو میں نے اِدھر اُدھر دوسری جگہوں پر کام کی تلاش میں نظر دوڑانا شروع کر دی۔''

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر سلسلۂ جواب کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ ''پھر مجھے پتہ چلا کہ ڈائمنڈ ہائٹس کا دن والا چوکیدار ملازمت چھوڑ کر جا رہا ہے۔ میں نے یہاں کوشش کی اور مجھے نسبتاً زیادہ تنخواہ پر نوکری مل گئی۔ لہٰذا میں نے جمانی اسکوائر کی ملازمت چھوڑ دی۔''

''بہت خوب!'' وکیلِ استغاثہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''ملازمت چھوڑ دی یا تمہیں نوکری سے نکال دیا گیا تھا؟''

''میں نے خود نوکری چھوڑی تھی۔'' ملزم نے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میرے سننے میں تو یہ آیا ہے کہ تمہیں یونین کے صدر نے از خود نوکری سے نکالا تھا اور اس بے دخلی کا سبب تمہارا وہ جھگڑا تھا جو جمانی اسکوائر کے ایک رہائشی عبدالستار سے ہوا تھا۔ تم نے عبدالستار کے ساتھ خاصی بدتمیزی کی تھی جس کے نتیجے میں یونین کے صدر نے تمہیں نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔ اگر ضرورت پیش آئی تو میں جمال الدین کو شہادت کے لئے عدالت میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔''

میں چونکہ وکیلِ استغاثہ کے طریقۂ واردات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا اس لئے مجھے اس جرح میں مزہ بھی آ رہا تھا۔ جب انسان ذہنی طور پر مطمئن اور پُرسکون ہو تو اسے کوئی بھی کھیل کھیلنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ میری بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ وکیلِ استغاثہ کے ان تیکھے سوالات سے گھبرا کر میرا مؤکل کسی مرحلے پر کوئی غلطی کر بیٹھے اس لئے اس کے حوصلے کو جوان رکھنے کی غرض سے میں نے با آوازِ بلند کہا۔

''آبجیکشن یور آنر!........ وکیلِ استغاثہ غیر متعلقہ بحث میں پڑ کر معزز عدالت کا قیمتی

وقت برباد کر رہے ہیں۔ اس وقت عدالت میں یاسمین مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔ یاسمین نامی اس بدنصیب لڑکی کا کسی جمال الدین یا عبدالستار یا جمانی اسکوائر سے کبھی کوئی تعلق واسطہ نہیں رہا لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ وکیلِ استغاثہ کو زیرِ سماعت کیس تک محدود رہنے کی ہدایت کی جائے۔''

وکیلِ استغاثہ نے میرے خاموش ہوتے ہی جارحانہ انداز میں کہا۔

''مقتولہ کا جمانی اسکوائر یا عبدالستار سے کوئی تعلق نہ رہا ہو لیکن ملزم کے گہرے تعلق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔''

وکیلِ استغاثہ کے معنی خیز انداز کو دیکھتے ہوئے جج نے اس سے پوچھ لیا۔

''وکیل صاحب! کیا آپ ملزم اور جمانی اسکوائر کے ذکر سے کوئی خاص بات ثابت کرنا چاہتے ہیں؟''

''ابسولیوٹلی یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے باآوازِ بلند کہا۔ ''میں جس واقعے کی طرف اشارہ کر رہا ہوں اس کے کھل کر سامنے آنے سے ملزم کے کردار پر بڑی روشنی پڑے گی۔''

''جرح جاری رکھی جائے!'' جج نے تحکمانہ انداز میں کہا اور اپنی کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا لی۔

وکیلِ استغاثہ ملزم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''ہاں، تو کیا تم معزز عدالت کو یہ بتانا پسند کرو گے کہ عبدالستار سے تمہارا جھگڑا ہوا تھا یا نہیں؟''

''جھگڑا ہوا تھا۔'' میرے مؤکل نے مختصر سا جواب دیا۔

''اس جھگڑے کا سبب کیا تھا؟''

ملزم نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''عبدالستار رات کو روزانہ دیر سے گھر واپس آتا تھا۔ جمانی اسکوائر میں میری رات کی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی۔ اگر وہ رات دو بجے سے پہلے آ جاتا تو میں اس کے لئے گیٹ کھول دیتا تھا لیکن دو بجے کے بعد واپسی کی صورت میں اسے خود گیٹ کھول کر اندر آنا پڑتا تھا کیونکہ میں دو ڈھائی بجے کے قریب کمر سیدھی کرنے کے لئے فلیٹ جایا کرتا تھا۔ رات کو دیر سے آنے والوں کو گیٹ کی ایک ایک چابی دے دی گئی تھی۔ بلڈنگ کے اندر داخل ہونے کے سلسلے میں عبدالستار کو کوئی دُشواری پیش نہیں آتی تھی لیکن اس نے پارکنگ کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ وہ جس جگہ گاڑی کھڑی کرنا پسند کرتا تھا اگر وہاں پہلے سے کوئی گاڑی پارک ہوتی تو وہ مجھ پر بگڑتا

تھا۔ اس کا مطالبہ تھا کہ میں اس کی پسندیدہ جگہ پر کسی کو گاڑی کھڑی نہ کرنے دوں۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔ پارکنگ پر تمام رہائشیوں کا ایک جیسا حق تھا۔ میں کسی کو منع تو نہیں کر سکتا تھا۔ عبدالستار یہ سمجھتا تھا کہ میں جان بوجھ کر اسے پریشان کرنے کے لئے وہاں کوئی گاڑی پارک کروا دیتا ہوں۔ بس، اتنی سی بات ہے۔''

وہ لمحہ بھر کو رُکا، ایک گہری سانس لی، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اسی وجہ سے وہ مجھ سے اُکھڑا اُکھڑا رہتا تھا اور مجھے اس کی خفگی کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ کیونکہ مجھے اطمینان تھا کہ میں حق پر ہوں۔ ہمارے درمیان اسی سلسلے میں دو چار بار جھگڑا بھی ہوا تھا۔''

''واہ!........سبحان اللہ!'' وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم کہانیاں بہت اچھی بنا لیتے ہو۔ تمہیں چوکیدار ہونے کی بجائے فکشن رائٹر ہونا چاہئے تھا یا پھر شام کے کسی اخبار میں میگزین ایڈیٹر۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جو جھوٹ ہو۔'' ملزم داؤد نے سادگی سے کہا۔ ''آپ مجھ پر کہانیاں گھڑنے کا الزام لگا رہے ہیں۔''

''تم نے عبدالستار سے اپنے جھگڑے کا جو سبب بتایا ہے، درحقیقت اس کے متضاد ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''پھر حقیقت کیا ہے؟'' ملزم نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

میں اطمینان سے اپنے مؤکل اور وکیلِ سرکار کے درمیان جاری ''جھڑپ'' کو دیکھ رہا تھا اور ان کے درمیان مداخلت کی فی الحال ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ میرا مؤکل میری ہدایت پر پوری طرح عمل پیرا دکھائی دیتا تھا۔ وکیلِ استغاثہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔

''حقیقت یہ ہے کہ........عبدالستار نے ملائکہ کی وجہ سے تم سے جھگڑا کیا تھا۔''

ملائکہ........؟'' ملزم نے حیرت بھری نظر سے وکیلِ مخالف کو دیکھا۔

''کیوں........کیا تم ملائکہ کو نہیں جانتے؟''

''ملائکہ تو عبدالستار کی بیوی کا نام ہے۔''

''بہت خوب!'' وکیلِ استغاثہ نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔ ''تمہیں عبدالستار کی بیوی کا نام یاد ہے تو یقیناً یہ بھی یاد ہوگا کہ تم نے ملائکہ کے ساتھ ایسی کون سی بیہودہ حرکت کی تھی جس پر عبدالستار نے تم سے جھگڑا کیا اور یونین کے صدر سے تمہاری شکایت بھی کی۔ پھر

صدر صاحب نے تمہیں پہلی فرصت میں نوکری سے نکال دیا تھا۔ کچھ یاد آرہا ہے یا میں.....؟"

"یہ جھوٹ ہے........ بکواس ہے........" ملزم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ "میں نے کسی سے کوئی بدتمیزی کی تھی اور نہ ہی بے ہودگی....... آپ خوامخواہ مجھے بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تم تو اتنے سادے اور بھولے بھالے ہو کہ کچھ کرتے ہی نہیں ہو۔" وکیلِ استغاثہ نے تیکھے انداز میں کہا۔ "آمنہ نے بھی تم پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ حالانکہ تم تو اسے بہن مافق سمجھتے تھے۔ ہے نا؟"

وکیلِ استغاثہ کے ان ریمارکس پر حاضرینِ عدالت میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک آدھ کی تو ہنسی بھی نکل گئی۔ جج نے خصوصی آرڈر سے عدالت کے کمرے میں خاموشی کا راج قائم کیا، پھر وکیلِ استغاثہ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آمنہ کون ہے؟........ اور اُس کا کیا سلسلہ ہے؟"

وہ چٹخارے دار انداز میں بولا۔ "جنابِ عالی! آمنہ گھروں میں کام کرنے والی ایک ماسی ہے جو جمالی اسکوائر کے دو تین گھروں میں بھی کام کرنے آتی تھی۔ آمنہ نے اپنے مالکوں سے شکایت کی تھی کہ چوکیدار اُسے اکثر تنگ کرتا رہتا ہے۔ وہ نظر کا اچھا نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ چوکیدار سے مراد ہے، ملزم داؤد خان!"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" میرے مؤکل نے تردیدی انداز میں کہا۔ "آمنہ سے مجھے نہیں بلکہ جمالی اسکوائر کے رہنے والوں کو شکایت تھی۔ وہ بلاک ڈی کے فلیٹ نمبر تیرہ میں صفدر صاحب کے گھر کام کرنے آتی تھی۔ صفدر صاحب کو صفائی کا بڑا شوق تھا اور وہ اکثر آمنہ سے فلیٹ کا بیرونی دروازہ دُھلواتے تھے۔ دروازہ دُھلوانا کوئی بری بات نہیں لیکن اس کے نتیجے میں بہایا جانے والا پانی نیچے والے فلورز کے فلیٹس کے دروازوں کے سامنے جمع ہو جاتا تھا جس کی وجہ سے دوسرے اور تیسرے فلور کے فلیٹس والوں کو بڑی کوفت کا سامنا ہوتا تھا۔ انہوں نے مجھ سے اور صفدر صاحب سے کئی مرتبہ شکایت کی۔ ممکن ہے صفدر صاحب نے آمنہ کو سمجھایا ہو لیکن اس نصیحت کا کوئی اثر دیکھنے میں نہ آیا تو ایک روز میں نے آمنہ کو سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔ دراصل، اس روز ایک چار سالہ بچہ اسی جمع شدہ پانی کی وجہ سے پھسل کر بری طرح سیڑھیوں سے گر گیا تھا اور اسے اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ اس واقعے کی وجہ سے مجھے آمنہ پر شدید غصہ آیا اور جب وہ فلیٹس کا کام ختم کر کے گھر جا رہی تھی تو میں نے اسے کھری کھری سنا دی۔ آگے سے اس نے بھی خوب زبان چلائی۔ اور جب اس کی کوئی پیش نہ گئی تو وہ مجھ پر الٹے

سیدھے الزام لگانے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے ترشی سے کہا۔ ''صرف ایک تم ہی ٹھیک ہو، باقی سب لوگ غلط ہیں۔'' پھر اُس نے کچھ ایسے انداز سے جج کی طرف دیکھا جیسے یہ تصدیق چاہ رہا ہو کہ جج ملزم کے سابق کردار سے اچھی طرح آگاہ ہو گیا ہے یا وہ مزید ایک دو مثالیں پیش کرے۔

مجھے تو جج کے چہرے اور آنکھوں میں ایسا یا ویسا کوئی تاثر دکھائی نہ دیا۔ لیکن یہی لگتا تھا وکیلِ استغاثہ اس بات سے مطمئن ہو گیا ہے کہ وہ جج پر اپنا مقصد واضح کرنے میں کامیاب رہا ہے۔ اسی لئے اُس نے اپنے سوالات کا زاویہ بدل لیا تھا۔ اس نے اکیوزڈ باکس میں کھڑے داؤد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ آٹھ فروری کی سہ پہر مقتولہ اس بلڈنگ میں آئی تھی جہاں پر تم آج کل چوکیداری کر رہے تھے؟''

''جی ہاں........ یہ سچ ہے۔''

''تمہاری مقتولہ سے ملاقات ہوئی تھی؟''

''ظاہر ہے........ میں اس بلڈنگ کا چوکیدار ہوں۔'' ملزم داؤد خان نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''جو بھی شخص بلڈنگ میں داخل ہو گا اس سے میرا سامنا ضرور ہو گا۔ کوئی میری نگاہ میں آئے بغیر اندر کیسے جا سکتا ہے۔ خاص طور پر اجنبی لوگوں پر تو مجھے اور بھی گہری نگاہ رکھنا پڑتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہر وقت گیٹ پر کھڑے رہتے ہو؟''

''میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔'' ملزم نے جلدی سے کہا۔ ''میں تو یہ بتا رہا ہوں کہ میں اس بلڈنگ کا چوکیدار ہوں اور اپنی ڈیوٹی نبھاتے ہوئے مجھے ہر معاملے پر نظر رکھنا ہوتی ہے۔ چاہے میں بلڈنگ کے کسی بھی حصے میں موجود کیوں نہ ہوں۔''

''اوکے!'' وکیلِ استغاثہ نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز جب تم نے مقتولہ کو بلڈنگ میں داخل ہوتے دیکھا تو اس وقت تم کہاں تھے؟ .... میرے پوچھنے کا مطلب یہ ہے کہ تم دونوں کی ملاقات بلڈنگ کے کس حصے میں ہوئی تھی؟''

''بلاک اے کے، فلیٹ نمبر دو سو تین کے سامنے۔''

''تم اس وقت فلیٹ نمبر دو سو تین کے سامنے کس سلسلے میں کھڑے تھے؟''

''میں وہاں ایک ضروری کام سے آیا تھا۔''

''کیا تم نے مقتولہ سے استفسار کیا تھا کہ وہ کون ہے اور کس مقصد سے ڈائمنڈ اپارٹمنٹس میں داخل ہوئی ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے سلسلۂ سوالات کو دراز کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''کیونکہ تمہاری نگاہ تو بڑی تیز ہے، خاص طور پر اجنبی چہروں کو تو تم فوراً تاڑ لیتے ہو۔''

ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں وکیل صاحب!........ میں نے اُس بی بی سے اس سلسلے میں پوچھا تھا اور اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا تھا۔

''مقتولہ نے تمہیں اپنے بارے میں کیا بتایا تھا؟''

''اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک کمپنی کی تیار کی ہوئی مختلف گھریلو استعمال کی اشیاء گھر گھر جا کر فروخت کرتی ہے۔'' ملزم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کے جواب سے مطمئن ہو گیا کیونکہ اس نے ایک بھاری بھرکم بیگ کندھے پر لٹکا رکھا تھا اور شکل سے خاصی تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آج دن بھر میں اس نے کچھ زیادہ سیل نہ کی ہو لہٰذا میں نے اسے وہاں کوشش کرنے کی اجازت دے دی۔''

''مسٹر داؤد!'' اس مرتبہ وکیلِ استغاثہ نے ملزم کو اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ڈائمنڈ ہائٹس کے باہر بیرونی گیٹ کے پہلو میں دیوار پر ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں ہے جس پر جلی حروف میں چند ہدایات درج ہیں۔ مثلاً یہ کہ........ ملاقاتی حضرات اپنی گاڑیاں گیٹ کے باہر دیوار کے ساتھ کھڑی کریں........ کسی پھیری والے شخص کو بلڈنگ کے اندر داخل ہو کر کچھ فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے........ کسی بھی بات پر چوکیدار سے اُلجھنے کی کوشش نہ کریں........ اگر کوئی شکایت ہو تو یونین سے رابطہ کریں، وغیرہ وغیرہ۔''

وہ سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا پھر سلسلۂ اعتراضات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس نے میرے مؤکل سے پوچھا۔ ''اتنی واضح اور سخت پابندی کے باوجود بھی تم نے مقتولہ کو بلڈنگ میں اپنی گشتی دُکانداری چمکانے کی اجازت کیوں دے دی؟ اس طرح تو تم نے بلڈنگ کے قوانین کی کھلی خلاف ورزی نہیں کی تھی؟''

ملزم نے بڑے تحمل سے وکیلِ استغاثہ کی ترش و تلخ بات سنی، پھر جواب دیا۔

''یہ بات تمام بلڈنگ والوں اور یونین کے صدر تک کو معلوم ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو بلڈنگ میں آنے کی چھوٹ ہے۔ پاپے، مکھن، ڈبل روٹی والے، پرانے کپڑوں کے عوض المونیم کے برتن بیچنے والے، مچھلی والے، کولر اور چولہے وغیرہ ٹھیک کرنے والے، بچوں کو حفاظتی ٹیکے لگانے والے، ایک دو مانگنے والے ہیجڑے اور اسی قسم کے چند افراد بلڈنگ میں

آتے جاتے رہتے ہیں۔ مقتولہ جیسے لوگ بھی کبھی کبھار چکر لگا لیتے ہیں۔ میں نے اس سلسلے میں کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ کیونکہ یہ سلسلہ میرے آنے سے پہلے ہی چل رہا تھا اور اس معاملے میں مجھے خاص طور پر کوئی ہدایات بھی نہیں دی گئی تھیں۔ لہٰذا میں قصور وار نہیں ہوں۔"

"ہاں، ہاں...... یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وکیلِ استغاثہ نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ "تم تو شکل ہی سے معصوم اور بے قصور دکھائی دیتے ہو۔

وکیل استغاثہ کے اس تبصرے پر ملزم نے کچھ نہ کہا، خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وکیل استغاثہ نے ایک مرتبہ پھر سوالات کے رخ کو تھوڑا تبدیل کر لیا اور کٹہرے میں موجود اس کیس کے ملزم اور میرے مؤکل سے پوچھا۔

"ذرا سوچ کر بتاؤ، ڈائمنڈ ہائٹس میں کل کتنے فلیٹس ہیں؟"

"اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے؟" وہ حیرت سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس بلڈنگ میں دو بلاک ہیں، اے اور بی۔ ہر بلاک میں تیس فلیٹس ہیں۔ اس طرح کل ملا کر ساٹھ فلیٹس بنتے ہیں۔"

"کیا ان تمام فلیٹس میں ان کے مالک خود رہائش پذیر ہیں یا کچھ کرائے پر بھی اُٹھے ہوئے ہیں؟" وکیلِ استغاثہ نے سوال کیا۔

"ملی جلی کیفیت ہے جناب!" داؤد خان نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ "مالکان خود بھی رہ رہے ہیں اور بعض کرائے پر بھی اُٹھے ہوئے ہیں اور دو تین خالی بھی پڑے ہیں۔"

وکیلِ استغاثہ نے اچانک اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تمہاری اپنی کیا کیفیت ہے؟ تم اس بلڈنگ میں کرائے دار کی حیثیت سے رہ رہے ہو یا مکان مالک کی حیثیت سے؟"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں وکیل صاحب؟" ملزم نے استعجابیہ لہجے میں کہا۔ "میں تو اس بلڈنگ کا چوکیدار ہوں...... مالک یا کرائے دار کیسے ہو سکتا ہوں کسی فلیٹ کا؟"

"دراصل......" وکیلِ استغاثہ نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں بلاک اے کے فلیٹ نمبر دو سو تین میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔ میں اُسی فلیٹ کی بات کر رہا ہوں جس کے سامنے وقوعہ کے روز مقتولہ سے تمہاری آخری ملاقات ہوئی تھی...... میری معلومات کے مطابق اب فلیٹ کی چابی تمہارے پاس ہے اور تم اپنی مرضی سے اس کے اندر آتے جاتے رہتے ہو۔"

''فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین ڈاکٹر مہندر کمار کا ہے۔ پچھلے دنوں ڈاکٹر صاحب کا تبادلہ کراچی سے حیدر آباد ہو گیا ہے۔'' ملزم نے اپنی پوزیشن صاف کرتے ہوئے وضاحت کی۔ ''ڈاکٹر صاحب یہ فلیٹ بیچنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے حیدر آباد جاتے وقت وہ اس فلیٹ کی چابی مجھے دے گئے تھے کہ اگر کوئی خریدار پارٹی سامنے آجائے تو میں اسے فلیٹ دکھا کر فون پر ڈاکٹر صاحب سے بات کروا دوں۔ مذکورہ فلیٹ میں ٹیلی فون کی سہولت بھی موجود ہے۔ یہ ہے سارا سلسلہ۔''

وکیلِ استغاثہ نے چونکنے کی اداکاری کی اور سرسری لہجے میں بولا۔ ''حیدر آباد کے ذکر پر یاد آیا کہ تم بھی تو حیدر آباد جانے والے تھے؟''

''ہاں......جانے والا تھا۔لیکن جا نہیں سکا۔'' ملزم نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''تم نے آٹھ فروری کی رات چھٹی کرتے وقت رات والے چوکیدار معراج سے درخواست کی تھی کہ تمہیں کسی ایمرجنسی کے سلسلے میں اچانک حیدر آباد جانا پڑ رہا ہے لہٰذا اگلے روز یعنی نو فروری کو تم ذرا دیر سے ڈیوٹی پر آؤ گے۔اس لئے معراج تمہارے واپس آنے تک بلڈنگ میں موجود رہے۔'' وہ لمحاتی طور پر ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا پھر چبھتے ہوئے لہجے میں اس نے ملزم سے سوال کیا۔

''کیا تم معزز عدالت کو یہ بتاؤ گے کہ تمہیں کس ایمرجنسی کے تحت حیدر آباد جانے کی ضرورت پیش آئی تھی؟ اور پھر تم حیدر آباد گئے کیوں نہیں؟''

ملزم نے بڑی توجہ سے وکیلِ استغاثہ کا سوال سنا، پھر جواب دیا۔ ''حیدر آباد میں میرا ایک رشتے کا ماموں رہتا ہے۔اس کا نو تاریخ کو آپریشن ہونے والا ہے اس لئے میں اس کو دیکھنے جانے والا تھا۔لیکن جا اس لئے نہیں سکا کہ گھر پہنچتے ہی مجھے تیز بخار ہو گیا۔ہلکا ہلکا بخار تو صبح ہی سے تھا مگر گھر میں قدم رکھتے ہی مجھے شدید نیند محسوس ہونے لگی۔ میں کمر سیدھی کرنے کی غرض سے ذرا دراز ہوا تو میری آنکھ لگ گئی۔رات کے آخری پہر میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو تیز بخار میں تپتے ہوئے پایا۔اس وقت چاچا بھی گھر بھی نہیں تھا۔چاچا عبدالرحمٰن اپنی رات کی ڈیوٹی پر جا چکا تھا۔گھر میں بخار کی گولیوں کا ایک پتا رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے دو چار گولیاں نکال کر پانی سے نگل لیں اور دوبارہ لیٹ گیا۔ پھر اگلے روز جب چاچا عبدالرحمٰن ڈیوٹی سے واپس آیا تو اس نے جھنجوڑ کر مجھے جگایا''۔

اس نے تھوڑا توقف کر کے چند گہری گہری سانسیں لیں، پھر سلسلۂ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''صبح جب ایک ڈاکٹر کا کلینک کھلا تو چاچا مجھے اپنے ساتھ ڈاکٹر کو دکھانے لے گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے چیک کیا، سوئی لگائی، دوائی دی اور کہا کہ کم از کم ایک دن آرام بہت ضروری ہے ورنہ دوبارہ طبیعت خراب ہو جائے گی۔ ہم کلینک سے گھر آ گئے۔ پھر چاچا نے مجھے کہیں جانے نہیں دیا۔ مجھے رہ رہ کر معراج کا خیال بھی آ رہا تھا لیکن پھر میں نے سوچا، کوئی بات نہیں، وہ سنبھال لے گا۔ میں رات کو جا کر اسے صورتِ حال سے آگاہ کر دوں گا۔ لیکن رات کو میرے نکلنے سے پہلے ہی پولیس گھر پر آ گئی اور انہوں نے مجھے مقتولہ یاسمین کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا۔''

ملزم اس طویل وضاحت کے بعد خاموش ہوا تو وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔

''پولیس نے جب تمہیں گرفتار کیا تو تم گھر میں اکیلے ہی پڑے تھے۔ کیا چاچا عبدالرحمٰن تمہیں بیمار چھوڑ کر ڈیوٹی پر چلا گیا تھا؟''

''چاچا کی رات کی ڈیوٹی تھی اور ظاہر ہے اسے ڈیوٹی پر تو جانا ہی تھا۔'' ملزم نے بیزار سے انداز میں بتایا۔ ''اس نے مجھے ڈاکٹر کو دکھا کر دوائی لا دی تھی۔ وہ میری چارپائی پکڑ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا نا۔ ڈیوٹی تو ڈیوٹی ہی ہوتی ہے۔ اور چوکیدار کی ڈیوٹی کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی ہے۔ اس میں دھوپ، بارش اور بیماری، پریشانی کو بھی نظر انداز کرنا پڑتا ہے۔''

''جیسا کہ تم نے کہا۔'' وکیلِ استغاثہ نے انتہائی کڑوے لہجے میں چوٹ کی۔

ملزم تلملا کر رہ گیا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''ہم واپس ڈائمنڈ ہائٹس کے فلیٹ نمبر، اے۔ دو سو تین میں آ جاتے ہیں .... وہ فلیٹ جو کسی ڈاکٹر مہندر کمار کی ملکیت ہے جو حیدر آباد شفٹ ہو چکا ہے۔ مگر مذکورہ فلیٹ کی چابی تمہارے پاس رہتی تھی۔'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر تیز لہجے میں ملزم سے دریافت کیا۔

''مجھے پتہ چلا ہے، وقوعہ کے روز مقتولہ سے مختصر بات چیت کرنے کے بعد تم اسے فلیٹ نمبر، اے۔ دو سو تین کے اندر لے گئے تھے؟''

''یہ جھوٹ ہے۔'' ملزم احتجاجی انداز میں چلّایا۔ ''میں اُسے فلیٹ میں کیوں لے کر جاؤں گا؟ مجھے اُس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟''

''کیا تمہارے وکیل صاحب نے تمہیں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟'' وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس رپورٹ میں وہ وجہ بڑی واضح نظر آتی ہے جس کے لئے تم اسے فلیٹ کے اندر لے گئے تھے۔''

''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے احتجاجی لہجے

میں کہا۔ ”استغاثہ کے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں ہے جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ ملزم وقوعہ کے روز مقتولہ کو کسی فلیٹ کے اندر لے گیا تھا۔ کیا کسی عینی شاہد نے مقتولہ کو ملزم کے ہمراہ فلیٹ نمبر اے۔دوسوتین میں داخل ہوتے دیکھا تھا یا وکیلِ استغاثہ مفروضوں پر کھیل رہے ہیں؟“

جج نے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وکیل صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟“

وکیلِ استغاثہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جنابِ عالی! استغاثہ کے پاس اس سلسلے میں ایک وٹنس موجود ہے۔ استغاثہ کے گواہوں میں اس کا نام شامل ہے۔ جب گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوگا تو میں اسے ضرور پیش کروں گا۔“

”کون ہے وہ؟“ ملزم نے براہِ راست وکیلِ استغاثہ سے پوچھ لیا۔

”مہرین شہزاد۔“

”اوہ.......!“ ملزم نے ایک گہری سانس خارج کی۔ ”گراؤنڈ فلور والے شہزاد حسین کی بیوی۔“

”تم لوگوں کی بیویوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی معلومات نہیں رکھتے ہو؟“ وکیلِ استغاثہ نے گھور کر اسے دیکھا اور کہا۔ ”تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ میں شہزاد حسین کی بیوی مہرین ہی کی بات کر رہا ہوں۔ اسی عورت نے دیکھا تھا کہ تم مقتولہ کے ساتھ فلیٹ نمبر دو سوتین میں داخل ہوئے تھے۔“

”وہ جھوٹ بولتی ہے۔“ داؤد خان نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”مہرین اور اس کے شوہر کا تو مجھ سے خداواسطے کا بیر ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟“

وکیلِ استغاثہ نے رازدارانہ انداز میں ملزم سے دریافت کیا۔

”آپس کی بات ہے، چپکے سے مجھے بتا دو کہ مہرین اور اس کے شوہر کو تم سے بقول تمہارے خداواسطے کا بیر ہے، اس کا سبب بھی وہی تو نہیں جو جمانی اسکوائر والے عبدالستار اور اس کی بیوی ملائکہ کا تھا؟“

”نہیں جی.......ایسی کوئی بات نہیں۔“ ملزم نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے آخری تیر چلا دیا۔ ”مسٹر داؤد!“ ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟“

یہ انتہائی ذاتی نوعیت کا سوال تھا اور وکیلِ استغاثہ ایسا سوال پوچھنے کا کوئی حق نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اُس کی اس حرکت پر غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھا کیونکہ اس

وقت میں بیٹنگ کر رہا تھا اور وکیلِ استغاثہ کی باؤلنگ چل رہی تھی۔ وہ جتنے بھی یارکر مارتا، مجھے اُنہیں روکنا تھا۔ اُس کے ہر باؤنسر کو پُل کرنا تھا۔ اس سلسلے میں بڑے صبر و تحمل کے مظاہرے کی ضرورت تھی جو میں کر رہا تھا، اس یقین کے ساتھ کہ اس کے بعد میری باؤلنگ تھی۔ اس وقت میں اگلی پچھلی ساری کسر نکال سکتا تھا۔

مجھے تو شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا اور یقیناً اب تو آپ بھی سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ وکیلِ استغاثہ کی پہلی اور آخری کوشش یہی تھی کہ وہ کسی طرح معزز عدالت کے سامنے میرے مؤکل کے کردار کو مشکوک ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے تاکہ یاسمین کے قتل کا ملبہ بہ آسانی ملزم کے کندھوں پر ڈالا جا سکے اور میں ایسا ہرگز نہ ہونے دیتا۔''

میرے مؤکل نے وکیلِ استغاثہ کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''بس، نہیں کی........اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں ہے۔''

وکیلِ استغاثہ نے بال کی کھال نکالتے ہوئے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے جان بوجھ کر شادی نہیں کی یا کسی خاص وجہ سے تمہاری شادی نہیں ہو سکی؟........میرا مطلب ہے تمہاری شہرت کے سبب........!''

وکیلِ استغاثہ معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''میری شہرت اللہ کے فضل سے ہمیشہ اچھی ہی رہی ہے۔ آپ جھوٹے واقعات سنا کر میری شہرت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ میں نے شادی کی کوشش کی لیکن ابھی تک اس سلسلے میں مجھے کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وکیلِ استغاثہ پر ایک گہری چوٹ کر دی۔ ''میں شادی کے لئے انتہائی سنجیدہ ہوں۔ اگر آپ کی نظر میں کوئی موزوں لڑکی ہو تو بتائیں۔''

''نہ بابا نہ۔'' وکیلِ استغاثہ فوراً ہینڈز اَپ ہو گیا۔ ''تمہارا سابق ریکارڈ صاف نہیں ہے اس لئے میں کسی قسم کا کوئی رِسک لینے کی غلطی نہیں کر سکتا۔''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں وکیل صاحب!''

ملزم کا یہ جملہ اتنا وسیع معنی تھا کہ وکیلِ استغاثہ بل کھا کر رہ گیا۔ مزید ایک دو سوالات کے بعد اس نے جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

***

آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہوں کی باری آئی۔

استغاثہ کی طرف سے لگ بھگ نصف درجن گواہوں کی فہرست تیار کی گئی تھی۔لیکن میں یہاں پر صرف اہم گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کا احوال آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔''

اس سے پہلے کہ استغاثہ کی طرف سے کوئی گواہ کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوتا، میں نے جج سے درخواست کی۔

''جنابِ عالی! میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند اہم سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

آئی او (انکوائری آفیسر) ہر پیشی پر عدالت میں حاضر ہوتا ہے۔ کیونکہ کیس جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے، اس میں نئے نئے زاویے اور راستے کھلنے لگتے ہیں اور تفتیشی افسر ایک ایسا کردار ہوتا ہے جس کی کسی بھی مرحلے پر ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ ہمارے کیس کا تفتیشی افسر سب انسپکٹر اللہ داد تھا۔اس کی عمر پینتالیس سال سے متجاوز تھی۔

انکوائری آفیسر کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ جیسی ہوتی ہے۔لہٰذا جج نے میری فرمائش پوری کرنے میں کسی حیل و حجت سے کام نہیں لیا۔سب انسپکٹر اللہ داد وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''آئی او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب اور کس نے دی تھی؟'' میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پہلا سوال کیا۔

اُس نے ایک لمحہ سوچا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔''ہمارے روزنامچے کے مطابق تھانے میں اس واقعے کی اطلاع نو فروری دو بجے دوپہر دی گئی تھی۔ اور یہ اطلاع بذریعہ فون رمضان علی صاحب نے دی تھی۔''

''رمضان علی!'' میں نے زیرِ لب دوہرایا۔''یعنی ڈائمنڈ ہائٹس کی یونین کا صدر؟''

آئی او نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''چار بجے کے قریب۔''

''اتنی تاخیر سے آمد کی کوئی خاص وجہ؟''

''بس، تھانے میں کوئی مسئلہ چل رہا تھا۔'' اُس نے گول مول جواب دینے کی کوشش کی۔ ''اس لئے ہمیں نکلنے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔''

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وقوعہ کے روز آپ کے تھانے میں جو مسئلہ چل رہا تھا، وہ ''یاسمین مرڈر'' والے معاملے سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا لہٰذا آپ کو جائے وقوعہ پر پہنچنے میں خاصی دیر ہوگئی؟''

''ہاں .... کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔''

اس نے اپنی کوتاہی چھپانے کے لئے گول مول جواب دیا تو میں نے زیادہ جرح نہیں کی اور سرسری انداز میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

''ٹھیک ہے، میں نے ایسا ہی سمجھ لیا۔''

وہ اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھ کر رہ گیا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے اگلا سوال کیا۔ ''آئی او صاحب! آپ نے جائے وقوعہ پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے کیا، کیا تھا؟''

''ظاہر ہے، میں نے سب سے پہلے مقتولہ کی لاش کا معائنہ کیا تھا۔''

''لاش کا معائنہ........؟'' میں نے پُرتفکیر انداز میں کہا۔ ''لاش تو بلڈنگ کے ڈکٹ میں زمین پر پائی گئی تھی........ آپ نے ڈکٹ کے اندر جا کر اس کا معائنہ کیا تھا یا لاش کو باہر نکالنے کے بعد؟''

''ڈکٹ کے اندر۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''اس کے لئے تو آپ کو ڈکٹ کے اندر اترنا پڑا ہوگا؟''

''ظاہر ہے، اس کے بغیر چارہ ہی نہیں تھا۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میری معلومات کے مطابق ڈکٹ میں آمد و شد کا کوئی باقاعدہ راستہ نہیں ہے۔ پھر آپ اس کے اندر کیسے پہنچ پائے تھے؟''

میں اتنی سادگی اور معصومیت سے آئی او کو گھس رہا تھا کہ جیسے مجھے ''ڈائمنڈ ہائٹس'' کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہ ہوں۔ خود کو بے خبر ظاہر کر کے دوسروں کی خبر لینے میں بہت مزہ آتا ہے۔ وہ میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''آپ کی معلومات بالکل درست ہیں وکیل صاحب! اُس ڈکٹ میں داخل ہونے کے لئے واقعی کوئی راستہ نہیں چھوڑا گیا۔ پہلے تو مجھے اُس واہیات صورتِ حال پر حیرت آمیز غصہ بھی آیا تھا لیکن یونین کے صدر رمضان علی نے جب اس کی وضاحت کی تو ساری بات سمجھ میں آگئی۔ دراصل ....'' وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''دراصل، ڈائمنڈ ہائٹس کے بلڈر نے یہ ڈکٹ محض تازہ ہوا کی آمد و شد کے لئے چھوڑا

تھا۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں، آمد و رفت کے لئے ہوا کو کھڑکیوں، دروازوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اس مقصد کے لئے کھلا آسمان ہی کافی ہوتا ہے۔ بلڈنگ کے گراؤنڈ فلور پر واقع بلاک اے اور بلاک بی کے ایک ایک فلیٹ کی کھڑکی اس ڈکٹ میں کھلتی ہے جبکہ باقی فلورز کے چار چار (دو بلاک۔ اے اور دو بلاک۔ بی) فلیٹس کی کھڑکیاں اُدھر کھلتی ہیں۔ کیا آپ اس کی تفصیل بھی جاننا چاہتے ہیں؟''

''شیور!'' میں نے فوراً اثبات میں گردن ہلا دی۔

آئی او نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔

''میں نے ڈکٹ کے حوالے سے خاصی عرق ریزی کی ہے۔ گراؤنڈ فلور کے فلیٹ اے۔ دو اور بی۔ دو....... فرسٹ فلور کے فلیٹ اے۔ ایک سو دو، اے۔ ایک سو تین اور بی۔ ایک سو دو، بی۔ ایک سو تین....... سیکنڈ فلور کے فلیٹ اے۔ دو سو دو، اے۔ دو سو تین اور بی۔ دو سو دو، بی۔ دو سو تین....... تھرڈ فلور کے فلیٹ اے۔ تین سو دو، اے۔ تین سو تین اور بی۔ تین سو دو، بی۔ تین سو تین....... فورتھ فلور کے فلیٹ اے۔ چار سو دو، اے۔ چار سو تین اور بی۔ چار سو دو، بی۔ چار سو تین کی ایک ایک کھڑکی مذکورہ ڈکٹ میں کھلتی ہے۔''

''آپ نے واقعی بڑی گہری تفتیش بلکہ تحقیق کی ہے آئی او صاحب!'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوا تو میں نے ستائشی انداز میں کہا۔

''سب کرنا پڑتا ہے وکیل صاحب!'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔ ''اس کے باوجود بھی عوام کا پولیس کے حوالے سے تاثر ٹھیک نہیں۔''

میں نے ٹھوس انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''اس میں بے چاری عوام کا بھی کچھ زیادہ قصور نہیں ہے۔ سارے پولیس والے آپ کی طرح محنتی اور کام کرنے والے نہیں ہوتے۔ بہرحال، میں آپ کی محنت کو سراہنے میں کسی کنجوسی سے کام نہیں لوں گا۔''

وہ خوش ہو گیا اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بلڈر نے تو ایک نیک اور صحت افزاء مقصد کے پیشِ نظر وہ ڈکٹ چھوڑا تھا لیکن ڈائمنڈ ہائٹس کے اکثر رہائشیوں نے اس کا غلط استعمال کیا۔ مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ بعض لوگ تن آسانی کے لئے اپنے گھر کا کچرا کھڑکی کے راستے اس ڈکٹ میں پھینک دیتے ہیں۔ اس حرکت کو تن آسانی کی بجائے اگر ''بدنیتی'' کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ بلڈنگ کی صفائی ستھرائی، دُھلائی وغیرہ کے لئے ایک سویپر موجود ہے جو روزانہ ایک ایک دروازے پر دستک

دے کر کچرا لے جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی رات کی تاریکی میں ڈکٹ کے اندر کچرا بھرے تھیلوں کے لینڈ کرنے کی مخصوص ''دھمک'' گونجتی رہتی ہے جو ظاہر ہے، انہی کھڑکیوں کی مرہونِ منت ہے جو اس ڈکٹ میں کھلتی ہیں۔ بڑی دلچسپ اور مزیدار بات یہ ہے کہ باز پرس پر بھی کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں کہ اس کے گھر سے ڈکٹ میں کچرا پھینکا جاتا ہے۔ بہر حال......''

وہ لمحہ بھر کو رُکا، پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''مہینے دو مہینے میں جب یہ ڈکٹ کچرا کنڈی کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو سویپر کو گراؤنڈ فلور کے کسی (دو میں سے ایک) لیٹ کی کھڑکی میں سے کود کر ڈکٹ میں اُترنا پڑتا ہے۔ وہ اس تمام تر کچرے کو اپنے مخصوص بیگ میں بھر کر باہر نکال لاتا ہے اور اچھی طرح وہاں کی صفائی کر دیتا ہے۔ اس بے چارے کو ڈیڑھ دو ماہ کے بعد یہ عمل دوہرانا پڑتا ہے، کچرے کے اس ڈھیر کا سب سے زیادہ تکلیف اور نقصان گراؤنڈ فلور کے دو فلیٹس کے مکینوں کو پہنچتا ہے۔ مخوص بدبو اور سڑانڈ کے علاوہ اس کچرے میں مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں، جن میں کاکروچ سرِ فہرست ہیں۔ یہ حشرات الارض اور دیگر مکھی مچھر وغیرہ سب سے زیادہ انہی دو فلیٹس پر دھاوا بولتے ہیں۔ تو میں آپ کو بتا رہا تھا، وقوعہ کے روز میں بھی کھڑکی سے کود کر ڈکٹ میں پہنچا تھا۔''

''کون سے فلیٹ کی کھڑکی سے؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے سوال کیا۔ ''فلیٹ نمبر اے۔ دو یا بی۔ دو؟''

اُس نے جواب دیا۔

''فلیٹ نمبر اے۔ دو تو اس وقت بند پڑا تھا۔ لہٰذا میں فلیٹ نمبر بی۔ دو کی کھڑکی کے توسط سے ڈکٹ میں پہنچا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ سویپر جاوید ڈکٹ کی صفائی وغیرہ کے لئے یہی راستہ اختیار کرتا تھا۔ اس فلیٹ میں کوئی بیوہ تنہا رہتی ہے۔''

''اس بیوہ عورت کا نام زینن ہے اور وہ ''زینن آنٹی'' کے نام سے مشہور ہے۔'' میں نے تصدیق طلب انداز میں کہا۔ ''جبکہ فلیٹ نمبر اے۔ دو میں شہزاد حسین اپنی بیوی مہرین اور اپنے بیٹے نبیل کے ساتھ رہتا ہے؟''

''جی ہاں، بالکل!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''اس روز فلیٹ نمبر اے۔ دو کے دروازے پر تالا جھول رہا تھا۔ شاید وہ لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔''

''آئی او صاحب!'' میں نے تفتیشی افسر سے کہا۔ ''ذرا سوچ کر بتائیں، جس روز آپ کو

اس واقعے کی تفتیش کے لئے موقع واردات پر پہنچنا تھا، وہ ہفتے کا کون سا دن تھا؟''

''اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''وہ اتوار کا دن تھا۔''

''آپ کا جواب بالکل درست ہے۔'' میں نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ یاسمین کی موت آٹھ فروری بروز ہفتہ واقع ہوئی تھی جبکہ لاش کو نو فروری بروز اتوار دریافت کیا گیا اور اسی روز آپ کو بھی اطلاع دی گئی تھی۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر سرسری انداز میں کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ پر بھی بات ہوگی لیکن پہلے کچھ اور اہم امور۔''

وہ منتظر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''آئی او صاحب! جب وقوعہ کے اگلے روز آپ نے موقع واردات پر پہنچ کر مقتولہ کی لاش کا معائنہ کیا تھا تو اس کے بدن پر کون سا لباس تھا؟''

اُس نے جواب دیا۔ ''مقتولہ نے سیاہ شلوار پر لائٹ بلیو پھول دار قمیض پہن رکھی تھی اور اس کے اوپر میرون سویٹر تھا اور پاؤں میں بند سینڈل۔''

''کوئی جیولری وغیرہ؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' اس نے سرسری انداز میں بتایا۔ ''اس کے کانوں میں مصنوعی سونے کے بُندے تھے اور ایک کلائی میں چوڑیاں تھیں۔''

''چوڑیوں کا رنگ کون سا تھا؟''

''سرخ۔''

''آپ کے خیال میں وہ چوڑیاں تعداد میں کتنی ہوں گی؟''

''میں نے گنا نہیں۔'' وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ ہے کہ مقتولہ کی کلائی چوڑیوں سے بھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔''

''کون سی کلائی؟''

''بائیں کلائی۔''

''آپ نے مقتولہ کی لاش کا اچھی طرح معائنہ کیا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا آپ کو کچرے کے ڈھیر پر مقتولہ کی لاش کے قریب یا اس کے نیچے ٹوٹی ہوئی سرخ چوڑیوں کے ٹکڑے بھی پڑے ملے تھے؟''

''نن.......نہیں۔'' ایک لمحے کے تذبذب سے اس نے جواب دیا۔

''مل بھی نہیں سکتے تھے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''کیونکہ آپ مجھے بتا چکے ہیں.......''

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر لمحاتی توقف کیا تو وہ تشویش بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے ڈرامائی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی بات مکمل کر دی۔

''آپ تھوڑی دیر پہلے مجھے بتا چکے ہیں کہ مقتولہ کی بائیں کلائی سرخ چوڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ اگر ان میں سے چند یا اکثر چوڑیاں ٹوٹ جاتیں تو ان کے ٹکڑے بھی ملتے اور کلائی بھی پوری طرح بھری ہوئی دکھائی نہ دیتی۔ اور اس صورت میں آپ یقیناً اپنی رپورٹ تیار کرتے وقت اس بات کا ذکر ضرور کرتے.......ہے نا؟''

''جی.......ضرور.......'' اُس نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''آئی او صاحب! استغاثہ کے مطابق میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم ایک دغا باز اور مکار شخص ہے۔ وکیلِ استغاثہ نے مختلف حیلوں، وسیلوں اور قصے کہانیوں کی مدد سے دورانِ سماعت میں ملزم کے کردار اور رویے کو مشکوک بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ استغاثہ کی رو سے وقوعہ کے روز ملزم مقتولہ کو بہلا پھسلا کر فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین کے اندر لے گیا۔ اس نے فلیٹ کے دروازے کو اندر سے بند کیا اور مقتولہ کے ساتھ زور زبردستی کرنے کی کوشش کی۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ملزم کی وہ مذموم کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ قبل اس کے کہ ملزم اپنے شیطانی ارادے کو تکمیل تک پہنچاتا، مقتولہ کا سر کسی ٹھوس، نوکیلی شے سے ٹکرایا اور وہ اس چوٹ کے باعث گر کر بے ہوش ہو گئی۔ اس صورتِ حال نے ملزم کو خوف زدہ کر دیا۔ جب اُسے یہ محسوس ہوا کہ اس کا جرم کھل جائے گا تو اس نے اضطراری کیفیت میں مقتولہ کا گلا بھی دبایا تا کہ اگر وہ زندہ بھی رہے تو زندہ نہ رہے۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ مقتولہ کے وجود میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تو اس نے فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین کی پشتی کھڑکی میں سے مقتولہ کی لاش کو ڈکٹ میں پھینک دیا تا کہ اس کے جرم کا کوئی سراغ یا نشان اس فلیٹ میں باقی نہ رہے۔ استغاثہ کا یہی مؤقف ہے نا؟.......کہیں میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب؟''

''نن.......نہیں.......'' وہ اُلجھ کر بولا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ یہی بتاتی ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''آئی او صاحب! کیا یہ درست ہے کہ فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین سیکنڈ فلور پر واقع ہے۔

وہی فلیٹ جو کسی ڈاکٹر مہندر کمار کی ملکیت ہے اور ڈاکٹر نے اس فلیٹ کی فروخت کے سلسلے میں ملزم کو فلیٹ کی چابی دے رکھی ہے؟''

''جی ہاں........ یہ درست ہے۔'' تفتیشی افسر نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''سیکنڈ فلور کا مطلب ہے تیسری منزل۔ ہے نا؟''

''ظاہر ہے۔'' اس نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''گراؤنڈ فلور پہلی منزل ہوئی، فرسٹ فلور دوسری اور سیکنڈ فلور تیسری منزل۔''

''آپ کا حساب کیسا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھ لیا۔

''کون سا حساب؟'' وہ اُلجھ کر رہ گیا۔

''میں علمِ حساب کی بات کر رہا ہوں........ یعنی ریاضی........ میتھس۔''

''بہت اچھا۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''میں نے میٹرک میں سب سے زیادہ نمبر ریاضی کے پرچے میں حاصل کئے تھے........ پورے سو نمبر!''

''بڑی خوشی ہوئی یہ سن کر۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے، آپ میرے اگلے سوال کا بالکل درست جواب دیں گے۔''

وہ متذبذب انداز میں خاموشی سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آئی او صاحب! ذرا اپنے علمِ ریاضی کو آزمائیں اور اچھی طرح سوچ سمجھ کر مجھے جواب دیں کہ فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین کی عقبی کھڑکی زمین کی سطح سے کتنی بلندی پر واقع ہوگی؟''

اس نے چند لمحے خاموش رہ کر اپنے ذہن میں کوئی حساب جوڑا، پھر جواب دیا۔ ''میرے خیال میں مذکورہ کھڑکی کی سطح زمین سے پچیس فٹ بلند ہوگی۔''

''آپ کے علمِ ریاضی کا تو امتحان ہو گیا اور آپ اس میں امتیازی نمبروں سے پاس بھی ہو گئے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اب آپ کی عقل کا امتحان لیا جائے گا۔''

وہ میرے اس مبہم انداز پر اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''اپنی عقل کو کام میں لاتے ہوئے معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ کیا یہ ممکن ہے، کسی لڑکی کو پچیس فٹ کی بلندی سے اگر نیچے پھینکا جائے تو چوڑیوں سے بھری ہوئی اس کی کلائی میں سے ایک چوڑی بھی ٹوٹنے نہ پائے۔ وہ کسی غبارے یا پیراشوٹ کی مانند باآہستگی زمین سے آ لگے اور اس کی تمام چوڑیاں بالکل محفوظ رہیں؟''

''یہ...... یہ ممکن تو نظر نہیں آتا۔'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔
''اس کیس میں تو بالکل ایسا ہی ہوا ہے۔'' میں نے زہریلے انداز میں کہا۔ ''استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ ملزم نے پچیس فٹ کی بلندی یعنی فلیٹ نمبر اے۔ دوسوتین کی عقبی کھڑکی میں سے مقتولہ کی لاش کو ڈکٹ میں پھینکا تھا اور آپ کی رپورٹ بتاتی ہے کہ لاش کی کلائی میں موجود چوڑیوں میں سے ایک بھی نہیں ٹوٹی...... ہے نا؟''
انکوائری آفیسر اللہ داد سب انسپکٹر ان لمحات میں مجھے بڑی مشکل میں دکھائی دیا۔ وہ استغاثہ کا وارث تھا۔ اس نے میرے سوالات کے بعض ایسے جوابات دیئے تھے کہ جو استغاثہ کے مؤقف کی نفی کرتے تھے۔ میں ان سوالات سے اپنا مقصد حاصل کر چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جج بڑے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے، باری باری انکوائری آفیسر اور وکیلِ استغاثہ کو گھور رہا تھا۔ اپنے مقصد میں کامیابی پاتے ہی میں شیر ہو گیا اور آئی او کو ''مصیبت'' سے باہر کھینچتے ہوئے میں نے اپنی جرح کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل کر دیا۔
''سب انسپکٹر اللہ داد صاحب!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ یاسمین کی موت سر میں لگنے والی مہلک چوٹ کے سبب واقع ہوئی تھی۔ جب اس کا گلا دبایا گیا تو وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔ استغاثہ نے مؤقف اختیار کیا ہے کہ ملزم نے اپنے شیطانی عزائم کی تکمیل کے لئے کسی بھی بہانے مقتولہ کو ڈاکٹر مہندر کمار کے فلیٹ میں بلایا تھا لیکن جب اُسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوتی نظر نہ آئی تو اس نے ایک زوردار دھکا دے کر مقتولہ کو گرانے اور چت کرنے کی کوشش کی۔ چت ہونے کی بجائے مقتولہ کا سر کسی سخت، نوک دار شے سے ٹکرایا جو اُس کی موت کا سبب بن گیا۔ ملزم کی اس حرکت کی بناء پر استغاثہ اسے مقتولہ کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش میں ہے۔ آپ مجھے صرف اتنا بتائیں کہ مقتولہ کا سر کون سی مہلک چیز سے ٹکرایا تھا؟''
''یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں؟'' وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''میں موقعِ واردات پر موجود تھا اور نہ ہی اس منظر کو دیکھ سکتا تھا۔''
''آپ نے فلیٹ نمبر اے۔ دوسوتین کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہوگا۔'' میں نے اُس پر ایک نادیدہ جال پھینکتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے خیال میں مقتولہ کا سر کس شے سے ٹکرایا ہوگا؟'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی بات کا یقین کر لیا کہ آپ جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھے اسی لئے میں نے اپنے سوال کے الفاظ ''...... چیز سے ٹکرایا تھا'' کو آپ کی سہولت کے لئے ''...... سے ٹکرایا ہوگا؟'' میں بدل

دیا ہے۔

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے سرسری انداز میں جواب دیا۔ ''اس فلیٹ میں بہت ساری ایسی چیزیں موجود تھیں جو ٹھوس ہونے کے علاوہ نوک دار بھی تھیں۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ مقتولہ کا سر کس شے سے ٹکرایا ہوگا۔''

''ہم اس وقت جس فلیٹ کا ذکر کر رہے ہیں اس کا مالک اپنے بیوی بچوں کے ساتھ حیدر آباد شفٹ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر مہندر کمار اس فلیٹ کو بیچنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسی مقصد کی خاطر اس نے ملزم کو مذکورہ فلیٹ کی چابی دے رکھی ہے۔'' میں نے لمحہ بھر کو توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر پوچھا۔

''آئی او صاحب!.........ایک ''برائے فروخت'' فلیٹ میں بہت ساری چیزیں کسطرح ہو سکتی ہیں؟ یہ بات میری کیا، کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ آپ اس سلسلے میں تھوڑی وضاحت فرمائیں گے؟''

اُس نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور تھکے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ ڈاکٹر مہندر کمار اس فلیٹ کو فروخت کرنا چاہتا تھا اور خود اپنی فیملی کے ساتھ وہ حیدر آباد شفٹ ہو چکا تھا لیکن اس کے باوجود بھی فلیٹ کے اندر کافی بھاری سامان موجود تھا مثلاً ایک لوہے کا پلنگ، لکڑی کی ایک پرانی سی الماری، پانی کی ٹینکی کو سہارا دینے والی آہنی راڈز (اینگل آئرن)، ایک سٹول جس کی ٹاپ لکڑی کی تھیں مگر ٹانگیں اینگل آئرن کی وغیرہ وغیرہ.......ڈاکٹر مہندر کمار اس ''کاٹھ کباڑ'' کو اُٹھا کر اپنے ساتھ حیدر آباد نہیں لے گیا تھا۔'' اُس نے ایک لمحہ رُک کر سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔ میرے تیکھے سوالات نے اسے خاصی تکلیف میں مبتلا کر دیا تھا۔ اپنی وضاحت کو اختتام کی طرف آتے ہوئے اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب!.......اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آ رہا ہو تو آپ اپنے مؤکل سے اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ وہ فلیٹ اس کے تصرف میں تھا۔ یہ بہ خوبی جانتا ہے وہاں کیا کیا موجود تھا۔''

''مجھے کسی سے کوئی تصدیق کرنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''آپ نے یہ کیسی بات کر دی آئی او صاحب! میں سب سے زیادہ تو آپ ہی کی بات کا یقین کرتا ہوں۔'' میرا لہجہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ ''آپ کو یاد ہوگا، تھوڑی دیر پہلے آپ نے کہا تھا.......میں جائے وقوعہ پر موجود نہیں تھا جو یہ بتا سکوں کہ مقتولہ کا سر کس شے سے ٹکرایا

تھا۔ میں نے فوراً آپ کی بات کا یقین کرلیا تھا۔ لہٰذا مجھے بھروسہ ہے کہ آپ اب بھی ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ آپ مجھے یہ تو بتا سکتے ہیں کہ مقتولہ کے سر کے کون سے حصے میں چوٹ لگی تھی جو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئی؟''

''سر کے عقبی حصے میں.......'' اس نے پر اعتماد انداز میں جواب دیا۔ ''اُبھری ہوئی ہڈی کے نیچے۔''

''اس چوٹ کی نوعیت کیا تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''اتنی خطرناک کہ چوٹ کے مقام سے مقتولہ کا سر پھٹ گیا تھا۔''

''سر پھٹ گیا تھا تو اس میں سے خون بھی نکلا ہوگا؟''

''بہت سا.......'' اُس نے جواب دیا۔ ''میں نے جب لاش کا معائنہ کیا تو چٹخی ہوئی کھوپڑی پر بہت سارا خون جما ہوا تھا۔ سر کے بال اس خون میں لتھڑ کر عجیب سے ہو گئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر موٹی سی رسّی کی صورت اختیار کر گئے تھے۔''

''اوہو.......'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''جب بالوں کی یہ حالت ہوگئی تھی تو جائے وقوعہ پر بھی مقتولہ کا خون گرا ہوگا.......لیکن آپ کی رپورٹ میں ایسا کوئی ذکر موجود نہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں، اس کی ایک خاص وجہ ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''اور وہ یہ کہ جائے واردات پر کہیں بھی مجھے مقتولہ کے خون کے دھبے دکھائی نہیں دیئے تھے۔ ملزم نے اپنی بچت کے لئے چالاکی دکھاتے ہوئے فلیٹ کے اندر سے خون کے دھبے صاف کر دیئے تھے۔ اس کام کے لئے اسے اچھا خاصا وقت مل گیا تھا۔''

آئی او اپنی بات مکمل کر کے خاموش ہوا تو میں نے سہلانے والے انداز میں پوچھا۔

''اچھا، تو ایسا ہوا ہوگا.......ایک بات اور۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ایک بات یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ آپ کی طرف سے استغاثہ میں ایف پی (فنگر پرنٹس) کی رپورٹ موجود نہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بڑے واضح الفاظ میں یہ لکھا ہوا ہے کہ مقتولہ کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس سے پہلے سر والی مہلک چوٹ کے سبب زندگی کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ آئی او صاحب! اگر مقتولہ کی گردن پر پائے جانے والے نشانات کا ملزم کے ایف پی سے موازنہ کیا جاتا تو فوراً پتہ چل جاتا کہ یہ کس کا کام ہے.......بلکہ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جو کہ نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ بتائیں گے؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں۔'' وہ تجاہل عارفانہ سے بولا۔
''اس کا مطلب ہے آپ نے ملزم کے فنگر پرنٹس لینے یا کسی قسم کے موازنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی؟''
''ہاں.......ایسا ہی سمجھ لیں۔'' اس مرتبہ بھی اس کا انداز سرسری سا تھا۔
میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے با آواز بلند کہا۔
''جنابِ عالی! میں اپنی پُرزور اپیل سے یہ بات معزز عدالت کے ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ملک کی پولیس اب سی آئی اے، ایف بی آئی، کے جے بی، موساد وغیرہ سے بھی زیادہ فعال اور ترقی یافتہ ہو چکی ہے.......فنگر پرنٹس میچنگ سے بے نیاز۔''
میرے اس طنزیہ تبصرے پر آئی او سب انسپکٹر اللہ داد بغلیں جھانک کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس موقع پر جواب میں اسے کیا کہنا چاہئے۔ بات ختم کرتے ہی میں اُمید بھری نظر سے جج کو دیکھنے لگا تھا اور جج نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات نظر آ رہے تھے جیسے وہ استغاثہ کی ''بدمعاشی'' کو اچھی طرح سمجھ رہا ہو۔ اس نے فنگر پرنٹس والی ''کوتاہی'' کے سلسلے میں تفتیشی افسر سے ایک سوال بھی نہیں کیا۔ جس کا واضح مطلب یہی تھا کہ وہ حقائق کی تہہ میں اتر چکا ہے۔ میرے لئے یہ اطمینان بخش صورتِ حال تھی۔ اپنے حساب میں، میں اس کیس کا پلّہ اپنی جانب جھکانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔
مزید ایک دو سوالات کے بعد میں نے آئی او کو فارغ کر دیا۔
استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے رات والے چوکیدار معراج کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا۔ معراج کی عمر لگ بھگ تیس سال تھی۔ وہ دُبلے پتلے بدن کا مالک ایک عام سا انسان تھا۔ اس کا تعلق ہری پور ہزارہ سے تھا۔ معراج نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لئے وٹنس باکس کے قریب پہنچ گیا۔
''مسٹر معراج! تم ملزم کو کتنے عرصے سے جانتے ہو؟'' وکیلِ استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''یہی کوئی پانچ چھ ماہ سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔
پانچ چھ ماہ سے مراد وہ مدت تھی جب انہوں نے ایک ساتھ ''ڈائمنڈ ہائٹس'' میں کام کیا تھا۔ اس بات کو اب کئی ماہ گزر گئے تھے۔ وکیلِ استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔
''تم دونوں میں اس مختصر سے عرصے میں اچھی خاصی بننے لگی تھی۔'' وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''اس نے تمہیں اپنے ماضی کے چند قصے تو ضرور سنائے ہوں گے؟''

''جی ہاں، بہت سارے قصے سنائے ہیں۔''

وکیلِ استغاثہ نے مکاری سے پوچھا۔ ''کیا ان قصوں میں ملائکہ اور آمنہ کی کہانی بھی شامل ہے؟''

''ہاں......اس نے ان عورتوں کے بارے میں بھی بتایا تھا۔''

''کیا بتایا تھا؟''

''یہی کہ ملائکہ کا شوہر عبدالستار بد مزاج اور غصیلا شخص تھا۔'' معراج نے سادہ سے لہجے میں بتایا۔ ''وہ دوسروں کے ساتھ تو جھگڑا کرتا ہی تھا، اس نے اپنی بیوی کو بھی کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ ان کے فلیٹ کی کھڑکیوں میں سے ان کے دنگا فساد کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ عبدالستار نے ملزم سے بھی اچھا خاصا جھگڑا کیا تھا۔''

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ملزم نے آمنہ کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک منہ پھٹ، بدتمیز اور جاہل ماسی تھی۔ ایک مرتبہ ملزم نے اسے بھی کھری کھری سنا ڈالی تھیں۔''

''اس کا مطلب ہے ملزم نے تمہیں حقائق کا اصل رخ نہیں دکھایا تھا۔'' وکیلِ استغاثہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''خیر چھوڑو......تم ''جمانی اسکوائر'' والے معاملات سے واقف نہیں ہو اس لئے ہم ''ڈائمنڈ ہائٹس'' میں آ جاتے ہیں۔''

وہ ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ڈائمنڈ ہائٹس میں بلاک اے، فلیٹ نمبر دو میں کوئی شہزاد حسین صاحب رہتے ہیں۔ تم انہیں تو اچھی طرح جانتے ہو گے؟''

''جی ہاں......اچھی طرح جانتا ہوں۔'' گواہ معراج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''شہزاد صاحب کی بیوی کا نام مہرین ہے......ان کا ایک پانچ سال کا لڑکا نبیل بھی ہے۔''

''شاباش......میں اسی شہزاد حسین کی بات کر رہا ہوں۔'' وکیلِ استغاثہ نے معتدل انداز میں کہا۔ ''تم ان لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو......کیا کبھی تمہارا اس فیملی سے لڑائی جھگڑا ہوا؟''

''نہیں جناب! ایسی نوبت کبھی نہیں آئی۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ لوگ صلح جو اور امن پسند ہیں؟''

استغاثہ کے گواہ نے مختصر جواب پر اکتفا کیا۔ ''جی ہاں!''

''تمہیں ڈائمنڈ ہائٹس میں چوکیداری کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''چھ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔''

''اور ملزم نے وہاں کتنا عرصہ کام کیا ہے؟''

''لگ بھگ پانچ ماہ۔''

وکیلِ استغاثہ نے بڑی ہوشیاری سے کہا۔ ''بڑے کمال اور حیرت کی بات ہے۔ تم چھ سال سے ڈائمنڈ ہائٹس میں ہو اور تمہارا ایک مرتبہ بھی شہزاد حسین سے جھگڑا نہیں ہوا۔ جبکہ ملزم نے نہایت ہی مختصر عرصے میں شہزاد سے دھواں دھار لڑائی کر لی۔ ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا؟''

''جھگڑا ہوا تھا۔''

''اور شہزاد حسین کا کہنا تھا کہ ملزم کی نظر ٹھیک نہیں۔'' وکیلِ استغاثہ نے اُگلے ہوئے کو نگلنے کی کوشش کرتے ہوئے گواہ سے تصدیق چاہی۔ ''اسے لیڈیز سے بات کرنے کی تمیز نہیں، بڑے بے ہودہ انداز میں یہ خواتین کو گھورتا ہے، وغیرہ وغیرہ......اسے اس بات پر شدید غصہ تھا کہ ملزم نے اس کی بیوی مہرین کے ساتھ کھلم کھلا بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تھی؟''

''جی ہاں......شہزاد صاحب نے اس سلسلے میں بڑا شور مچایا تھا۔''

وکیلِ استغاثہ نے گردن اکڑا کر فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھا، پھر اپنے گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''مسٹر معراج! وقوعہ کے روز یعنی آٹھ فروری کو جب تم ڈیوٹی پر آئے تو ملزم نے تم سے کیا درخواست کیا تھی؟''

گواہ نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا، اسے ایک ایمرجنسی کے سلسلے میں حیدر آباد جانا پڑ گیا ہے۔ وہاں اس کے کسی رشتے دار کا آپریشن ہونے والا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اگلی صبح دیر سے آئے گا۔ لہٰذا جب تک وہ واپس نہیں آ جاتا، اس کی جگہ میں ڈیوٹی کرتا رہوں۔ اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ لیکن پورا دن گزر جانے کے بعد بھی وہ ڈیوٹی پر نہیں پہنچا......''

پھر رات آٹھ بجے پولیس نے اسے اس کے چاچا عبدالرحمٰن کے گھر واقع کھارادر سے گرفتار کر لیا۔'' وکیلِ استغاثہ اپنے گواہ کی بات قطع کرتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''اور گرفتاری سے پہلے ہی اس کا کارنامہ بھی سامنے آ چکا تھا...... ہے نا؟''

''جی ہاں...... بالکل ایسے ہی حالات پیش آئے تھے۔''

وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔ ''جب ملزم حیدر آباد جانے کی بات کر رہا تھا تو اس کے چہرے

پر کس قسم کے تاثرات تھے؟''

''وہ خاصا خوف زدہ اور اُلجھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔'' گواہ نے جواب دیا۔

وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کر دی۔

میں جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد گواہ والے کٹہرے کے قریب چلا گیا اور گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''مسٹر معراج! تم نے وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ تم شہزاد حسین کو اچھی طرح جانتے ہو۔ اگر میں بھی تم سے یہی سوال کروں تو تمہارا جواب کیا ہوگا؟''

''یہی .... کہ میں شہزاد صاحب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ سادگی سے بولا

میں نے پوچھا۔ ''فلیٹ نمبر اے۔ دو میں رہنے والے شہزاد حسین کا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''جی کیا........ کیا ہے؟'' وہ متذبذب انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ذریعہ معاش۔'' میں نے کہا۔ ''یعنی روزگار........ وہ کیا کام کرتے ہیں؟''

''ان کا کوئی کاروبار ہے۔''

''کون سا کاروبار؟........ کس شے کا کاروبار؟''

''یہ تو مجھے پتہ نہیں۔'' وہ معذور سے لہجے میں بولا۔

''لیکن تم تو شہزاد حسین کو بڑی اچھی طرح جاننے کے دعوے دار ہو۔''

وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''بس جی، مجھے اتنا ہی پتہ ہے کہ وہ کوئی کاروبار کرتے ہیں۔ کون سا کاروبار؟ اس کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا۔''

''صرف تم ہی نہیں........ اور بھی بہت سے لوگ اس حوالے سے کچھ نہیں جانتے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ''مسٹر معراج! تم نے وکیلِ استغاثہ کی جرح کے جواب میں ملزم اور شہزاد حسین کے درمیان ہونے والے ایک شدید جھگڑے کی تصدیق کی ہے۔ اس جھگڑے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ملزم اچھے کردار کا مالک نہیں۔ وہ خواتین کو بری نظر سے دیکھتا ہے، ان سے بدتمیزی وغیرہ کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں شہزاد حسین سے اس کا پھڈا ہوا تھا۔ شہزاد حسین کا خیال تھا کہ ملزم اس کی بیوی مہرین کو میلی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کیا ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا؟''

''جی ہاں........ یہی سب کچھ ہوا تھا۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو مہرین سے بدتمیزی کرتے دیکھا تھا؟''

''جی نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں دیکھا۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں نے تو اس واقعے کی تصدیق کی ہے جب شہزاد صاحب چیخ چیخ کر ملزم سے جھگڑا کر رہے تھے کہ اس نے ان کی بیوی کے ساتھ نازیبا حرکت کی ہے۔ شہزاد صاحب نے اس روز بڑا شور مچایا تھا۔''

''ٹھیک ہے........'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے مان لیا، تم ملزم کی اس بدتمیزی کے عینی گواہ نہیں ہو جو اس نے شہزاد حسین کی بیوی مہرین سے کی تھی۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ تم نے کم و بیش پانچ ماہ ملزم کے ساتھ چوکیداری کی ہے۔ ذرا سوچ کر بتاؤ........ کیا ان پانچ ماہ میں کسی اور شوہر نے اپنی بیوی، کسی باپ نے اپنی بیٹی اور کسی بھائی نے اپنی بہن کے حوالے سے ایسی شکایت کی تھی؟ اگر ایسا کوئی واقعہ رونما ہوا ہوتا تو تمہارے علم میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔''

اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''ملزم کے بارے میں ایسی کوئی شکایت سننے میں نہیں آئی۔''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈائمنڈ ہائٹس میں صرف ایک ہی عورت رہائش پذیر ہو؟'' میں نے طنزیہ انداز میں استفسار کیا۔ ''صرف مہرین شہزاد!''

وہ جلدی سے بولا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں جناب! ڈائمنڈ ہائٹس میں سب فیملی والے رہتے ہیں اور ہر گھر میں عورتیں بھی موجود ہیں۔''

''پھر ایسی کیا بات........ کیا وجہ ہے کہ ملزم نے صرف مہرین شہزاد کے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''اگر ملزم نگاہ کا برا، نیت کا کھوٹا اور کردار کا کمزور ہے تو اسے ایک کوشش پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے۔ چور، چوری سے جاتا ہے مگر ہیرا پھیری سے نہیں جاتا........ کے مصداق ملزم کو ''ہاتھ پر ہاتھ'' رکھے نہیں بیٹھا رہنا چاہئے تھا۔ وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح کے آغاز میں ملزم کے کردار کا جو نقشہ کھینچا تھا اس کی رو سے تو اس کے ''کارناموں'' کی ایک طویل فہرست مرتب ہو جانا چاہئے۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟''

''میں نے جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ دیا جناب!'' وہ قدرے بیزاری سے بولا۔ ''اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''ٹھیک ہے، تمہیں معلوم نہیں لیکن میں اس حوالے سے بہت کچھ جانتا ہوں۔'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں اس جھگڑے کے اصل سبب سے واقف ہوں جو ملزم اور شہزاد حسین کے درمیان ہوا تھا۔''

''آبجیکشن یور آنر!'' وکیلِ استغاثہ جو کافی دیر سے صبر کئے بیٹھا تھا، اچانک چیخ کر بولا۔ ''جنابِ عالی! معزز عدالت میں اس وقت یاسمین مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست شہزاد حسین کے قصے اور کہانیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں........ان کی ایسی حرکتوں سے سوائے عدالت کے قیمتی وقت کی بربادی کے اور کچھ نہیں ہو رہا۔ میری پُرزور استدعا ہے کہ وکیلِ صفائی کو ایسی کوششوں سے فوراً روکا جائے۔''

جج نے وکیلِ استغاثہ کی بات پوری توجہ سے سنی اور اس کے خاموش ہونے پر مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا شہزاد حسین کا زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق نکلتا ہے؟''

''تعلق نہیں......تعلقات جنابِ عالی!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ اپنی بات کی وضاحت کریں۔'' جج نے گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بتانے لگا۔ ''جنابِ عالی! وکیلِ استغاثہ نے میرے مؤکل کے کردار کو داغ دار ثابت کرنے کے لئے آمنہ اور ملائکہ کے من گھڑت قصے سنائے تھے۔ ان دونوں کرداروں اور جمائی اسکوائر کا بھی زیرِ سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وکیلِ استغاثہ نے ایک خاص مقصد کے تحت ایک گراؤنڈ بنایا تھا اور اسی گراؤنڈ پر مہرین اور شہزاد والے واقعے کی عمارت کھڑی کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ ملزم اور شہزاد کے مابین ہونے والے جھگڑے کو ملزم کی بدنظری کے کھاتے میں ڈالا گیا ہے۔ لہٰذا وکیلِ صفائی ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں اپنے مؤکل کی پوزیشن کو صاف کروں۔ میں شہزاد حسین اور ملزم کے بیچ کھڑے ہوئے والے تنازع کی اصل وجوہات سے واقف ہوں اور ان وجوہات کی تصدیق کے لئے ''ڈائمنڈ ہائٹس'' کے یونین انچارج مسٹر رمضان علی کو بطورِ گواہ عدالت میں پیش بھی کر سکتا ہوں لہٰذا شہزاد اور مہرین پر بات کرنا غیر متعلق نہیں ہو سکتا جبکہ.....''

میں نے سانس درست کرنے کے لئے لمحاتی توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جبکہ وکیلِ استغاثہ ملزم پر جرح کے دوران خود اس بات کا اقرار کر چکے ہیں کہ مہرین شہزاد اس کیس میں آئی وٹنس (عینی شاہد) کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ اسے استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش بھی کریں گے۔ استغاثہ کی جانب سے گواہوں کی جو فہرست دائر کی گئی ہے اس میں مہرین شہزاد کا نام شامل ہے۔ پھر غیر متعلق کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟''

میری وضاحت کے دوران جج بڑے معنی خیز انداز میں وکیلِ استغاثہ کو دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلاتا رہا تھا۔ میرے خاموش ہونے پر اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ اور ''ڈائمنڈ ہائٹس'' کے شبینہ چوکیدار معراج کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے میں نے پوچھا۔

''ڈائمنڈ ہائٹس میں مینٹیننس چارجز کیا ہیں؟''

''ایک سو روپے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ایک سو روپے روزانہ، ماہانہ یا سالانہ؟''

''مہینے کے ایک سو روپے!''

''یونین والے ان چھ ہزار سے کیا کیا کام کرتے ہیں؟''

''چھ ہزار روپے؟'' اس نے اُلجھن زدہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ''ڈائمنڈ ہائٹس میں کل ساٹھ فلیٹس ہیں۔ اگر ایک فلیٹ کی مینٹیننس ایک سو روپے ہو تو کلیکشن چھ ہزار روپے بنتی ہے۔''

''جناب! اُنگلیوں پر حساب جوڑنے اور کام کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''ہماری بلڈنگ کی حقیقت اس حساب سے بہت مختلف ہے۔''

''اور وہ حقیقت کیا ہے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے استفسار کیا۔

اس نے بتایا۔ ''کہنے کو ڈائمنڈ ہائٹس میں ساٹھ فلیٹس ہیں اور ان سے پورے چھ ہزار روپے جمع ہونے چاہئیں۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار ہزار روپے جمع ہوتے ہیں۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے صدر صاحب بڑے نرم دل اور خدا ترس انسان ہیں۔'' معراج نے بتایا۔ ''بلڈنگ میں پانچ گھر ایسے ہیں جن میں یا تو بیوہ عورتیں رہتی ہیں اور یا پھر ایسے لوگ جن کا کوئی مستقل اور مستحکم ذریعہ آمدنی نہیں۔ ان پانچ گھروں کے مینٹیننس چارجز معاف ہیں۔ چنانچہ چھ ہزار کی رقم ایک جھٹکے میں گھٹ کر ساڑھے پانچ ہزار رہ گئی۔ دوسرا جھٹکا مکینوں کی ہٹ دھرمی اور بدمعاشی سے پہنچتا ہے۔ لگ بھگ دس گھر ایسے ہیں جو مینٹیننس نہیں دیتے۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے ٹالتے رہتے ہیں۔ گھر میں ہر شے موجود ہے، اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں، بچے باقاعدہ سکول جا رہے ہیں، شادی بیاہ، مرنا جینا بھی سب معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ ان دس میں سے دو تین کی تو اپنی گاڑیاں بھی ہیں۔ لیکن مہینے کے شروع میں جب مینٹیننس دینے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنی مجبوری کے قصے سنانے بیٹھ جاتے ہیں۔ کئی بار میٹنگ ہوئی۔ تمام مکینوں کو میٹنگ میں شرکت کی دعوت دی گئی تا کہ اس مسئلے کو حل کیا جائے

لیکن وہی لوگ میٹنگ میں حاضر نہیں ہوئے جن کی وجہ سے مسائل کھڑے تھے۔ بعض جوشیلے رہائشیوں نے صدر صاحب کو مشورہ دیا کہ جن لوگوں کی طرف مینٹیننس کی بھاری رقم واجب الادا ہے ان کی بجلی کی لائن کاٹ دی جائے۔ لیکن صدر صاحب نے اپنی نرمی کے باعث یہ مشورہ تسلیم نہیں کیا۔ پھر گیس لائن کاٹنے کی تجویز آئی تو انہوں نے اسے بھی رد کر دیا۔ کہا کہ یہ سہولتیں باقاعدہ محکموں کی طرف سے فراہم کی گئی ہیں لہٰذا ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اپنے واجبات وصول کرنے کے لئے مکینوں کی لائنیں کاٹ دیں۔ یہ تو کھلی قانونی خلاف ورزی ہو گی۔ یونین کے صدر رمضان علی صاحب بہت اصول پرست اور نیک انسان ہیں۔ بعض مکینوں پر ہزاروں روپے مینٹیننس کے چڑھے ہوئے ہیں لیکن انہوں نے کبھی کسی سے غصے یا سخت لہجے میں بات نہیں کی۔ مینٹیننس کے سلسلے میں جمع ہونے والی رقم سے بجلی کا بل ادا کیا جاتا ہے۔ (وہ بلی جو پانی سپلائی کرنے والی موٹروں کو چلانے میں استعمال ہوتی ہے اور بلڈنگ کو روشن رکھنے کے لئے بلب اور ٹیوب لائٹس وغیرہ ہیں) دونوں چوکیداروں کو تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ سوپیر کی تنخواہ ہے۔ علاوہ ازیں چھوٹی موٹی ٹوٹ پھوٹ اور موٹروں کی دیکھ بھال، کسی خرابی کی صورت میں اس کی مرمت سب اسی میں شامل ہے۔ اگر پوری مینٹیننس جمع ہوتی رہے تو بلڈنگ کا نظام بخوبی چلتا رہتا ہے لیکن موجودہ صورتِ حال نے کافی مسائل کھڑے کر دیئے تھے۔ پھر ملزم کی آمد کے بعد کامیابی کی ایک کرن، ایک اُمید نظر آئی۔"

وہ سانس ہموار کرنے کے لئے چند لمحے متوقف ہوا، پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ "ملزم داؤد کی آمد کے بعد جو پہلی میٹنگ ہوئی اس میں ملزم نے ایک مشورہ دیا جسے فوراً قبول کر لیا گیا۔ مشورہ یہ تھا کہ جن لوگوں کی طرف پانچ سو روپے سے زیادہ رقم واجب الادا ہے اور وہ ادائیگی کی کوئی نیت بھی نہیں رکھتے، ان کی پانی کی لائن کاٹ دی جائے۔ فلیٹس میں پانی کی سپلائی چونکہ یونین کے زیرِ انتظام تھی لہٰذا واٹر بورڈ کے محکمے کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ بلڈنگ کا اندرونی معاملہ تھا۔ یہ تجویز قابلِ عمل اور معقول تھی۔ لہٰذا اس پر اتفاقِ رائے ہو گیا۔ داؤد چونکہ ایک سخت گیر چوکیدار تھا، لہٰذا لائن کاٹنے کی ذمہ داری بھی اسی کو سونپی گئی۔ تاہم صدر صاحب نے کہا کہ اس اسکیم پر عمل درآمد اگلے ماہ سے کیا جائے۔ اس ماہ ڈیفالٹر افراد کو وارننگ دی جائے کہ اگر انہوں نے یونین سے تعاون نہیں کیا تو ان کی پانی کی لائن کاٹ دی جائے گی۔ چنانچہ آٹھ دس فلیٹس والوں کو نوٹس بھجوا دیا گیا۔ لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ اس نوٹس کو یونین کی طرف سے ملنے والا ایک کاغذ کا غیر اہم، فضول سا ٹکڑا سمجھے۔ برسوں کی بگڑی ہوئی عادتیں ایک ماہ میں ٹھیک نہیں ہو سکتی تھیں۔ لہٰذا ملزم داؤد

خان نے اللہ کا نام لے کر ایک فلیٹ کی واٹر سپلائی کو منقطع کر دیا۔"
میں نے اپنی محنت اور شمروز خان کے تعاون سے یہ ساری معلومات جمع کر رکھی تھیں لیکن میں جج کے روبرو استغاثہ کے گواہ معراج کی زبانی یہ سب کچھ اُگلوانا چاہتا تھا۔ اور اس کوشش میں مجھے یقینی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ اسی پوائنٹ پر لانے کے لئے میں معراج کی طویل "تقریر" سن رہا تھا۔ وہ جیسے ہی خاموش ہوا، میں نے سنسنی آمیز انداز میں استفسار کیا۔
"تم کس فلیٹ کی بات کر رہے ہو؟"
"فلیٹ نمبر اے۔ دو!"
"ارے......" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "اس فلیٹ میں تو شہزاد حسین اور اس کی فیملی رہتی ہے۔"
"جی ہاں......میں اسی فلیٹ کی بات کر رہا ہوں۔"
"کیا شہزاد حسین کا شمار بھی ڈیفالٹر افراد میں ہوتا تھا؟"
"جی ہاں......ان کی طرف مینٹیننس کے پورے دو ہزار چھ سو روپے باقی تھے۔"
"مگر شہزاد صاحب تو اپنا کاروبار کرتے ہیں۔" میری حیرت دوچند ہو گئی۔ "ان کے پاس گاڑی ہے۔ وہ خوش لباس اور بڑی ٹپ ٹاپ والے ہیں۔ پھر بھی......؟"
میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ معراج نے سادگی سے کہا۔ "جی......پھر بھی۔"
میں نے پوچھا۔ "پانی کی لائن کاٹنے والے اس واقعے کے کتنے دن بعد ملزم اور شہزاد حسین کے بیچ جھگڑا ہوا تھا؟"
"صبح میں لائن کاٹی، شام میں جھگڑا ہوا۔"
"اوہ......!" اُس نے ایک گہری سانس خارج کی، پھر خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔
"تو اس جھگڑے کا اصل سبب سامنے آ ہی گیا۔" پھر میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"جنابِ عالی! مجھے گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔"
رات والے چوکیدار معراج کے بعد خاکروب جاوید کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا۔ سویپر جاوید ہی وہ شخص تھا جس نے مقتولہ کی لاش "دریافت" کی تھی۔ جاوید درمیانے قد کا مالک ایک گہرا سانولا شخص تھا۔ عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہو گی۔ وہ حلفیہ بیان ریکارڈ کرانے کے بعد فارغ ہوا تو وکیلِ استغاثہ اس سے سوال و جواب میں مصروف ہو گیا۔
ایک بات بڑی ہی عجیب اور مضحکہ خیز تھی کہ وکیلِ استغاثہ ہر لمحے اس کوشش میں دکھائی دیتا تھا کہ وہ ملزم کو بدکردار اور بدتمیز ثابت کر سکے۔ جاوید سے بھی اس نے گھما پھرا کر ایسے

سوالات ہی کئے جو ملزم کی ریپوٹیشن کو مشکوک بناتے تھے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ یہ اس کی مجبوری بھی تھی۔ استغاثہ میں ملزم کے لئے بدتمیز، بدنظر، ہوس پرست، بدچلن........ وغیرہ جیسے خطابات کا استعمال کیا گیا تھا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ یاسمین کے قتل میں سراسر اُسی کا ہاتھ ہے۔ اس نے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے بہلا پھسلا کر مقتولہ کو فلیٹ کے اندر بلایا۔ وہ اپنے مقصد میں تو کامیاب نہ ہو سکا مگر اس کی چھینا جھپٹی کے دوران بدنصیب مقتولہ اپنی جان ہار بیٹھی مگر میں نے اب تک کی جرح میں کم از کم یہ بات تو ثابت کر ہی دی تھی کہ میرے مؤکل کا کردار ویسا نہیں جیسا بیان کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے مؤکل کی بے گناہی کو بھی بڑی حد تک جج کے نوٹس میں لا چکا تھا۔ لہٰذا اس کیس کے حوالے سے میں خاصا مطمئن تھا۔ میں نے آئندہ کے لئے اپنے ذہن میں ایسا نقشہ تیار کر لیا تھا کہ بس ایک دو پیشیوں کے بعد ''جیت'' سامنے کھڑی ہوتی۔

وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح ختم کی تو جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میں گواہ والے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔ مجھے جاوید سے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا۔ لہٰذا چند سرسری سے سوالات کر کے اسے نمٹا دیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''مسٹر جاوید! تمہاری رہائش کہاں ہے؟''

''سرجانی ٹاؤن میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''شادی ہو گئی ہے؟''

''جی ہاں........ تین بچے بھی ہیں میرے۔''

''کیا تم صرف ڈائمنڈ ہائٹس ہی میں کام کرتے ہو یا کسی اور بلڈنگ میں بھی جاتے ہو؟''

''صرف ڈائمنڈ ہائٹس۔'' اس نے بتایا۔ ''دراصل میں کے ایم سی کا باقاعدہ ملازم ہوں۔ صبح دفتر جاتا ہوں، حاضری لگاتا ہوں، تھوڑی دیر وہاں بیٹھنے کے بعد ادھر آ جاتا ہوں۔''

''واہ بھئی واہ!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تمہارے تو بہت مزے ہیں۔''

''مزے کہاں ہیں صاحب!'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

میں نے خاکروب جاوید سے مزید دو تین سوالات کئے، پھر جرح موقوف کر دی۔

اس وقت عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی تھے۔ اس قلیل مدت میں کسی اور گواہ کو پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا جج نے عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ اِز ایڈجارنڈ!''

اگلی پیشی دس روز بعد کی تھی۔

***

میں اس کیس کو بڑے صبر وسکون سے دھیرے دھیرے لے کر چل رہا تھا۔ مجھے کسی بات کی جلدی یا تشویش نہیں تھی۔ کیونکہ میں نے اپنا ہوم ورک مکمل کر رکھا تھا۔ میرے چہرے پر وہی اطمینان دیکھا جا سکتا تھا جو اس کیپٹن کے چہرے پر نظر آتا ہے جو اپنے ٹارگٹ کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہا ہو۔ مخالف ٹیم کے دیئے ہوئے اسکور کے ہدف کو اس نے اپنے ذہن میں رکھا ہوا ہو اور اس کی ٹیم مطلوبہ رنز کے اوسط سے کچھ بڑھ کر بنا رہی ہو اور اس کے ساتھ ساتھ وکٹوں کو بھی سنبھال کر رکھا ہوا ہو۔ میری کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی تھی۔

اب تک جن گواہوں کو عدالت میں پیش کیا جا چکا تھا، ان پر میری جرح کے نتیجے میں بڑے اہم پوائنٹس اُبھر کر سامنے آئے تھے جو منصف کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔ صورتِ حال مجموعی طور پر میرے مؤکل کے حق میں رفتہ رفتہ ہموار ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے اُمید تھی، ایک دو پیشیوں میں، میں اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم داؤد خان کو مکمل طور پر بے گناہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اس پیشی پر سب سے پہلے استغاثہ کی طرف سے دو ایسے گواہ عدالت میں پیش کئے گئے جن کے بیانات اور گواہی میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لہٰذا میں ان کے ذکر کو گول کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔ مذکورہ دونوں گواہوں کا تعلق اسی علاقے سے تھا جہاں ''ڈائمنڈ ہائٹس'' اپارٹمنٹ بلڈنگ واقع تھی۔

ان کے فارغ ہونے کے بعد استغاثہ نے شہزاد حسین کی بیوی مہرین کو گواہی کے لئے کٹہرے میں پہنچا دیا۔ مہرین ایک خوب صورت اور پُرکشش عورت تھی۔ اس کے نقوش میں ایک خاص قسم کا تیکھا پن پایا جاتا تھا جو اس کے سراپا کو جاذبِ نظر بناتا تھا۔ مہرین حلفیہ بیان دے کر جوں ہی فارغ ہوئی تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لئے اس کے پاس پہنچ گیا۔ مہرین پر وکیلِ استغاثہ کی جرح صرف ایک سوال پر مشتمل تھی جو اس کیس کی مختصر ترین جرح بھی تھی۔

وکیلِ استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا، پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اپنی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔

''کیا یہ وہی شخص ہے جسے آپ نے وقوعہ کے روز فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین میں مقتولہ کے ساتھ داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟''

وکیلِ استغاثہ کے اس سوال میں اگرچہ الفاظ کی ترتیب بڑی بے ترتیب تھی تاہم اُس کے مفہوم کو سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آ سکتی تھی لہٰذا گواہ مہرین نے حتمی انداز میں

جواب دیا۔

''جی ہاں، میں نے مقتولہ سیلز گرل یاسمین کو اسی شخص کے ساتھ ڈاکٹر مہندر کمار کے فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔''

واضح رہے کہ ڈائمنڈ ہائٹس میں ملے جلے لوگ رہتے تھے۔ تقریباً ہر کمیونٹی سے تعلق رکھنے والے وہاں آباد تھے۔ وکیلِ استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کی تو جج سے اجازت حاصل کرنے کے بعد میں گواہ مہرین کے قریب پہنچ گیا۔ میں نے اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں جرح کا آغاز کرتے ہوئے استغاثہ کی گواہ سے پوچھا۔

''مہرین صاحبہ! کیا یہ آپ کا پہلا تجربہ ہے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ پلٹ کر مجھ سے مستفسر ہوئی۔ ''میں سمجھی نہیں؟''

میرا سوال اتنا مبہم تھا کہ وہ سمجھ بھی نہیں سکتی تھی۔ تاہم میں نے فوراً ہی وضاحت کر دی۔

''میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس سے پہلے بھی کبھی آپ کو کسی کیس کے سلسلے میں گواہی کے لئے عدالت میں حاضر ہونا پڑا ہے یا یہ آپ کی زندگی کا پہلا تجربہ ہے؟''

''اوہ!'' اس نے ایک بڑی ادا سے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔ ''میں زندگی میں پہلی بار کسی عدالت میں آئی ہوں .... لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''آپ کے اعتماد کو دیکھ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ کام آپ کے لئے کوئی نیا نہیں ہے۔'' میں نے تعریفی انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ورنہ عام طور پر پہلی مرتبہ کورٹ میں قدم رکھنے والے لوگ بہت ڈرے سہمے دکھائی دیتے ہیں۔''

وہ فلسفیانہ انداز میں بولی۔ ''انسان اندر سے کھرا اور سچا ہو تو وہ کہیں بھی جانے اور کہیں بھی کھڑا ہونے سے نہیں گھبراتا۔ یہ کٹہرا تو بڑی معمولی سی جگہ ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر اس کے بعد اپنا کام شروع کر دیا۔

''مہرین صاحبہ! آپ کو ڈائمنڈ ہائٹس میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کم و بیش پانچ سال!'' اس نے جواب دیا۔

''تو گویا یہ ''ماہ و سال'' کا پیچ پڑ گیا ہے۔'' میں نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔

''ماہ و سال؟ .... آپ کس پیچ کی بات کر رہے ہیں وکیل صاحب؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''میں اس اتفاق پر غور کر رہا تھا کہ آپ کو ڈائمنڈ ہائٹس میں رہائش پذیر ہوئے لگ بھگ پانچ سال ہو

گئے ہیں جبکہ ملزم اسی بلڈنگ میں گزشتہ پانچ ماہ سے (داؤد خان کی گرفتاری تک) ملازمت کر رہا ہے۔ پانچ ماہ...... پانچ سال! میں اسی پیچ کی بات کر رہا تھا۔"

"ماہ و سال کے اس پیچ سے کیا ہوتا ہے؟" اس نے تیز لہجے میں پوچھ لیا۔

میں نے بتایا۔ "جو ہو رہا ہے، وہی ہوتا ہے...... یا جو ہو چکا ہے، وہی ہوتا ہے۔"

وکیلِ استغاثہ فوراً بیچ میں کود پڑا۔ اُس نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔

"آبجیکشن یور آنر! وکیلِ صفائی استغاثہ کی معزز گواہ کو خوامخواہ اُلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ورنہ ان بے سروپا باتوں کا زیرِ سماعت کیس سے کیا تعلق ہے۔ معزز عدالت سے میں پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ فاضل وکیل کو اس قسم کی حرکات سے باز رکھا جائے...... دیٹس آل یور آنر!"

میں جو کچھ بھی کر رہا تھا اس کا مقصد یہی تھا کہ وکیلِ استغاثہ کے پیٹ میں مروڑ اٹھ کھڑا ہو۔ اور اس تکلیف کے آثار دیکھنے اور سننے کو مل رہے تھے۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"بیگ صاحب! پلیز، کم ٹو دی پوائنٹ!"

"اوکے یور آنر!" میں نے اپنی گردن کو تعظیمی انداز میں جھکاتے ہوئے کہا پھر قدرے جارحانہ انداز میں استغاثہ کی گواہ مہرین شہزاد کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"مہرین صاحبہ! آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیلِ استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے مقتولہ یاسمین کو ملزم کے ساتھ ڈاکٹر مہندر کمار والے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا؟"

"ہاں...... میں نے ایسا ہی کہا ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں بولی۔ "اور یہ بات بالکل سچ ہے۔"

"کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ جب آپ نے مقتولہ کو مذکورہ فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا، اس وقت ملزم کہاں تھا اور کیا کر رہا تھا؟"

"وہ فلیٹ کے دروازے میں کھڑا تھا۔" مہرین نے کامل ڈھٹائی کا بڑا اکمل مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ملزم نے اشارے سے اسے اندر بلایا ہو...... ہو سکتا ہے اس نے مقتولہ کو اندر بلانے کے لئے یہ بہانہ کیا ہو کہ وہ اس کی بیوی کو اپنی مصنوعات دکھا دے۔" وہ ایک لمحے کو متوقف ہوئی پھر تمسخرانہ انداز میں بولی۔

''اس بے چاری کو کیا معلوم کہ اس شخص کی کوئی بیوی ہے اور نہ ہی وہ فلیٹ۔ یہ تو جھانسے سے اسے اندر بلا رہا تھا اور وہ بدنصیب اس کے جھانسے میں آ کر اپنی جان گنوا بیٹھی۔''

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''مہرین صاحبہ! آپ اتنی تفصیل سے منظر کشی کر رہی ہیں کہ لگتا ہے آپ مقتولہ اور ملزم کے قریب ہی کھڑی تھیں اور آپ نے ان کے درمیان ہونے والی مکالمے بازی کو بھی سنا ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''جبکہ محسوس ایسا ہی ہو رہا ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

وہ اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس میں کسی اور کا نہیں بلکہ آپ کے محسوسات کا قصور ہے۔''

''او کے........ میں آج ہی کسی ماہر محسوسات سے اپنا چیک اپ کراتا ہوں۔'' میں نے مصنوعی سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کی نظر میں کوئی ایکسپرٹ ہو تو بتائیں۔''

''نہیں........ میں ایسے کسی ایکسپرٹ کو نہیں جانتی۔'' وہ قدرے برہمی سے بولی۔

''چلیں کوئی بات نہیں۔'' میں نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ معزز عدالت کے روبرو یقیناً یہ تو بتائیں گی ہی کہ آپ نے کہاں کھڑے ہو کر مقتولہ کو ڈاکٹر مہندر کمار کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے اور ملزم کو اسے بہلاتے پھسلاتے دیکھا تھا؟''

''میں اس وقت زینے میں کھڑی تھی۔''

''یعنی سیکنڈ فلور کے زینے پر؟''

''ظاہر ہے۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔ ''فرسٹ یا تھرڈ فلور کے زینے پر کھڑے ہو کر تو سیکنڈ فلور کے کسی فلیٹ کو دیکھا نہیں جا سکتا۔''

''یہ معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ مہرین صاحبہ!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ آپ اس وقت سیکنڈ فلور کے زینے میں کھڑی کیا کر رہی تھیں؟ آپ کا فلیٹ تو گراؤنڈ فلور پر ہے........ فلیٹ نمبر دو!''

''اگر میں گراؤنڈ فلور پر رہتی ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ بلڈنگ کے دوسرے فلورز یا فلیٹس میں آنے جانے کی پابندی ہے۔''

''میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کی۔'' میں نے بھویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

وہ میری کہی کو سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''میں اس وقت تھرڈ فلور والے فلیٹ نمبر تین سو چار کی طرف جا رہی تھی۔ راستے میں سیکنڈ فلور پڑتا ہے۔ میں اس کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی

کہ وہ منظر نظر آ گیا جو پہلے میں نے بیان کیا ہے۔ بس، اتنی سی بات ہے۔"

"آپ جسے "اتنی سی بات" کہہ رہی ہیں وہ میرے نزدیک ایک بہت بڑا ایشو ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "اس لئے میں اسے چیونٹی سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ آپ یہ بتائیں آپ نے کتنے بجے مقتولہ کو ڈاکٹر مہندر کمار والے فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟"

"میں نے گھڑی میں باقاعدہ وقت تو نہیں دیکھا" وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ "لیکن میرے خیال میں چار کے اریب قریب کا وقت ہوگا۔"

میں نے اپنے پھیلائے ہوئے جال کو دھیرے دھیرے سمیٹنا شروع کیا۔ استغاثہ کی گواہ سے پوچھا۔ "مہرین صاحبہ! جب آپ نے لگ بھگ چار بجے سہ پہر وہ منظر دیکھا تو کیا آپ کو معلوم تھا کہ ڈاکٹر مہندر کمار کے فلیٹ میں داخل ہونے والی لڑکی کوئی سیلز گرل ہے یا آپ کو یہ محسوس ہوا کہ بس وہ کوئی لڑکی ہے؟"

یہ سوال اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن مہرین نے جواب دینے میں ذرا دیر نہیں لگائی اور جلدی سے بولی۔

"میں نے مقتولہ کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہمارے دروازے پر بھی آئی تھی اور میں نے اس سے واشنگ پاؤڈر کا ایک بڑا پیکٹ لیا تھا۔ پھر اس کے کندھے پر لٹکا ہوا مخصوص بیگ بھی اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ ملزم نے اسی سیلز گرل کو فلیٹ نمبر دو سو تین کے اندر بلایا تھا۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "آپ تھرڈ فلور پر یقیناً انیتا سے ملنے گئی ہوں گی۔ میری معلومات کے مطابق فلیٹ نمبر اے۔ تین سو چار میں انیتا اور رجب اپنی اکلوتی بیٹی اردا کے ساتھ رہتے ہیں۔ رجب کسی معروف ہسپتال میں لیبارٹری انچارج ہے۔"

اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ "لگتا ہے آپ نے ڈائمنڈ ہائٹس پر پی ایچ ڈی کر رکھا ہے۔"

"میں نے کس کس سبجیکٹ پر پی ایچ ڈی کر رکھا ہے، آپ اس چکر میں نہ پڑیں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ یہ بتائیں، فلیٹ نمبر تین سو چار میں آپ نے کتنا وقت گزارا تھا؟"

"میں بس گئی تھی اور واپس آ گئی تھی۔" مہرین نے تھوک نگلتے ہوئے بتایا۔

"کیا آپ نے انیتا کو بھی فلیٹ نمبر دو سو تین والے "منظر" کے بارے میں بتایا تھا؟"

وہ متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔
میں نے کہا۔ ''مہرین صاحبہ! ذرا سوچ سمجھ کر میرے سوال کا جواب دیجئے گا۔ آپ کے جواب کی سچائی کو جانچنے کے لئے انیتا کو یہاں بلایا جا سکتا ہے۔'' پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے اس پر رعب گانٹھنے کی خاطر تھوڑی سی مصلحت آمیز دروغ گوئی بھی کر ڈالی۔
''میں دو روز قبل انیتا سے ایک تفصیلی میٹنگ کر چکا ہوں جس میں اس کیس کے سارے پہلو زیرِ بحث آئے تھے لہٰذا کوئی بھی جواب دینے سے پہلے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''
وہ میری دھونس میں آ گئی۔ اب اس کے پاس سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا، جلدی سے بولی۔
''میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس روز انیتا سے سیلز گرل کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔'' وہ لحہ بھر کو متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔
''یہ ایک اتفاق ہے کہ انیتا کی امی اور میری امی گارڈن کے علاقے میں رہتی ہیں۔ بس، ایسٹ اور ویسٹ کا فرق ہے۔ میں اُس روز امی کے یہاں جا رہی تھی۔ انیتا نے چند روز قبل مجھے بتایا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی بہنوں کے لئے کچھ کپڑے بھیجنا چاہتی ہے۔ اس نے کہا تھا جب میں گارڈن جاؤں تو اسے ضرور بتاؤں........ میں وہی کپڑے لینے انیتا کے پاس گئی تھی۔ اس نے کپڑے پہلے سے نکال کر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے کپڑے اٹھائے اور واپس آ گئی۔ کیونکہ میرے شوہر ہمیں رکشہ میں بٹھانے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اگر میں انیتا کے پاس زیادہ دیر لگا دیتی تو وہ شور مچانے لگتے۔ مجھے انیتا کو کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔''
میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارا اور با آواز بلند کہا۔ ''امپاسبل!........ امپاسبل۔''
جج نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا اور استفسار کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟........ آپ کے نزدیک کون سی بات ناممکن ہے؟''
میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
''جنابِ عالی! مرد کی بہ نسبت عورت کے اندر تجسس اور کرید کا مادہ کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ مہرین صاحبہ نے وقوعہ کے روز جو منظر فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین کے دروازے پر دیکھا، اسے یاد نہ رکھنا یا ذہن سے نکل جانا، ناممکنات میں سے ہے۔ استغاثہ کی گواہ یہ کہہ کر عورت کی مخصوص فطرت اور نفسیات کی نفی کر رہی ہیں کہ انہیں انیتا سے اس منظر کے بارے میں بات کرنا یاد نہیں رہا۔ جبکہ اصولی طور پر ہونا یہ چاہئے تھا کہ یہ انیتا سے کپڑے لینا بھول جاتیں، پہلے سنسنی خیز واقعے کے بارے میں بتاتیں جو فلیٹ نمبر دو سو تین کے دروازے پر دیکھ کر وہ

اوپر گئی تھیں۔"

وکیلِ استغاثہ فوراً اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ اُس نے معاندانہ نظر سے مجھے گھورا پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے معتدل لہجے میں بولا۔

"یور آنر! میں فطرت اور نفسیات کے اصولوں کی نفی نہیں کرتا۔ لیکن بعض مخصوص حالات میں یہ اصول ثابت ہوتے نظر نہیں آتے۔ لہٰذا انہیں فارمولا بنا کر پیش کرنا ٹھیک نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ بھی بڑی عجیب بات کر رہے ہیں میرے فاضل دوست! ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ انسانی نفسیات اور فطرت کے اصولوں کی نفی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ نفسیات اور فطرت کے اصولوں کو فارمولا نہیں بنانا چاہئے۔ آپ کی کون سی بات کو درست مانا جائے؟"

"میں نے بعض مخصوص حالات کا ذکر بھی کیا ہے۔" وکیلِ استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شاید آپ نے میری بات توجہ سے نہیں سنی۔"

اگر میں اس موضوع پر بحث و مباحثہ کا در کھول دیتا تو بات کہیں کی کہیں پہنچ جاتی اور اس میں سوائے وقت گنوانے کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اور میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا مصلحت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے......ہم بعض مخصوص حالات کو گریس دے سکتے ہیں۔"

وکیلِ استغاثہ کے چہرے پر طمانیت اور جوش جھلکنے لگا۔ وہ یہی سمجھ کر خوش ہو گیا کہ میں اس کے دباؤ میں آ گیا ہوں۔ میں نے اُسے اسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور استغاثہ کی گواہ مہرین شہزاد کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"مہرین صاحبہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "ذرا سوچ کر بتائیں، وقوعہ کے روز مقتولہ نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟ آپ کا تو دو مرتبہ اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ایک بار جب آپ نے اس سے واشنگ پاؤڈر کا پیکٹ خریدا تھا اور دوسری دفعہ جب وہ ڈاکٹر مہندر کمار کے فلیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس لئے آپ کو اس کے لباس کے بارے میں اچھی طرح یاد ہوگا۔"

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے بڑے اعتماد سے بتایا۔ "مقتولہ نے نیوی بلیو شلوار پر زرد پھول دار شرٹ پہن رکھی تھی اور اوپر گرین سویٹر بھی پہنا ہوا تھا۔ اس نے جو بیگ اُٹھایا ہوا تھا اس کا رنگ خاکی تھا۔ بس یا اور کچھ؟"

"بس یا اور کچھ کے بارے میں انکوائری آفیسر سے پوچھتے ہیں۔" میں نے طنزیہ انداز

میں کہا پھر سوالیہ نظر سے سب انسپکٹر اللہ داد کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔
"آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں آئی او صاحب؟"
جب میں آئی او پر جرح کر رہا تھا تو میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے مقتولہ کے لباس کی تفصیل بیان کی تھی جس کے مطابق جب وہ وقوعہ پر پہنچا تو مقتولہ کے بدن پر کالی شلوار، لائٹ بلیو پھول دار شرٹ اور میرون سویٹر موجود تھا۔ بیگ کا رنگ اس نے بھی خاکی ہی بتایا تھا۔ استغاثہ کی رپورٹ میں بھی مقتولہ کے لباس کی یہی تفصیل درج تھی اور لکھے ہوئے کو مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر ہم مہرین کو تھوڑی سی گریس دے دیں تو یہ کہا جا سکتا تھا اس نے کالی شلوار کو نیوی بلیو سمجھ لیا ہو گا۔ لیکن دیگر لباس کے بارے میں اس کا بیان استغاثہ کی رپورٹ سے لگا نہیں کھاتا تھا جبکہ وہ استغاثہ ہی کی گواہ تھی۔
استغاثہ کے لئے یہ ایک لمحہ فکریہ تھا!
تفتیشی افسر نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "گواہ مقتولہ کے لباس کے بارے میں گڑبڑ کر رہی ہے۔ اس کا بیان درست نہیں۔"
تفتیشی افسر اس موقع پر استغاثہ کے گواہ کی حمایت کر کے خود کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر وہ مہرین کی سپورٹ کرتا تو اس کی اپنی تیار کردہ رپورٹ ریت کا محل ثابت ہوتی اور اس کے ساتھ ہی استغاثہ کی عمارت پلک جھپکتے میں زمین بوس ہو جاتی۔ لہٰذا اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو صاف بچا لیا۔ مہرین کو بے یار و مددگار چھوڑ کر وہ تھوڑا نروس بھی دکھائی دیتا تھا۔
میں نے انکوائری آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "آئی او صاحب! استغاثہ کی گواہ کا دعویٰ ہے کہ اس نے دو مرتبہ بڑی اچھی طرح مقتولہ کو وقوعہ کے روز دیکھا تھا اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسے مقتولہ کے لباس کے بارے میں کوئی مغالطہ ہوا ہو گا لیکن آپ کا بیان، گواہ کے بیان سے بہت مختلف ہے۔ اب آپ دونوں آپس میں فیصلہ کر لیں کہ کون سچا ہے کون غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ دونوں بیک وقت صحیح کہہ رہے ہوں؟"
وہ ہڑبڑا کر جلدی سے بولا۔ میں نے وقوعہ پر جو رپورٹ تیار کی تھی اس میں کوئی غلطی نہیں۔ میں یہی کہہ سکتا ہوں، استغاثہ کی گواہ کی یادداشت کچھ گڑبڑ کر رہی ہے۔"
"ہاں، یہی ہو سکتا ہے آئی او صاحب!" میں نے خود کلامی والے انداز میں کہا۔ "ان کا تو بہت کچھ گڑبڑ ہو رہا ہے، صرف ایک یادداشت پر ہی کیا موقوف!" اس کے بعد میں دوبارہ

مہرین شہزاد کی طرف متوجہ ہو گیا اور تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے۔

''مہرین صاحبہ! آپ کے بیان کے مطابق وقوعہ کے روز سہ پہر چار بجے جب آپ فلیٹ نمبر تین سو چار میں انیتا صاحبہ سے ملنے جا رہی تھیں تو دوسرے فلور کی سیڑھیوں میں سے آپ نے مقتولہ کو فلیٹ نمبر دو سو تین کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ آپ نے اسے روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

''میں بھلا اسے کیوں روکتی؟'' وہ چیخ کر بے خیالی میں بولی۔

میں نے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا، اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ غالباً اس نے میرے سوال کا مقصد جان لیا تھا۔ میں نے اس کی پرواہ کیے بغیر گواہ سے پوچھا۔

''آپ کو اس لئے مقتولہ کو اس فلیٹ میں داخل ہونے سے روکنا چاہئے تھا کہ مذکورہ فلیٹ ڈاکٹر مہندر کمار کی ملکیت ہے جو ان دنوں اپنی فیملی کے ساتھ حیدر آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کا فلیٹ بالکل خالی پڑا ہے۔ علاوہ ازیں آپ نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ دروازے کے اندر ملزم بھی موجود ہے۔ بلکہ آپ نے دعویٰ کیا ہے، ملزم ہی نے مقتولہ کو اندر آنے پر اُکسایا تھا۔ اس صورتِ حال میں آپ کا چونک جانا ایک لازمی امر تھا۔ اگر آپ مقتولہ کو اس فلیٹ میں داخل ہونے سے نہ بھی روکتیں تو کم از کم اس سنسنی خیز واقعے کے بارے میں دوسرے لوگوں کو ضرور بتانا چاہئے تھا۔ مگر آپ نے ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ کیوں؟...... آخر کیوں؟''

اس نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ اس سے کوئی بڑی غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ اس غلطی کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ ایک اور سنگین غلطی کر بیٹھی۔ منتشر آواز میں اس نے میرے سوال کا جواب کچھ یوں دیا۔

''وہ...... وہ میں...... سمجھی تھی کہ...... ملزم کسی پارٹی کو مکان دکھانا چاہتا ہے...... ڈاکٹر مہندر کمار اپنے فلیٹ کو فروخت کرنا چاہتا تھا...... اور دوسری بات یہ کہ میرا شوہر بہت غصے والا ہے۔ وہ نیچے تیار کھڑا تھا۔ اس نے مجھے اور نبیل کو رکشہ میں بٹھانا تھا۔ ہم امی کے پاس گارڈن ویسٹ جا رہے تھے۔ اگر...... مجھے دیر ہو جاتی تو شہزاد ایک ہنگامہ برپا کر دیتا...... اسی لئے میں نے نہ تو انیتا کو اس واقعے کے بارے میں بتایا اور نہ ہی...... مقتولہ والے معاملے میں اُلجھنے کی کوشش...... میرا مطلب ہے، میں بہت جلدی میں تھی...... اور......''

''اور'' پر جملہ نامکمل چھوڑ کر وہ وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور نہایت ہی سخت لہجے میں کہا۔

''اور...... یہ کہ آپ نے ایک ساتھ اتنے زیادہ جھوٹ بول دیئے ہیں کہ اب آپ کی سمجھ

میں نہیں آ رہا، آگے کیا بولیں۔ شاید جھوٹوں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے یا آپ کو اُمید ہے، وکیلِ استغاثہ اس موقع پر آپ کو تازہ بہ تازہ جھوٹ فراہم کریں گے۔ آپ اسی انتظار میں ہیں۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیلِ استغاثہ احتجاجی انداز میں چیخ اُٹھا۔ تاہم اس چیخ میں کوئی زیادہ دم خم موجود نہیں تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا، اس کے تعزیے ٹھنڈے ہو چکے ہیں۔ فریادی لہجے میں اس نے جج سے کہا۔ "میرے فاضل دوست نے استغاثہ کی معزز گواہ پر الزامات کی بارش کر دی ہے........ کیوں؟"

جج نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "بیگ صاحب! آپ نے ابھی گواہ کے حوالے سے جو کچھ بیان کیا ہے وہ محض الزامات ہیں یا آپ انہیں ثابت بھی کر سکتے ہیں؟"

"آپ کا حکم ہو تو ابھی ثابت کر سکتا ہوں۔" میں نے مستحکم انداز میں کہا۔

جج نے سوالیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کو دیکھا اور پوچھا۔ "اگر وکیلِ صفائی اپنے کہے ہوئے الفاظ کا ثبوت فراہم کر دیں تو آپ کا اعتراض رفع ہو جائے گا؟"

میں جج کے انداز کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ میرے بیان کردہ نکات کی حقیقت تک پہنچ گیا تھا اور اپنے اس استفسار سے وہ وکیلِ استغاثہ کو باندھ کر ڈالنا چاہتا تھا۔ وکیلِ استغاثہ نے متذبذب اور متاملانہ انداز میں کہا۔

"جی........ بالکل........ ضرور!"

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! اپنے دعوے کو ثابت کریں۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ اس وقت میرا مخاطب براہِ راست جج تھا اور میرا انداز دلائل دینے والا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس پیشی پر کیس کا پانسہ پلٹ کر رکھ دوں گا۔

"جنابِ عالی! میں استغاثہ کی گواہ مہرین شہزاد کے لکنت زدہ جواب کو ترتیب وار زیرِ بحث لاتا ہوں۔ پھر یہ بات روزِ روشن کی مانند عیاں ہو جائے گی، میرے ہر دعوے کا ثبوت مل جائے گا اور بھری عدالت میں میرے مؤکل کی بے گناہی بھی ثابت ہو جائے گی۔"

میں نے لمحہ بھر کو توقف کر کے حاضرینِ عدالت کی طرف دیکھا پھر دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"جنابِ عالی! معزز گواہ کا یہ کہنا ہے کہ وہ سمجھی تھی، ملزم کسی پارٹی کو ڈاکٹر مہندر کمار کا فلیٹ دکھانا چاہ رہا ہو گا لہٰذا اس نے مقتولہ کو فلیٹ کے اندر داخل ہونے سے روکنے کی کوشش نہیں کی جبکہ تھوڑی دیر پہلے وہ مقتولہ کو دو مرتبہ اچھی طرح دیکھنے اور پہچاننے کا دعویٰ کر چکی ہے۔ ایک

بار اس وقت جب اس نے مقتولہ سے واشنگ پاؤڈر خریدا اور دوسری دفعہ اس وقت جب اس نے مقتولہ کو ڈاکٹر مہندر کمار کے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا۔ جب وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہی سیلز گرل ڈاکٹر مہندر کمار کے فلیٹ میں داخل ہو رہی ہے جس سے میں نے واشنگ پاؤڈر خریدا تھا تو پھر اس نے اسی سیلز گرل کو فلیٹ خریدنے والی کوئی پارٹی کیسے سمجھ لیا؟''

میں نے ایک گہری سانس لے کر سلسلۂ دلائل کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''نمبر دو....... استغاثہ کی گواہ نے اپنے شوہر کو نہایت ہی غصیلا اور جھگڑالو قرار دیتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ انہیں رکشہ میں بٹھانے کے لئے تیار کھڑا تھا لہٰذا اس ڈر سے کہیں اسے دیر نہ ہو جائے، یہ ابتدا سے بھی مقتولہ اور ملزم والے معاملے کا ذکر نہ کر سکی۔ اگر اسے دیر ہو جاتی تو شہزاد حسین ایک ہنگامہ کھڑا کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی تھوڑی دیر پہلے ایک سوال کے جواب میں گواہ بتا چکی ہے کہ اس نے لگ بھگ چار بجے سہ پہر ملزم اور مقتولہ کو فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین میں داخل ہوتے دیکھا تھا جبکہ میرا دعویٰ ہے، وقوعہ کے روز چار بجے گواہ ''ڈائمنڈ ہائٹس'' میں موجود ہی نہیں تھی۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' مہرین شہزاد کے استفسار میں حد درجہ اُلجھن تھی۔

میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔ وکیلِ استغاثہ خونخوار انداز میں مجھے دیکھنے لگا۔

اس کیس میں جج کی دلچسپی بھی ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی۔ اس نے سنسنی خیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنے دعوے کی وضاحت کر سکتے ہیں؟''

''ڈیفنیٹلی یور آنر!'' میں نے چٹانی لہجے میں کہا، پھر وضاحت بھی کر دی۔ ''جنابِ عالی! مسٹر شہزاد حسین کراچی میں اکیلا ہے۔ اس کے خاندان کے باقی تمام افراد میر پور خاص میں رہتے ہیں جبکہ مہرین کا آدھا میکہ ادھر ہی گارڈن ویسٹ کے علاقے میں ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کا یہ معمول ہے کہ ہفتہ کی سہ پہر مہرین اور نبیل رکشہ میں بیٹھ کر گھاس منڈی سے گارڈن ویسٹ روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی واپسی اتوار کی شام کو ہوتی ہے۔ ہفتے کی شام سے اتوار کی شام تک کا وقت شہزاد حسین اپنے دوستوں کے ساتھ گزارتا تھا یا پھر گھر میں پڑا ٹی وی دیکھتا رہتا۔ اس فیملی کے اس معمول سے بلڈنگ میں رہنے والے اکثر لوگ واقف تھے۔ بعض تو دبی زبان میں شہزاد حسین کو ''جورو کا غلام'' بھی کہتے تھے۔ بہر حال، ہفتے کی سہ پہر اگر شہزاد حسین گھر میں موجود ہو تو وہی انہیں رکشہ میں سوار کراتا ہے اور اتفاق سے وقوعہ کے روز وہ گھر پر ہی تھا۔ مجھے گواہ کی اس بات سے صد فیصد اتفاق ہے کہ وقوعہ کے روز اس کا شوہر بالکل تیار کھڑا تھا لیکن.......'' میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ کر گواہ کی آنکھوں میں جھانکا اور پوچھا۔ ''میں

نے اب تک جو بیان کیا ہے، اس میں کوئی خامی یا غلطی تو نہیں ہے؟"
اُس نے میرے حسب توقع جواب دیا۔ "نن......نہیں۔"
"لیکن......" میں نے اپنی ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے وقت کے معاملے میں گواہ سے شدید اختلاف ہے۔ گھاس منڈی سے اگر رکشہ میں بیٹھ کر گارڈن ویسٹ جانا ہو تو پندرہ سے بیس منٹ کا وقت لگتا ہے۔ ہم اس وقت کو احتیاطاً بڑھا کر تیس منٹ یعنی آدھا گھنٹہ کر لیتے ہیں۔ اس حساب کو ملحوظِ نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے تو گواہ مہرین شہزاد اپنے بیٹے نبیل کے ساتھ چار بجے سہ پہر ڈائمنڈ ہائٹس سے نکلتی ہے۔ ان کے رکشہ کو زیادہ سے زیادہ ساڑھے چار بجے تک گارڈن ویسٹ پہنچ جانا چاہئے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"
"نن......نہیں......" ایک مرتبہ پھر استغاثہ کی گواہ نے تذبذب سے لبریز جواب دیا۔
میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "لیکن حالات و واقعات کوئی اور ہی حقیقت آشکار کر رہے ہیں۔"
"کک......کیا؟" مہرین کا لہجہ کپکپا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے سائے منڈلانے لگے تھے۔
میں نے لوہے کو اس قدر تپا دیا تھا کہ اب چوٹ لگانے میں مجھے بڑا مزہ آتا۔ "چوٹ" بڑی عجیب وغریب شے ہے۔ یہ دو افراد کو بیک وقت دو مختلف نوعیت کے تجربات سے گزارتی ہے۔ چوٹ مارنے والے کو جتنا مزہ آتا ہے، چوٹ کھانے والے کو اتنی ہی تکلیف سہنا پڑتی ہے۔ بہرحال، کیس اب ایسے مرحلے میں داخل ہو گیا تھا کہ مجھے مہرین شہزاد کے کراہنے کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔
میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری امی کے پڑوس میں کوئی سلمٰی آنٹی رہتی ہیں؟"
میں یک بہ یک "آپ" سے "تم" پر آ گیا تھا۔ اُس نے مریل سی آواز میں کہا۔
"ہاں......یہ سچ ہے۔"
"تم انیتا سے اس کی بہنوں کے جو کپڑے لے کر گئی تھیں وہ انیتا کی امی تک پہنچنے سے پہلے ہی سلمٰی آنٹی نے بھی دیکھے تھے؟" میرے لہجے کی سختی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ "اور آنٹی سلمٰی نے ان کپڑوں کی بڑی تعریف بھی کی تھی، خاص طور پر کپڑے پر کئے گئے بلوچی کام کو بڑا سراہا گیا تھا؟"
"ہاں...... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" مہرین نے متذبذب انداز میں جواب دیا۔ "جب

میں امی کے گھر پہنچی تو سلمیٰ آنٹی پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میرے گھر والے وہ کپڑے دیکھنے لگے تو سلمیٰ نے بھی تعریف کر دی۔"

"اسی وقت آنٹی سلمیٰ کی بیٹی اسے بلانے آ گئی تھی؟"

"جی ہاں.......امینہ آئی تھی۔"

"امینہ نے اپنی امی سے جو کچھ بھی کہا، اس کے جواب میں سلمیٰ آنٹی کچھ کہتے ہوئے فوراً اُٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا.......اس نے کہا تھا......." میں نے چھوٹی بُنت کا ایک جال مہرین کے اوپر پھینکا اور اپنی پیشانی کو سہلاتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی ایکٹنگ کرنے لگا۔

وہ بے اختیار میرے پھینکے ہوئے جال میں سمٹ آئی، جلدی سے بولی۔ "سلمیٰ آنٹی نے کہا تھا، ساڑھے تین بج گئے۔ اب مجھے چلنا چاہئے.......قرآن پاک پڑھنے والے بچے آ گئے ہوں گے۔"

میں نے روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "جنابِ عالی! استغاثہ کی گواہ نے میرے اس دعوے کا خود بخود جواب دے دیا ہے کہ وقوعہ کے روز وہ سہ پہر چار بجے "ڈائمنڈ ہاؤس" میں موجود نہیں تھی۔ ساڑھے تین بجے گارڈن ویسٹ اپنے میکے میں پائے جانے کا واضح مطلب یہی ہے کہ یہ کم و بیش تین بجے "ڈائمنڈ ہائٹس" سے نکلی ہو گی۔ اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ استغاثہ کی معزز ترین گواہ مہرین شہزاد نے آٹھ فروری بروز ہفتہ کی سہ پہر چار بجے سیلز گرل مقتولہ یاسمین کو فلیٹ نمبر اے۔ دو سو تین میں داخل ہوتے دیکھا ہو....... امپاسیبل.......ایبسولیوٹلی امپاسیبل یور آنر!"

میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر اسی انداز میں اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جنابِ عالی! اب تک کی عدالتی کارروائی سے یہ بات پوری طرح کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ میرے مؤکل مسٹر داؤد خان کو کسی گہری سازش اور بدنیتی سے اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ انکوائری آفیسر پر ہونے والی جرح میں بعض پوائنٹس ایسے نکل کر سامنے آئے ہیں جو میرے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرتے ہیں۔ مثلاً اس کی چوڑیاں نہ ٹوٹنے والا واقعہ۔ ازیں علاوہ کیس میں دیگر کئی مقامات پر یہ واضح دکھائی دیتا ہے کہ ملزم کا سیلز گرل کے قتل میں کوئی ہاتھ نہیں۔ اور سب سے عظیم الشان جھوٹوں کا پلندا تو ادھر وٹنس باکس میں کھڑا ہے۔" میں نے بڑے تیکھے انداز میں مہرین شہزاد کی جانب اشارہ کیا اور اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''استغاثہ کی اس معزز گواہ کے نصف درجن جھوٹ معزز عدالت کے سامنے آشکار ہو چکے ہیں جس کے بعد اس امر میں کسی شک وشبے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ میرا مؤکل سراسر بے گناہ ہے۔'' میں ایک مرتبہ پھر براہِ راست جج سے مخاطب ہو گیا۔

''جنابِ عالی! جب کوئی انسان دروغ گوئی سے کام لیتا ہے یا اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا جاتا ہے تو اس کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی جرم ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ کسی بہت ہی غلط اور نہایت سنگین معاملے کو چھپانے کی غرض سے انسان غلط بیانی کرتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ استغاثہ کی گواہ مہرین شہزاد نے متعدد مقامات پر دروغ گوئی کا مظاہرہ کر کے میرے مؤکل کو قاتل اور ہوس پرست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسی کون سی سنگین حقیقت ہے جس کی پردہ پوشی کے لئے استغاثہ کی گواہ کو اتنی ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے پر مجبور ہونا پڑا؟...... اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا گیا؟''

''مم...... میں کچھ نہیں جانتی......'' گواہوں والے کٹہرے میں مہرین شہزاد خوفزدگی کے عالم میں منمنائی۔ ''میں...... آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گی...... مجھے جانے دیں۔''

''بی بی! تمہیں بتانا تو پڑے گا۔'' جج نے درشت لہجے میں کہا۔ ''جب تک حقیقت سامنے نہیں آئے گی، تم کہیں نہیں جا سکتی ہو۔ اور اب اگر تمہاری زبان سے کوئی انکاری جملہ خارج ہوا تو یہ توہینِ عدالت ہو گی۔ اس کیس کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا، میں فوری طور پر توہینِ عدالت کے جرم میں تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔''

اُس کا شہابی رنگ یک بہ یک زرد ہو گیا۔ وہ برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی۔ آنکھوں میں بے پناہ خوف جھلک رہا تھا۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے اسے یقین ہو گیا ہو، بچت اور فرار کے تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ اس نے کٹہرے کی چوبی ریلنگ کا سہارا لیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''پ...... پانی...... میرا حلق خشک......''

اس موقع پر جج نے کچھ زیادہ ہی سختی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے استغاثہ کی گواہ کو گھور کر دیکھا اور غصیلے لہجے میں کہا۔ ''پانی ملے گا اور ضرور ملے گا۔ لیکن اس وقت تک پانی کی ایک بھی بوند تمہارے حلق تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی جب تک ''سچ'' اس حلق کے راستے گزر کر عدالت کے کمرے میں نہیں پہنچے گا۔''

مہرین خوف زدہ تو تھی ہی، جج کے ان دھمکی آمیز الفاظ نے اس کی رہی سہی مزاحمت بھی کافور کر دی۔ وہ اچانک ''نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن'' جیسی صورتِ حال میں گھر گئی

تھی۔ پھر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ کٹہرے کی ریلنگ کو تھامے تھامے اس نے روہانسی آواز میں کہا۔

"مم........ میں نے یہ سارے جھوٹ........ اپنے شوہر شہزاد کے........ کہنے پر بولے ہیں........ اُس نے تو مجھے صرف ایک جھوٹ بولنے کو کہا تھا........ کہ میں نے سیلز گرل کو ڈاکٹر مہندر کمار والے فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا........ پھر ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے........ مجھے کئی جھوٹ بولنا پڑے۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور ہراساں نظر سے عدالت میں موجود ایک ایک شخص کا چہرہ تکنے لگی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ ایک ایک سے پوچھ رہی ہو، ان کڑے حالات میں کون میری مدد کرے گا۔ میں چاہے استغاثہ کا دشمن ہی سہی مگر سب سے پہلے میں اس کی "مدد" کو لپکا۔ اس مرتبہ میں نے اسے خاصے احترام سے مخاطب کیا۔

"مہرین صاحبہ! کیا شہزاد حسین نے اس لئے آپ کو جھوٹ بولنے پر مجبور کیا تھا کہ کسی نہ کسی حوالے سے وہ سیلز گرل یاسمین کے قتل میں ملوث ہے؟"

اس نے نگاہ اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور منہ سے ایک لفظ ادا کئے بغیر خاموشی سے گردن جھکا لی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

مہرین کی جھکی ہوئی گردن کو معنی پہنانا انتہائی آسان تھا۔ اس کی گردن کی خاموش جنبش نے میرے مؤکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے ساتھ ہی اس کیس کے اصل مجرم، سیلز گرل کی موت کے ذمے دار شخص کو بھی بے نقاب کر دیا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وقوعہ کے روز فلیٹ اے۔ دو سو تین کے حوالے سے استغاثہ نے جس شرم ناک واقعے کو بیان کیا تھا وہ واقعہ بلکہ سانحہ درحقیقت فلیٹ نمبر اے۔ دو میں پیش آیا تھا اور اس واقعے کا بنیادی کردار داؤد خان نہیں، شہزاد حسین تھا!

جج نے آئندہ پیشی کی تاریخ دیتے ہوئے انکوائری آفیسر کو ہدایت کی کہ وہ شہزاد حسین کو شاملِ تفتیش کر کے جلد از جلد عدالت میں پیش کر دے۔

❋❋❋

آئندہ پیشی پر عدالت نے میرے مؤکل کو باعزت بری کر دیا۔

پولیس نے شہزاد حسین کو شاملِ تفتیش کر کے عدالت میں پیش کرنے سے پہلے ہی اس کی زبان سے اقبالِ جرم کرا لیا۔ مہرین کو رکشہ میں بٹھانے کے بعد وہ گھر آیا تو چند منٹ کے بعد

سیلز گرل نے اس کے فلیٹ کی اطلاعی گھنٹی بجائی تھی۔ بس اسی لمحے شیطان نے اس کی سوچ کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اس کے بعد فلیٹ نمبر اے۔ دو میں جو کچھ ہوا ہوگا اور جس طرح شہزاد نے مردہ یاسمین کو عقبی کھڑکی کے راستے ڈکٹ میں پہنچایا ہوگا، اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

کانفیڈنس اور اوور کانفیڈنس ہونے میں بال برابر فرق ہوتا ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا، انسان کب کانفیڈنٹ ہے اور کب اوور کانفیڈنٹ۔ حد سے بڑھی ہوئی خوش فہمی بالآخر نقصان ہی پہنچاتی ہے۔

شہزاد حسین خود کو بہت عقل مند سمجھتا تھا۔ اور یہی خوش فہمی اُسے لے ڈوبی!

..........*

زیر و زبر

اُس روز کلائنٹس میرے دفتر کا راستہ بھول گئے تھے۔ میں گزشتہ دو گھنٹے سے اپنے چیمبر میں موجود تھا اور ابھی تک ایک بھی کلائنٹ کی صورت دیکھنے کو نہیں ملی تھی اور اس خلافِ معمول صورتِ حال کی دو بڑی وجوہ تھیں!

ایک تو اس روز کسی سیاسی پارٹی کی طرف سے ہڑتال کی اپیل کی گئی تھی۔ حکومت چونکہ اس ہڑتال کے خلاف تھی لہٰذا مذکورہ سیاسی پارٹی کو اپنے مقصد میں جزوی کامیابی حاصل ہو سکی۔ بہر حال، روزمرہ کی زندگی پر اس ہڑتال کے اچھے خاصے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ دوسرے، اس روز دوپہر کے بعد بارش بھی ہو گئی جس کے باعث کاروبارِ زندگی ایک طرح معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ دسمبر کے اختتامی دن تھے۔ موسمِ سرما حسبِ استطاعت جوبن پر تھا۔ بارش نے گویا اس کی ''استطاعت'' میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

جب بوریت حد سے زیادہ بڑھنے لگی تو میں نے اپنی سیکرٹری کو انٹرکام کیا۔ ''نازنین! کیا پوزیشن ہے باہر کی؟''

''سر! آج پوزیشن بڑی خراب ہے۔'' نازنین نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے آج اس شہر کے باسیوں کو کسی وکیل، کسی قانونی مشورے کی ضرورت نہیں۔''

''پھر کیا خیال ہے، ہم بھی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر چلتے بنیں؟'' میں نے نازنین سے پوچھا۔

اس وقت سہ پہر کے چار بجے تھے۔ میں عموماً دو بجے تک دفتر پہنچ جاتا تھا۔ اگر عدالت میں کوئی ایمرجنسی پیش آ جائے تو دوسری بات ہے۔ اس صورت میں مجھے تھوڑی بہت تاخیر ہو جایا کرتی تھی۔ کیونکہ مجھے عدالت سے فارغ ہونے کے بعد ہی اپنے دفتر کا رخ کرنا ہوتا تھا۔ دفتر سے اُٹھنے کا کوئی ٹائم مقرر نہیں تھا۔ اس کا انحصار کلائنٹس کی آمد و شد پر ہوتا تھا۔ عام طور پر آٹھ، ساڑھے آٹھ بج جایا کرتے تھے...... لیکن آج تو یہی نظر آ رہا تھا کہ ہمیں بھی اس سیاسی

پارٹی کا ساتھ دینا چاہئے جس نے ہڑتال کا اعلان کر رکھا تھا۔

نازنین نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ''سر! ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔''

''اگر ہم یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے تو آٹھ بھی بج ہی جائیں گے۔'' میں نے اُکتاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ ''ویسے میں بھی تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ مجھے بھی یہی محسوس ہو رہا ہے، آج اس طرف کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا!''

عام طور پر ملازمین اس آسرے پر رہتے ہیں کہ اِدھر چھٹی کا کوئی بہانہ ہاتھ آیا، اُدھر انہوں نے کام چھوڑ کر گھر جانے کے لئے پَر تولنا شروع کر دیئے۔ مگر نازنین کو میں نے بہت مختلف پایا تھا وہ میرے دفتر کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر کرتی تھی۔ آج جلدی بھاگ جانے کا اچھا خاصا موقع تھا اور میں بھی کچھ اسی قسم کی صلاح دے رہا تھا۔ لیکن نازنین نے کہا۔

''سر! جب دفتر کھول کر بیٹھ ہی گئے ہیں تو پھر کم از کم چھ بجے تک تو رُکیں۔ ہوسکتا ہے، کوئی بھولا بھٹکا، کوئی من چلا ہمیں جھانکنے اِدھر آ نکلے۔'' وہ لحہ بھر کو متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر ہم سرے سے دفتر کھولتے ہی نہیں تو پھر دوسری بات تھی!''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ''جب اوکھلی میں سر دے ہی بیٹھے ہیں تو پھر موسلوں سے کیا ڈرنا؟''

''سر!........ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ جلدی سے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

نازنین میں حسِ مزاح بہ درجہ اتم موجود تھی۔ وہ اچھا مذاق کرنا جانتی تھی اور دوسروں کے معیاری مذاق کو انجوائے بھی کرتی تھی۔ اس سے گفتگو کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ خاصی خوش مزاج اور شگفتہ لڑکی تھی۔ تاہم میرے ساتھ وہ قدرے محتاط رہتی تھی۔ وہ جیسے ہی محسوس کرتی کہ جواباً میں بھی مذاق کے موڈ میں ہوں تو بڑی خوش اسلوبی سے پسپائی اختیار کر جاتی تھی جیسا کہ ابھی میرے ''اوکھلی اور موسلوں'' کے ذکر پر اس نے فوراً دفاعی انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت پیش کر دی تھی۔ ہوسکتا ہے، اس کی یہ محتاط روی محض اس لئے ہو کہ میں آفٹر آل اس کا باس تھا۔ بہر حال، اس کے احتراز، پسپائی، فرار، ہچکچاہٹ اور احتیاط میں بھی ایک حُسن تھا۔ میں نے سوچا، جب فارغ ہی بیٹھے ہیں تو چلو نازنین ہی سے تھوڑی گپ شپ ہو جائے۔ اسی سوچ کے تحت میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''تم کیا کر رہی ہو نازنین؟''

''سر! آج کا اخبار دیکھ رہی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا کوئی ایونگر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے کہا۔ ''نہیں سر! صبح کا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے، تم باسی اخبار پڑھ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''صبح کا اخبار تو صبح ہی صبح پڑھنے کا ہوتا ہے۔''

''صبح موقع نہیں مل سکا تھا سر!'' وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔ ''آج مجھے یونیورسٹی بھی جانا تھا۔ وقت بہت کم تھا میرے پاس۔''

نازنین نے اپنی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جاری رکھا ہوا تھا۔ میرے پاس وہ پارٹ ٹائم جاب کرتی تھی۔ میں نے اُس کی بات سنی اور اُس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔

''بشارت کہاں ہے؟''

''وہ ذرا باہر گیا ہے........شاید سگریٹ وغیرہ لینے۔''

بشارت میرے دفتر میں ''آفس بوائے'' کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ وہ ایک چلتا پرزہ قسم کا جوان تھا اور آنکھ کے اشارے پر حکم کی تعمیل کرتا تھا۔ اس کی مستعدی، ہمت اور ولولے کی بناء پر میں نے اس کا نام ''چراغی جن'' رکھ دیا تھا۔ اُسے یہ ٹائٹل بے حد پسند آیا تھا۔ برا منانے کی بجائے اس نے میرا شکریہ ادا کیا تھا۔ میں مذاق میں اس سے کہا کرتا تھا۔

''بشارت! تم اس دنیا کے وہ واحد جن ہو جو سگریٹ نوشی بھی کرتا ہے۔''

وہ قہقہہ لگاتا اور کہتا۔ ''وہ اس لئے بیگ صاحب! کہ میں آپ کا جن ہوں۔''

''لیکن........'' میں حیرت سے پوچھتا۔ ''میں تو سگریٹ نہیں پیتا؟''

''اسی لئے تو میں پیتا ہوں۔'' وہ کسی فلسفی کی مانند گردن ہلاتے ہوئے دلیل دیتا۔ ''جن یا صاحبِ جن میں سے کسی ایک کو تو تمباکو نوش ہونا چاہئے نا!''

''کیا یہ کوئی فارمولا ہے؟'' میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کرتا۔

وہ سادگی سے کہتا۔ ''نہیں بیگ صاحب! یہ فارمولا نہیں، ہاج مولا ہے۔ صرف ایک سگریٹ تمام کھائے پیئے کو منٹوں میں ہضم کر دیتی ہے، کبھی آزما کر دیکھیں۔''

''ٹھیک ہے، کبھی ٹرائی کروں گا۔'' میں یہ کہہ کر اس سے جان چھڑا لیتا۔

بشارت کا تعلق بہاول نگر سے تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ وہ گزشتہ پانچ سال سے کراچی میں تھا........اس کے بیوی بچے بہاول نگر ہی میں رہتے تھے۔ وہ ہر ماہ دو دن کے لئے ان سے ملنے بہاول نگر جاتا تھا۔ میرے پاس کام کرتے ہوئے اسے ایک سال ہونے کو آیا تھا........اس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی اور خاصا سمجھ دار واقع ہوا تھا۔

میں نے بشارت کے خیال کو ذہن سے نکالا اور نازنین سے کہا۔

''تم ذرا میرے پاس آؤ۔''

دو منٹ بعد وہ چیمبر میں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ نازنین ایک اسم بامسمٰی لڑکی تھی۔ فرصت کے لمحات میں وہ میرے پاس آ کر بیٹھ جاتی یا میں اسے خود ہی بلا لیتا تھا۔ اس سے بات کر کے ساری تھکن، ساری بوریت دور ہو جاتی۔ اس وقت بھی میں نے نازنین کو اسی مقصد کے لئے چیمبر میں بلایا تھا۔

ہمارے درمیان مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ آج کی جزوی ہڑتال، سیاسی پارٹی کا مؤقف نما مطالبہ اور موسم کی شدت میں اضافہ کرتی ہوئی بارش خصوصی موضوع رہے۔ اس نشست کو جبے ابھی بیس پچیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

اس ریسیور کے توسط سے عموماً نازنین کی دل نشیں آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرتی تھی مگر وہ تو اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی اور ہی ہو گا۔ میں نے ریسیور کو کان سے لگانے کے بعد اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

''ہیلو!''

''بیگ صاحب! کوئی آیا ہے۔'' بشارت کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ ''مس نازنین نظر نہیں آ رہیں۔''

''نازنین میرے پاس ہے۔'' میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا، پھر پوچھا۔ ''تم کس کا ذکر کر رہے ہو؟ کیا وہ کوئی کلائنٹ ہے؟''

''شکل سے تو کلائنٹ ہی نظر آتا ہے جناب!'' بشارت نے جواب دیا۔ ''کہہ رہا تھا، وکیل صاحب سے ملنا ہے۔ میں نے پوچھا، کس سلسلے میں ملنا ہے؟ بولا، یہ میں وکیل صاحب ہی کو بتاؤں گا۔ میں نے پوچھا، وکیل صاحب کو آپ کے بارے میں کیا بتاؤں؟ اس سوال کے جواب میں اس نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ میں نے اسے انتظار گاہ میں بٹھایا ہے اور آپ کو بتا رہا ہوں۔'' بشارت نے ایک ہی سانس میں اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی اور خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے......تم کارڈ مجھ تک پہنچا دو۔''

''او کے سر!'' بشارت نے فرماں برداری سے کہا۔

میں نے انٹرکام کے ریسیور کو کریڈل کیا ہی تھا کہ نازنین اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر ذمہ

دارانہ لہجے میں بولی۔
''سر! میں جا کر اپنی سیٹ سنبھالتی ہوں۔''
''بیٹھو ابھی۔'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ''میں دیکھ تو لوں، وہ ہے کون۔''
وہ ایک لفظ ادا کئے بغیر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی۔
بشارت نے نو وارد کا تعارفی کارڈ مجھ تک پہنچا دیا۔ میں نے اس کارڈ کا جائزہ لیا۔ وہ کسی ''اسٹار انٹر پرائزز'' نامی مارکیٹنگ کمپنی کا کارڈ تھا اور فیلڈ آفیسر کے عہدے کے نیچے قلم سے ''وارث علی'' لکھا ہوا تھا۔ گویا کوئی فیلڈ آفیسر وارث علی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ ''اسٹار انٹر پرائزز'' کے فیلڈ آفیسر مسٹر وارث علی کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے، میں نے بشارت کے توسط سے اس شخص کو اپنے پاس بلا لیا۔ ویسے جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، اس مارکیٹنگ کمپنی کا نام میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔
چند سیکنڈ کے بعد ایک دراز قامت شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں اس کے ایک سیاہ بریف کیس نظر آ رہا تھا جیسا کہ عموماً مارکیٹنگ والوں کے پاس ہوتا ہے۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے ستائیس اور اٹھائیس کے درمیان قائم کیا۔ گندمی رنگت کا حامل وہ ایک خوش شکل شخص تھا تاہم اس کے چہرے پر مخصوص دیہاتی پن پایا جاتا تھا۔ اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد سوالیہ نظر سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا تو میں نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''تشریف رکھیں وارث صاحب!''
اس نے تشریف رکھ دی اور متاملانہ لہجے میں مستفسر ہوا۔
''آپ میں سے وکیل کون ہیں؟''
''آپ'' سے اس کی مراد میں اور نازنین تھے۔ اس کا یہ سوال مجھے عجیب سا لگا تاہم میں نے کوئی سخت جواب دینے کی بجائے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔
''اگر مرزا امجد بیگ کسی لڑکی کا نام نہیں تو وہ وکیل میں ہوں۔''
''اوہ، سوری!'' وہ خجالت آمیز انداز میں بولا۔ پھر مصافحے کے لئے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔
''میں نے باہر آویزاں تختی پر آپ کا نام تو پڑھا تھا لیکن ذہن سے نکل گیا۔ بہر حال، وکیل تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں مرد اور عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی بیگ صاحب!'' اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبایا اور اس عمل کو دو تین مرتبہ

دوہرانے کے بعد میرا ہاتھ آزاد کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کوئی بات نہیں، غلطی انسان ہی سے ہوتی ہے۔اسی لئے اسے خطا کا پُتلا کہا گیا ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا، پھر پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا۔''فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''بیگ صاحب! خدمت تو آپ کی میں کرنے آیا ہوں۔'' جواباً وہ بھی خالصتاً پیشہ ورانہ لہجے میں بولا۔

میں نے اور نازنین نے بیک وقت حیرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

وارث علی نامی وہ شخص اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا۔''بیگ صاحب! آپ سگریٹ کون سی پیتے ہیں؟''

اس کا یہ سوال پہلے سے بھی زیادہ حیران کن تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی سگریٹ کمپنی کا سیلز ریپ ہو۔ بریف کیس میں سے اپنی کمپنی کے مخصوص برانڈ نکال کر وہ مجھے، انہیں خریدنے کی ترغیب دے گا اور قائل کرنے کی کوشش کرے گا کہ آج تک کسی کمپنی نے ان سے زیادہ اچھی سگریٹ تیار نہیں کی۔

میں یوں بھی اس وقت فارغ ہی بیٹھا تھا۔سوچا،تھوڑی سی تفریح اس وارث علی کے ساتھ بھی ہو جائے۔لہٰذا میں نے بڑے خوشگوار انداز میں اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''کوئی سی بھی نہیں!''

''حیرت ہے!'' بریف کیس کے اندر متحرک اس کے ہاتھ رک گئے۔

''کمال ہے!'' میں نے کہا۔''آپ کو میرے سگریٹ نہ پینے پر حیرت ہے؟''

''وکالت سراسر سوچنے،غور کرنے اور........خیر چھوڑیں......'' وہ بریف کیس بند کرتے ہوئے حتمی لہجے میں بولا۔''جب آپ سگریٹ پیتے ہی نہیں تو پھر زبردستی تھوڑی ہے۔''

''آپ کون سی سگریٹ کمپنی کی مارکیٹنگ کرتے ہیں؟'' نازنین نے اس سے پوچھا۔

وہ پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔''اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کراچی انٹرنیشنل سٹی ہے۔ یہاں بعض خواتین بھی سگریٹ نوشی کا شوق رکھتی ہیں۔کیا آپ بھی سگریٹ پینا پسند کرتی ہیں؟''

''سوری..... مجھے اسموکنگ پسند نہیں۔'' نازنین نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

وہ قدرے مایوس نظر آنے لگا۔پھر خجالت آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''سوری وکیل صاحب! میں نے آپ کا بہت سا قیمتی وقت لے لیا۔اب میں چلوں گا۔'' بات

ختم کرتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے اس کی آمد اور جاند نے اُلجھا کر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے دفتر سے رخصت ہو جاتا، میں نے اپنی معلومات کی خاطر اس سے پوچھ لیا۔ ''وارث صاحب! کیا آپ یہاں صرف یہی پوچھنے آئے تھے کہ ہم کون سی سگریٹ پیتے ہیں؟''

وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ میں ''اسٹار انٹر پرائزز'' کے لئے مارکیٹنگ کرتا ہوں۔ آپ کو میرا وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ میری کمپنی مختلف پراڈکٹس کی مارکیٹنگ کرتی ہے۔ جب بھی کسی کمپنی کی کوئی نئی پراڈکٹ مارکیٹ میں آنا ہوتی ہے تو اس کے نام کا انتخاب سب سے بڑا اور اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ مختلف کمپنیز اس سلسلے میں ہماری خدمات حاصل کرتی ہیں۔ ہم مارکیٹ کا سروے کر کے انہیں بتاتے ہیں کہ کون سا نام ان کی پراڈکٹ کے لئے موزوں اور منفعت بخش رہے گا۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آج کل ایک کمپنی کوئی نیا سگریٹ برانڈ مارکیٹ میں لانا چاہتی ہے۔ میں اسی برانڈ کے نام کے انتخاب کے لئے سروے کر رہا ہوں۔ ہماری کمپنی کی پالیسی یہ ہے کہ صرف انہی لوگوں کا ''انٹرویو'' کیا جائے جو اعلیٰ اور معیاری سگریٹ پیتے ہوں۔ اس کے لئے گولڈ لیف کو اسٹینڈرڈ مقرر کیا گیا ہے۔ سروے کا ہمارا طریقہ کار کچھ یوں ہے......'' جملہ ادھورا چھوڑ کر وہ اپنے بریف کیس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

میں اور نازنین دلچسپ نظروں سے اس کے متحرک ہاتھوں کو دیکھنے لگے کہ وہ بریف کیس کے اندر سے جانے کون سی عجب شے برآمد کرتا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں وارث علی نامی اس شخص کو باہر ہی سے ٹہلا دیتا۔ بلکہ میری سیکرٹری نازنین اس سے معذرت کر لیتی کہ بیگ صاحب کے پاس ایسے کاموں کے لئے وقت بالکل نہیں ہے۔ مگر فرصت کے ان لمحات میں چونکہ مجھے تفریح کی سوجھ رہی تھی لہٰذا اس فیلڈ آفیسر کی کتھا سننے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

وارث علی نے بریف کیس میں سے ایک چھوٹا سا بنڈل برآمد کیا۔ اس بنڈل میں لگ بھگ ایک درجن فلش کارڈز رکھے ہوئے تھے۔ اس نے پلاسٹک کوٹیڈ مذکورہ فلش کارڈز میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ لیں جناب! اگرچہ آپ اسموکنگ نہیں کرتے لیکن پھر بھی دیکھ لیں۔'' اُس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو، آپ بھی کیا یاد کریں گے وکیل صاحب! کس ساہوکار سے پالا پڑا تھا۔

میں نے ان کارڈز کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور کھول کر ایک ایک کا جائزہ لینے لگا۔ ہر کارڈ پر ایک نام درج تھا۔ مثلاً .... بونڈ اسٹریٹ، سیلم، کین مور، گولڈن برج........ وغیرہ، وغیرہ۔ یہ سب دنیا کے معروف سگریٹ برانڈ تھے۔ میں نے فلش کارڈز پر سے نگاہ ہٹا کر سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

''ہم یہ کارڈز دکھا کر پوچھتے ہیں کہ آپ کو ان میں سے کون سا نام سب سے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ جو نام ہمیں بتایا جاتا ہے، اسے فارم میں درج کر لیا جاتا ہے۔ اسی فارم میں مذکورہ شخص کے بنیادی کوائف کا اندراج بھی کر لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر نام، عمر، ایڈریس، فون نمبر اور یہ کہ وہ کتنے عرصے سے اسموکنگ کر رہا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اس سروے سے ہمیں اچھے اسموکرز کے رجحان کا اندازہ ہوتا ہے۔''

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا۔ ''افسوس کہ آپ میرے دفتر سے ایک فارم بھی پُر کر کے نہیں لے جا سکے۔''

''کوئی بات نہیں وکیل صاحب! میں مایوس نہیں ہوا۔'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے الوداعی مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ''ہوسکتا ہے آئندہ ملاقات کے وقت میں کسی ایسی شے کے لئے سروے کرتا نظر آ جاؤں، جو ایک طویل عرصے سے آپ کے استعمال میں ہو۔ تب میں ساری کسر نکال لوں گا۔''

''وِش یو گڈ لک!'' میں نے نیک خواہشات کے ساتھ اسے رخصت کر دیا۔

جانے سے پہلے اس نے فرمائش کی کہ میں اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دوں۔ اُس کی اس معمولی سی خواہش کو پورا کرنے میں کوئی ہل بیل نہیں لگتے تھے لہٰذا میں نے ٹیبل پر رکھے کارڈ باکس میں سے اپنا ایک تعارفی کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔

اس کے جانے کے بعد نازنین نے کہا۔ ''سر! مارکیٹنگ کے نئے نئے انداز سامنے آ رہے ہیں۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی پراڈکٹ کا نام اس طرح بھی منتخب کیا جاتا ہوگا۔ ویسے یہ خاصا دلچسپ اور مفید طریقۂ انتخاب ہے۔''

''مارکیٹنگ کے شعبے میں ابھی ہم مغرب سے بہت پیچھے ہیں۔'' میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہاں مارکیٹنگ کا ایک سے ایک نیا اور منفرد ڈھنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یوں سمجھو کہ پاکستان میں تو ابھی مارکیٹنگ کی صحیح معنوں میں ابتداء ہے۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ پچیس تیس سال بعد یہاں بھی اس شعبے کا ایک سیل آب سا بہہ نکلے گا جب کسی بھی پراڈکٹ کو مارکیٹنگ کے بغیر وسیع پیمانے پر فروخت کرنا ممکن نہیں رہے گا۔ یہ ماننا

پڑے گا کہ پبلسٹی اِز اے مدر آف بزنس۔"

اس واقعے کو کم و بیش پچیس سال گزر گئے ہیں۔ آج کل مارکیٹنگ اور پبلسٹی کا ڈیپارٹمنٹ پاکستان میں اتنا ہی طاقت ور اور ناگزیر ہو چکا ہے جس کا اندازہ میں نے ربع صدی پہلے قائم کیا تھا۔

میرے اور نازنین کے درمیان اسی موضوع پر گفتگو جاری تھی کہ بشارت پوچھنے آ گیا۔

"سر جی! کیا ارادہ ہے؟ آج کسی مؤکل کے آنے کی اُمید تو نظر نہیں آ رہی۔"

اُس کے اس تبصرے کا سیدھا سیدھا مطلب یہ تھا کہ اب ہمیں دفتر بند کر کے اپنے اپنے گھر کا راستہ پکڑ لینا چاہئے ورنہ کسی اور کمپنی کا کوئی فیلڈ آفیسر آ دھمکے گا اور ہمیں اس کے اُلٹے سیدھے سوالات کے جوابات دینا پڑیں گے۔ میں نے رواداری میں بشارت سے پوچھ لیا۔

"یہ سگریٹ کمپنی والا وارث علی جاتے ہوئے کچھ کہہ تو نہیں رہا تھا؟"

"وہ خاصا مایوس ہو کر جا رہا تھا سر جی!" بشارت نے بتایا۔ "لیکن خیر........میں نے اس کا کام کر دیا ہے۔"

"کام کر دیا ہے، کیا مطلب؟" میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "سر جی! آپ نے تو اس کا ایک فارم بھی نہیں بھروایا تھا، میں نے دو بھروا دیئے۔ آپ سگریٹ نوشی نہیں کرتے مگر میں تو کرتا ہوں نا!"

وارث علی نے اپنے سروے کا جو کرائیٹیریا بتایا تھا، بشارت پر پورا نہیں اُترتا تھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ سستے برانڈ کی سگریٹ پیتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ دو فارم بھروانے کی بات بھی کر رہا تھا۔ اس کی باتیں مجھے ہضم نہ ہوئیں تو میں نے اس بارے میں استفسار کر لیا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سر جی! دراصل بات یہ ہے کہ وہ بندہ اپنا گرائیں نکل آیا تھا، اس لئے اس کا خیال کرنا پڑا۔ یہ ٹھیک ہے، میں اس فارم کے معیار اور ضروریات پر پورا نہیں اُترتا، لیکن کیا فرق پڑتا ہے؟ ہر جگہ تقاضے پورے کرنا ضروری تو نہیں۔ بے چارے کا بھلا ہو جائے گا۔ نئی نئی نوکری ہے اور وہ بھی انہی فارموں سے مشروط۔" وہ لمحہ بھر کو رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"جناب! آپ کو پتہ ہے، اسے روزانہ پچاس فارم بھر کر اپنے دفتر میں جمع کرانا ہوتے ہیں۔ ورنہ اس کی دیہاڑی شمار نہیں کی جاتی۔ مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں نے ایک اپنے اور ایک دوسرے دوست کے نام سے دو فارم بھروا دیئے ہیں۔ وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوش خوش گیا ہے۔"

میں نے اس موضوع کو اختتام دیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، تم دونوں کا ڈاک خانہ مل گیا تھا۔ کیا وہ بھی بہاول نگر کا رہنے والا ہے؟ تم نے اُسے اپنا گرائیں کہا ہے نا!''

''نہیں جناب!'' بشارت نے نفی میں جواب دیا۔ ''وارث کا تعلق صادق آباد سے ہے۔ لیکن کیا فرق پڑتا ہے، علاقہ تو ایک ہی ہے نا سر جی!''

''تم ٹھیک کہتے ہو بشارت علی!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''تم نے وارث علی سے صرف ڈاک خانہ ہی نہیں بلکہ ریاست بھی ملالی ہے۔''

اس نے پُر زور طریقے سے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا کہ وارث علی کو کراچی میں آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ وہ ملازمت کی تلاش میں کوئی چھ ماہ پہلے صادق آباد سے یہاں آیا تھا۔ سروے والی ''اسٹار انٹر پرائزز'' نامی اس کمپنی میں وہ گزشتہ تین ماہ سے کام کر رہا تھا۔ اور ہر ماہ کے اختتام پر تنخواہ دیتے ہوئے اس سے کہہ دیا جاتا تھا کہ وہ اپنے ٹارگٹ کو پورا کرے ورنہ نوکری سے نکال دیا جائے گا....... وارث علی قیوم آباد میں اپنے ہی جیسے دو تین چھڑے چھانٹ افراد کے ساتھ مل کر ایک کرائے کے گھر میں رہتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اگر بشارت کو چلتا پُرزہ قسم کا انسان کہا ہے تو یہ کچھ غلط نہیں ہے۔ وہ خاصا باصلاحیت واقع ہوا تھا۔ اس کی وضاحت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وارث علی نے اس کا نہیں بلکہ اس نے وارث علی کا انٹرویو کر ڈالا تھا۔

بہرحال، میں نے بشارت کی تجویز کو راست جانا اور اس روز ہم نے لگ بھگ چھ بجے شام دفتر بند کر دیا۔ نازنین کا گھر میری راہ میں پڑتا تھا لہٰذا میں اسے ڈراپ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ بشارت کی رہائش لی مارکیٹ کے علاقے میں تھی۔ ہم اپنے اپنے معمول کے مطابق گھر کو روانہ ہو گئے۔

***

پیارے قارئین! آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ میں نے یہ کہانی کس انداز سے شروع کی ہے؟ اب تک بیان کی گئی باتیں آپ کو انتہائی غیر متعلق نظر آ رہی ہوں گی اور آپ یہ اندازہ لگانے کی کوشش بھی کر رہے ہوں گے کہ آخر یہ قصہ بیان کرنے کا مقصد کیا ہے؟........ تو آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ میں نے ابھی تک کوئی بھی غیر متعلق اور بے معنی بات نہیں کی۔ یہ سارے معاملات اور واقعات انتہائی متعلق اور ضروری ہیں۔ بس اندازِ بیاں ذرا مختلف اور نیا ہے۔ یہ باتیں مجھے ویسے بھی آپ کو بتانا تھیں۔ چلیں، بعد میں نہیں تو پہلے ہی سہی۔ میں اب آپ کا اور امتحان نہیں لوں گا اس لئے تیزی سے آگے بڑھتا ہوں۔

اس واقعے کے آٹھ دس روز بعد کا ذکر ہے۔ ایک دن میں عدالت جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے چوتھی گھنٹی پر ریسیور اُٹھایا اور معتدل لہجے میں کہا۔

''ہیلو!''

''ہیلو، بیگ صاحب!'' دوسری طرف سے ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔ ''میں نوید عثمانی بات کر رہا ہوں۔''

میں نے فوراً اسے پہچان لیا۔ نوید عثمانی ایک مقامی ویلفیئر ٹرسٹ کا نگرانِ اعلیٰ تھا اور فلاح و بہبود کے کاموں میں پیش پیش رہتا تھا۔ میں نے پُرخلوص انداز میں دریافت کیا۔

''عثمانی صاحب! خیریت تو ہے؟ آج صبح ہی صبح کیسے یاد فرمایا؟''

''مکروہاتِ زمانہ نے ہر شخص کو اس قدر مصروف کر دیا ہے کہ بغیر کام کے کوئی کسی کو یاد نہیں کرتا بیگ صاحب!'' وہ ایک سفاک اور تلخ حقیقت کو بڑی سادگی سے بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ بات تو آپ بھی ضرور تسلیم کریں گے۔''

''بالکل جناب! مجھے تسلیم ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

''ایک مصیبت زدہ شخص کا کیس آپ کے سپرد کرنا ہے بیگ صاحب!'' عثمانی نے بتایا۔

میں ایک دم محتاط ہو گیا۔ عثمانی اور دیگر مختلف رفاہی و فلاحی اداروں کے توسط سے بھی میرے پاس کیس آتے رہتے ہیں۔ اس وسیلے سے ملنے والے کیسز میں ایک بات قدرے مشترک ہوتی تھی اور وہ یہ کہ عدالتی اخراجات، وکیل کی فیس اور دیگر ضروری خرچے اسی ادارے کے ذمے ہوتے تھے۔ لہٰذا ادارے کے کرتا دھرتا کی کوشش ہوتی تھی کہ میں بھی اس کارِ خیر میں حصہ لیتے ہوئے اپنی فیس میں ممکنہ حد تک کمی کروں۔ میں عموماً ایسے کیسز سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔ نیکی کرنا اور کارِ خیر میں حصہ لینا ایک مستحسن عمل ہے مگر بسا اوقات یہ عمل اُلٹا بھی پڑ جاتا ہے۔ نیکی کا جذبہ اور توفیق رکھنے والے حضرات اکثر و بیشتر اس ''تجربے'' سے گزرتے رہتے ہیں!

میں نے عثمانی کی بات کے جواب میں کہا۔ ''آج کل مصروفیت بہت ہے عثمانی صاحب!''

''مصروفیت میں سے تھوڑا وقت تو آپ کو نکالنا ہی پڑے گا بیگ صاحب!'' وہ اصراری لہجے میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں، میں آپ سے فیس میں کوئی رعایت نہیں چاہوں گا۔''

''اوہ!'' میں نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

عثمانی نے کہا۔ ''میں یہ کیس ایک اور وجہ سے بھی آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ وجہ بھی بتا دیں عثمانی صاحب!''

''دراصل، میں جس شخص کا کیس آپ کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں اس کا دعویٰ ہے کہ وہ آپ کا پنکھا ہے۔''

عثمانی کی بات سن کر بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''میرا پنکھا.......؟''

''اوہ، سوری.....'' وہ جلدی سے تصحیح آمیز انداز میں بولا۔ ''میرا مطلب تھا، آپ کا فین۔''

''میرا فین (پرستار) آپ کے ہتھے کیسے چڑھ گیا عثمانی صاحب؟'' میں نے مذاق کے رنگ میں پوچھ لیا۔ ''نام کیا ہے اُس شخص کا؟''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں بیگ صاحب!........وہ میرے ہتھے نہیں بلکہ پولیس کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔ میں نے تو اسے چھڑانے کے لئے آپ سے رابطہ کیا ہے۔'' عثمانی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزم نے اپنا نام وارث علی بتایا ہے۔ میں نے اس کے باپ کو صادق آباد فون کر دیا ہے۔ وہ آج شام تک کراچی پہنچ جائے گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ وارث کا باپ ایک صاحب حیثیت زمیندار ہے۔ وہ ہر نوعیت کے اخراجات برداشت کرنے کا متحمل ہے۔''

اس وقت فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آسکا کہ نوید عثمانی کس وارث علی کا ذکر کر رہا تھا لیکن یہ مجھے محسوس ہو گیا کہ یہ نام میں نے پہلے بھی سنا ہے۔ اسی تذبذب میں، میں نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''یہ شخص کچھ جانا پہچانا تو لگ رہا ہے.......لیکن مجھے یاد نہیں آرہا کہ........''

وہ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''آپ بھی کمال کرتے ہیں بیگ صاحب! ابھی چند روز پہلے ہی تو وارث علی آپ سے ملنے کے لئے دفتر میں آیا تھا۔ وہ کسی سگریٹ کے حوالے سے کوئی سروے کر رہا تھا۔ آپ نے اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا........''

سب کچھ پلک جھپکتے میں میری نگاہ کے سامنے روشن ہو گیا۔ وارث علی نامی یہ شخص ہڑتال والے دن میرے دفتر آیا تھا۔ میں نے اس مرتبہ عثمانی کو بات پوری نہیں کرنے دی اور جلدی سے کہا۔ ''بس بس، مجھے یاد آ گیا کہ یہ کون سا وارث علی ہے لیکن........وہ میرا فین کب سے ہو گیا؟''

''یہ تو آپ ملاقات پر اسی سے پوچھئے گا۔'' عثمانی نے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس نے مجھے آپ کا تعارفی کارڈ دکھایا تو میں نے اس سے کہا کہ میں بیگ صاحب کو جانتا ہوں۔ یہ

بات اس کے علم میں آ چکی تھی کہ میں اس کے لئے کسی وکیل کا بندوبست کرنے والا ہوں۔ اس نے اصرار کیا کہ میں آپ سے رابطہ کروں اس لئے میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔'' وہ تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوا پھر بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے بھی میں اس کیس سے تھوڑی دیر کے لئے جڑا ہوا ہوں........ جیسے ہی وارث کا باپ امانت علی کراچی پہنچے گا، میں اسے آپ سے ڈائریکٹ کر دوں گا۔ پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔''

اس کے خاموش ہوتے ہی میں نے سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔''وارث کو پولیس نے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''نہایت ہی سنگین جرائم میں۔'' عثمانی نے تاسف بھرے انداز میں کہا۔''اُس پر ایک عورت کو مجرمانہ حملے کے بعد قتل کرنے کا الزام ہے۔''

''اوہ........!'' میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

عثمانی نے تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا کہ گزشتہ رات وارث علی کو مقبول آباد کے علاقے میں ہونے والی ایک سنگین واردات کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ وارث پر الزام ہے کہ وہ سگریٹ کمپنی کے سروے کے بہانے اس علاقے کے ایک بنگلے میں گھسا۔ اس بنگلے کی مالکن اتفاق سے اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ وارث نے اس پر مجرمانہ حملہ کیا۔ ازاں بعد اس خوف سے کہ کہیں وہ عورت اس کے لئے مصیبت نہ کھڑی کر دے، اس نے گلا گھونٹ کرا سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پھر اطمینان سے وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ ازاں بعد، اس مقتولہ عورت کے ایک ملازم کی نشاندہی پر پولیس حرکت میں آئی اور رات گیارہ بجے ملزم کو اس کی رہائش گاہ، واقع قیوم آباد سے گرفتار کر لیا گیا۔

پوری بات سننے کے بعد میں نے بے یقینی سے کہا۔''وارث علی ایسا لگتا تو نہیں تھا........ اور عثمانی صاحب! آپ نے جس انداز میں واقعات بیان کئے ہیں اس میں بھی کئی مقامات پر مجھے جھول نظر آ رہا ہے۔''

''آپ اپنی تسلی کے لئے آج کسی وقت ملزم سے ملاقات کر لیں۔'' عثمانی نے معتدل انداز میں کہا۔''میں بھی اس کیس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا ہوں۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔''عثمانی صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ پولیس نے گزشتہ رات وارث کو گرفتار کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے، آج وہ وارث کو کورٹ میں پیش کر کے اس کا ریمانڈ حاصل کرنے کی کوشش کرے گی........ بلکہ ممکن ہے، اس وقت یہ کوشش کی بھی جا رہی

ہو۔ اگر آپ رات ہی میں مجھے بتا دیتے تو......."

"مجھے خود بہت بعد میں پتہ چلا تھا۔" وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ "بہر حال، پولیس کو ریمانڈ حاصل کرنے دیں۔ آپ دن میں کسی وقت یا رات میں تھوڑی فرصت نکال کر وارث سے ایک ملاقات کرلیں۔"

"ٹھیک ہے....... مجھے جیسے ہی موقع ملے گا میں اسے چیک کرلوں گا۔" میں نے کہا۔ پھر پوچھا۔ "پولیس نے اسے کس تھانے میں بند کر رکھا ہے؟"

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتا دیا۔

میں نے کہا۔ "وارث علی کا وارث یعنی امانت علی جیسے ہی کراچی پہنچے، آپ مجھ سے اس کا رابطہ ضرور کرا دیں۔ پھر میں دیکھتا ہوں، اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے....... میں آپ کی خواہش پوری کر دوں گا بیگ صاحب!" عثمانی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

پھر ہمارے درمیان الوداعی کلمات کا تبادلہ ہوا اور میں نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

اُس روز عدالت میں میرے کسی کیس کی پیشی نہیں تھی لہٰذا میں گھر سے نکلا اور سیدھا اپنے دفتر پہنچ گیا۔ عدالت میں قدم رکھنے سے قبل دفتر کو چیک کرنا میرے معمول میں شامل تھا۔ اور جب عدالت میں کوئی کیس نہ ہوتا تو میں ٹک کر دفتر ہی میں بیٹھ جاتا تھا۔ اس دن بھی مجھے یہی کرنا تھا۔

دوپہر تک میں اپنے دفتر میں ضروری امور نمٹاتا رہا، پھر لنچ کے لئے اُٹھ گیا۔ میرا دفتر سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک کثیر المنزلہ عمارت میں واقع ہے۔ اسی روڈ پر معیاری کھانوں والا ایک ہوٹل بھی ہے۔ میں عموماً لنچ وہیں کرتا تھا۔ چنانچہ میں اسی ہوٹل میں جا بیٹھا۔

وہ دن بھی گزشتہ روز کی مانند بہت بور اور غیر دلچسپ گزرا۔ میں نے دو چار کلائنٹس کو بھگتایا اور دفتر بند کر کے گھر کی راہ لی۔ تاہم گھر پہنچنے سے پہلے میں تھانے جا کر ملزم وارث سے ملاقات کرنا نہیں بھولا تھا۔ اس آدھ گھنٹے کی ملاقات میں، وارث نے مجھے جو کچھ بتایا وہ میرے اطمینان اور تسلی کے لئے کافی تھا۔ میں فی الحال ان باتوں کا یہاں ذکر نہیں کروں گا۔ عدالتی کارروائی کے دوران مناسب مواقع پر ان کا ذکر ہوتا رہے گا۔ بہر حال، اپنے اطمینان کے بعد میں نے وکالت نامے اور دیگر ضروری کاغذات پر وارث علی سے دستخط لئے، چند اہم اور ضروری مشورے دیئے اور واپس آ گیا۔

***

رات کے دس بجے عثمانی کا فون آ گیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا کہ وارث علی کا باپ صادق آباد سے کراچی پہنچ گیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا میں ابھی امانت علی کو آپ کے پاس بھیج دوں؟''

''سوری عثمانی صاحب!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔'اس وقت میں گھر میں ہی ہوں۔ اور آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ میں عدالتی اور دفتری امور کو گھر پر ڈیل نہیں کرتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے........میں نے تو ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔''عثمانی صاحب! مجھے محسوس ہو رہا ہے، آپ جلد از جلد اس معاملے سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہیں۔''

''نہیں........ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔''دراصل امانت علی آپ سے ملنے کے لئے بہت بے تاب ہے۔ بیٹے کی پریشانی نے اسے خاصا ڈسٹرب کر رکھا ہے۔''

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس نے اپنی جھینپ مٹانے کے لئے بات بدلی تھی ورنہ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کی بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

''ظاہر ہے، باپ کو تو ایسے معاملے میں پریشان ہونا ہی چاہئے لیکن عثمانی صاحب! آپ سمجھ دار ہیں، یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس وقت اگر امانت علی کی مجھ سے ملاقات ہو بھی جاتی ہے تو اسے کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ ہی وارث کے کیس پر کوئی خاص اثر مرتب ہو گا۔ پولیس نے اسے آج صبح عدالت میں پیش کر کے سات روز کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔ جب تک ریمانڈ کی مدت پوری نہیں ہوتی، عملاً وارث کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا........''۔

میں لحہ بھر کو سانس لینے کی غرض سے رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔''لہٰذا آپ امانت علی کو کل دوپہر کے بعد کسی وقت میرے دفتر بھیج دیں تو زیادہ مناسب ہو گا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ تائیدی لہجے میں بولا۔''آپ جو کہہ رہے ہیں، میں ویسا ہی کروں گا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھ لیا۔''کیا آپ ملزم وارث علی سے ملاقات کر چکے ہیں؟''

''جی عثمانی صاحب!'' میں نے جواب دیا۔''میں حوالات میں اس سے ایک بھرپور ملاقات کرنے کے بعد ہی تھوڑی دیر پہلے گھر پہنچا ہوں۔''

''ملاقات کیسی رہی؟'' میں نے استفسار کیا۔

''بہت کی کامیاب!'' میں نے بتایا۔

''امانت علی بھی وارث سے ملنے تھانے پہنچا تھا۔'' نوید عثمانی نے بتایا۔ ''لیکن تھانے والوں نے اسے بیٹے سے ملنے نہیں دیا۔''

میں نے کہا۔ ''تھانے والوں کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عموماً وہ ملزم کے والی وارثوں سے بڑی خوش دلی سے ملتے ہیں اور انہیں ملزم سے بھی ملوانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیتے تاکہ ''پیدا'' کی کوئی راہ نکال لی جائے...... وکیل اور ملزم کی ملاقات کرواتے ہوئے ان کی جان نکلتی ہے...... مگر آپ تو اُلٹی ہی بات بتا رہے ہیں۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''کیا آپ بھی امانت علی کے ساتھ تھانے گئے تھے؟''

''نہیں، وہ اکیلا ہی گیا تھا۔'' عثمانی نے جواب دیا۔

''امانت علی کا قیام کہاں ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

اس نے بتایا۔ ''فی الحال تو وہ کینٹ اسٹیشن پر، ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے گفتگو کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔ ''آپ امانت علی کو کل کسی وقت میرے دفتر بھیج دیں۔ میں اس سے ضروری ملاقات کرلوں گا اور اپنے ساتھ لے جا کر اُسے وارث علی سے بھی ملوادوں گا۔''

نوید عثمانی نے بڑے بھرپور الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے ''اللہ حافظ'' کر کے فون بند کر دیا۔

آئندہ روز شام کے وقت امانت علی میرے دفتر میں موجود تھا...... امانت علی کی عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ بھاری جثے کا مالک ایک صحت مند شخص تھا۔ جسم کی بناوٹ اور ڈھال سے اندازہ ہوتا تھا اس نے جوانی اور ادھیڑ عمری میں خاصی کسرت کر رکھی تھی۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں کہا۔

''وکیل صاحب! میں تو رات ہی کو آپ سے ملنے کے لئے آنا چاہتا تھا لیکن عثمانی صاحب نے صاف انکار کر دیا اور تاکید کی کہ میں اس وقت آپ سے ملاقات کروں تو زیادہ بہتر ہوگا۔''

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''ہاں...... اس سلسلے میں رات ہی عثمانی صاحب سے میری بات ہوگئی تھی۔''

پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی اس تجویز یا مشورے کی افادیت سے آگاہ کیا۔ وہ پوری توجہ سے میری بات سنتا رہا اور میرے خاموش ہونے پر بولا۔

''وکیل صاحب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ سب کیسے ہو گیا؟ میں کسی بھی قیمت پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ وارث کوئی ایسا قدم بھی اٹھا سکتا ہے جس سے میری ناک کٹنے کا کوئی اندیشہ ہو۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا، پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

''اللہ کا بڑا کرم ہے وکیل صاحب! اس نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے۔ عزت، دولت، اولاد اور زمین........ بہت کچھ ہے میرے پاس۔ میں کوئی بہت بڑا زمیندار تو نہیں ہوں لیکن جتنا بھی ہے، بڑی شان بان سے زندگی گزر رہی ہے۔ میں نے اپنی اولاد کی تربیت ایسی نہیں کی کہ وہ مجرمانہ کاموں میں ملوث ہو کر میری عزت کو رولتے رہیں۔ ضرور کسی سازش کے تحت وارث کو اس معاملے میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

اس کی باتیں سن کر میرے اندر تجسس جاگا کہ میں اس کے خانگی حالات کے بارے میں جانوں۔ جب سے مجھے پتہ چلا تھا کہ وارث علی ایک زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، یہ سوال مسلسل میرے ذہن میں کرید رہا تھا کہ اسے صادق آباد سے کراچی آ کر اس قسم کی نوکری کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ....زمیندار گھرانے کے افراد عموماً کھیتی باڑی ہی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وارث علی کا طرزِ عمل عام ڈگر سے خاصا ہٹا ہوا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں جب امانت علی سے استفسار کیا تو جواب دینے سے پہلے اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی پھر مناسب الفاظ میں مجھے بتانے لگا۔

''بات دراصل یہ ہے وکیل صاحب! کہ وارث اپنے دوسرے بہن بھائیوں سے بہت مختلف ہے۔ میری چار اولادیں ہیں۔ دیانت علی، وارث علی، نغمہ اور صداقت علی۔ دیانت علی سب سے بڑا ہے۔ پھر وارث اور نغمہ کا نمبر آتا ہے اور صداقت علی سب سے چھوٹا ہے۔ دیانت اور نغمہ شادی شدہ ہیں۔ صداقت کی عمر پچیس سال ہو چکی ہے لیکن اس کی شادی محض وارث کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔ وارث، صداقت سے دو سال بڑا ہے۔ بڑے بھائی کی شادی ہو تو پھر چھوٹے کا نمبر آئے نا۔ مگر وارث........'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بندہ شادی کے لئے تیار ہی نہیں ہوتا۔''

میں نے چونک کر امانت علی کی طرف دیکھا، پھر پوچھا۔ ''کیا اس کے آمادہ نہ ہونے کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی پھر چند لمحات کی خاموشی کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ''دیانت اور صداقت زیادہ تعلیم حاصل نہیں کر سکے اور میری طرح ان کا رجحان بھی کاشت کاری کی طرف ہے۔ وہ دونوں اس کام میں میرا بھرپور ہاتھ بٹاتے ہیں۔ لیکن وارث کو

اپنا آبائی پیشہ ذرا پسند نہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ دوسرے بھائیوں کی بہ نسبت اس نے کچھ زیادہ لکھ پڑھ لیا ہے۔''

میں چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا، پھر پوچھا۔ ''وارث نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے؟''

''ماشاء اللہ، چودہ جماعتیں پاس ہے۔'' اس نے فخریہ انداز میں بتایا۔ ''وہ کیا کہتے ہیں........اُس نے بی اے کر رکھا ہے۔''

میں نے محسوس کیا تھا، وہ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لہٰذا مجھے بھی کرید ہو گئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''امانت صاحب! یہ بات تو چلو، سمجھ میں آتی ہے کہ وارث اپنے علاقے کے لحاظ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کھیتی باڑی میں دلچسپی نہ رکھتا ہو۔ وہ گاؤں کی بجائے شہر کی زندگی کو زیادہ پسند کرتا ہو۔ وہ کوئی باعزت ملازمت یا کوئی کاروبار کرنے کا ارادہ رکھتا ہو........''

میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن ان تمام باتوں یا حالات کا اس کے، شادی کے لئے آمادہ نہ ہونے سے کیا تعلق ہے؟ آپ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے؟''

وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''ہمارے بڑے کہا کرتے تھے جناب! کہ ایک ماہر اور تجربہ کار ڈاکٹر سے مرض، وکیل سے جرم اور دائی سے پیٹ کو چھپایا نہیں جا سکتا اور آپ کے اس سوال سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ اپنے شعبے میں بہت کامیاب ہیں۔ آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔''

''اچھا!'' میں نے دلچسپ نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اگر میرا اندازہ سولہ آنے صحیح ہے تو پھر آپ خود ہی بتا دیں........مجھ سے کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں؟''

وہ ایک دم اُداس اور خاموش ہو گیا۔ میں بدستور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بوجھل آواز میں گویا ہوا۔ ''جناب بیگ صاحب! وارث کے شادی کے لئے آمادہ نہ ہونے کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے........ بلکہ تھی، شہناز!'' اتنا کہہ کر وہ ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گیا۔

میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ گویا شہناز کی آمد سے کہانی میں ایک نیا اور سنسنی خیز ٹوئسٹ آنے والا تھا۔ میں خاموش بیٹھا منتظر نظر سے امانت علی کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس نے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرایا اور وضاحت کرتے ہوئے بتانے لگا۔

''دراصل، شہناز کی موت نے وارث کو توڑ کر رکھ دیا ہے۔ کچھ عرصہ تک تو اس کی دیوانوں جیسی حالت ہو گئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے سنبھل گیا۔ تاہم اس سنبھلنے کے ساتھ ہی اس نے یہ اٹل فیصلہ بھی سنا دیا کہ وہ زندگی بھر شادی نہیں کرے گا۔''

''کیا وارث علی شہناز نامی اس لڑکی سے محبت کرتا تھا؟'' میں نے ایک نتیجے پر پہنچنے کے بعد اس سے سوال کیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ''جی ہاں........شہناز اُس کی تایا زاد تھی۔''

''شہناز کی موت کیسے واقع ہوئی؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اُس نے بتایا۔ ''بس، اس کی موت آئی تھی۔ وہ مر گئی........ہیضہ بہانہ بن گیا۔ دو سال پہلے گرمیوں کے موسم میں بیٹھے بٹھائے اسے ہیضہ ہو گیا اور وہ زندگی ہار گئی۔''

اس وضاحت کے بعد وارث علی کا کیس کھل کر میرے سامنے آ گیا۔ وہ اپنے دل پر محبوبہ کی ابدی جدائی کا گہرا زخم کھائے بیٹھا تھا اور شاید اسی لئے وہ صادق آباد کو چھوڑ کر کراچی آ گیا تھا۔ میں نے اس بارے میں امانت علی سے پوچھا تو اس نے بتایا۔

''چھ سات ماہ پہلے وہ چپ چپاتے گھر سے غائب ہو گیا تھا۔ ہم نے بہت تلاش کیا لیکن اس کی کوئی خبر نہ ملی۔ پھر تین روز کے بعد اس نے خود ہی ہم سے رابطہ کیا اور بتایا کہ وہ کراچی میں ہے اور بالکل خیر و عافیت سے ہے۔ عنقریب اسے نوکری مل جائے گی اور وہ انشاء اللہ بہت جلد ہم سے ملنے صادق آباد آئے گا۔ اس نے فون پر ہمیں اپنی خیریت کی اطلاع دی تھی اور اپنے ایڈریس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اس لئے ہم اس کے پاس آ سکے اور نہ ہی اسے واپس لے جانے کی کوشش کر سکے۔ وہ خود ہی مہینے، ڈیڑھ مہینے میں ہمیں فون کر دیتا تھا۔ ہمارے گھر میں ٹیلی فون کی سہولت موجود نہیں۔ بازار میں وارث کے ایک دوست کی کتابوں، کاپیوں کی دکان ہے۔ وہاں فون لگا ہوا ہے۔ یہ ہمیں وہیں فون کیا کرتا تھا۔ ہمیں اس کا فون سننے کے لئے گاؤں سے دو میل کا فاصلہ طے کر کے شہر کی اس دکان تک آنا پڑتا۔ فون کے وقت اور دن کے بارے میں وہ اپنے دوست کو پیشگی بتا دیا کرتا تھا۔ کل عثمانی صاحب نے بھی وہیں فون کر کے مجھے اس واقعے کی اطلاع دی ہے۔'' وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوا، پھر غم زدہ آواز میں بولا۔ ''ہمیں کیا پتہ تھا، وہ کراچی میں رہتے ہوئے اتنی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا۔''

''مصیبتیں اور پریشانیاں انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ آتی جاتی رہتی ہیں۔ لہٰذا زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔ وارث بھی انشاء اللہ اس پھیر سے نکل

آ ئے گا۔"

اس کے چہرے پر اُمید کی شمع روشن ہو گئی۔ میں نے اسے وارث کی کراچی والی زندگی کے بارے میں مختصراً آگاہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ ہماری پہلی ملاقات کب اور کن حالات میں ہوئی تھی۔ اس بات کا اسے بڑا قلق تھا کہ پولیس والوں نے بیٹے سے ملنے نہیں دیا تھا۔ میں نے حتیٰ الوسع اس کی دلجوئی کی اور کہا کہ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں اسے اپنے ساتھ لے کر تھانے جاؤں گا اور انشاء اللہ وارث سے ملاقات بھی کروا دوں گا۔ وہ خاصا مطمئن دکھائی دینے لگا۔ اُس نے متاملانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔

"میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ وارث کسی قسم کے جرم میں ملوث نہیں ہو سکتا۔ آپ اس سے تھانے جا کر ملاقات کر چکے ہیں اور یہاں کے حالات کو مجھ سے کہیں زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، میرے بیٹے کو اس معاملے میں خوامخواہ پھنسانے کی کوشش نہیں کی جا رہی؟"

"میں آپ کے خیال سے اتفاق کرتا ہوں امانت صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "مگر میرے اور آپ کے ایسا سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ معاملہ پولیس اور پولیس کے آگے عدالت تک رسائی حاصل کر چکا ہے۔ میری معلومات کے مطابق پولیس نے آج صبح وارث کو عدالت میں پیش کر کے سات دن کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔ وہ اس دوران کیس کی تفتیش کریں گے، وارث سے اقبالِ جرم کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ پھر ایک ہفتے کے بعد پولیس عدالت میں چالان یعنی اپنی تفتیشی رپورٹ پیش کر دے گی۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے وہ عدالت ہی میں ہو گا۔ وارث کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت اور مضبوط دلائل کا سہارا لینا پڑے گا پھر کہیں جا کر بات بنے گی۔"

"بیگ صاحب! اس سلسلے میں سارا زور آپ ہی کو مارنا ہو گا" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "خرچے وغیرہ کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔ اس سلسلے میں آپ مجھے پیچھے نہیں پائیں گے۔ اللہ نے مجھے ہر نعمت سے نواز رکھا ہے۔ میں اپنے بیٹے کو ہر حال میں باعزت بری ہوتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ چاہے اس کے لئے کتنی بھی رقم کیوں نہ خرچ ہو جائے۔"

"میں فضول اور بے کار میں آپ کا ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہونے دوں گا۔" میں نے بیٹے کے لئے اس کے جذبات کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو صرف میری فیس ادا کرنا ہو گی۔ علاوہ ازیں، عدالت کا جو بھی خرچہ ہو گا وہ میں آپ کے ہاتھ ہی سے کراؤں گا۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔"

وہ اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "عثمانی صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ

آپ بہت بڑے وکیل ہیں اور خاصی اونچی فیس لیتے ہیں۔ میں نے گھر سے نکلتے ہوئے کچھ رقم جیب میں ڈال لی تھی کہ پتہ نہیں، کس مرحلے پر کون سی ضرورت پیش آجائے۔'' وہ لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب! سب سے پہلے تو میں آپ کی فیس ادا کروں گا۔ باقی خرچے بعد میں دیکھے جائیں گے۔ حکم کریں بیگ صاحب! فیس کی مد میں کتنی رقم پیش کروں؟''

وہ ایک کھاتی پیتی اور آسودہ حال پارٹی تھی لہٰذا میں نے کسی قسم کی بھی رعایت کو یکسر فراموش کرتے ہوئے امانت علی کو اپنی فیس کے بارے میں بتادیا۔

اس نے مطمئن انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اور میری بتائی ہوئی فیس کی رقم کے حساب سے کرنسی نوٹ گن کر میری طرف بڑھادیئے۔ میں نے گنے بغیر وہ رقم اس سے لے کر اپنی میز کی دراز میں ڈال دی۔ اُس نے متذبذب نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''وکیل صاحب! آپ رقم کو اپنے ہاتھوں سے گن لیتے تو مجھے تسلی ہو جاتی۔''

''اس سلسلے میں آپ بالکل تسلی رکھیں امانت صاحب!'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے ساتھ ساتھ میں نے بھی یہ نوٹ گن لئے تھے اور میں آپ کی گنتی سے بالکل مطمئن ہوں۔''

''آخر ایک وکیل ہیں نا'' وہ تعریفی انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک تجربہ کار وکیل کی نگاہ کو ایسا ہی عقابی ہونا چاہئے۔''

میں نے اس کے تبصرے پر محض مسکرانا ضروری سمجھا اور فیس کے ذیل میں لی جانے والی رقم کے لئے میں نے اُسے ایک رسید بنادی۔ یہ ایک چھوٹی سی کاغذی کارروائی یا یوں کہہ لیں، خانہ پُری تھی۔ لیکن میں اس کو بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ بعض اوقات معمولی سے معمولی شے کی رسید بھی بہت کام آجاتی ہے۔ آپ کو بھی میں یہی مشورہ بلکہ نصیحت کروں گا کہ جب بھی کوئی چیز خریدیں یا کہیں بھی رقم کا لین دین کریں تو اس کی رسید ضرور حاصل کریں۔ اس طرح آپ بہت سی پریشانیوں سے پیشگی بچ جائیں گے۔

امانت علی نے رسید کو جیب میں منتقل کرنے کے بعد کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ ریمانڈ کی مدت کے دوران پولیس وارث سے اقبالِ جرم کرانے کی کوشش بھی کرے گی۔ اگر میں کچھ رقم وہاں بھی خرچ کروں تو کیا اس سے وارث کو کوئی آسانی فراہم ہوسکتی ہے؟''

''میں آپ کو اس کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''پولیس کی سختی اور تشدد سے محفوظ رہنے کے لئے میں نے وارث کو چند گر سمجھا دیئے ہیں۔ مجھے اُمید ہے

وہ انہیں مناسب موقع پر سلیقے سے استعمال کر لے گا۔ اور جہاں تک پولیس کی مٹھی گرم کرنے کا تعلق ہے تو ایسا کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ رقم تو وہ راضی خوشی پکڑ لیں گے اور اس بات کا بھی یقین دلا دیں گے کہ وہ آپ کی بہت مدد کریں گے مگر یاد رکھیں، ہونا ہوانا کچھ نہیں ہے۔ وہ وہی کریں گے جو انہوں نے طے کر رکھا ہے۔ ویسے آپ کی مرضی ہے۔''

''نہیں جناب! میں آپ کے مشورے کے بغیر ایک پیسہ بھی کہیں خرچ نہیں کروں گا۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''ان پولیس والوں کا واقعی کوئی اعتبار نہیں۔''

مزید ایک دو اہم باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا۔'' آپ انتظار گاہ میں آرام سے بیٹھیں۔ میں دیگر کلائنٹس سے فارغ ہو جاؤں تو پھر ہم وارث سے ملاقات کے لئے تھانے جائیں گے۔''

وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد چیمبر سے نکل گیا۔

اس روز دفتر بند کرنے کے بعد میں نے امانت علی کو بھی اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا لیا۔ نازنین کو اس کے گھر کے قریب ڈراپ کرنے کے بعد میں نے گاڑی کا رخ تبدیل کیا اور متعلقہ تھانے کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے اپنے ذرائع اور مخصوص طریقۂ کار استعمال کرتے ہوئے ان باپ بیٹے کے لئے لگ بھگ آدھے گھنٹے کی ملاقات کا موقع پیدا کر دیا۔ انہوں نے جی بھر کر باتیں کیں۔ اس دوران میں تھانہ انچارج کے کمرے میں بیٹھا اُسے گھسنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ خاصا تجربہ کار اور جہاندیدہ پولیس والا تھا۔ وہ بڑی خوب صورتی سے میرے سوالات کو اِدھر اُدھر ٹالتا رہا۔ میں سمجھ گیا، وہ میری کسی چال میں قدم رکھ کر منہ سے کوئی بھی ایسا لفظ نہیں نکالے گا جو کسی بھی طور میرے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہو!

امانت علی اپنے بیٹے سے ملاقات کر کے فارغ ہوا تو بہت خوش تھا اور اس ملاقات کے لئے مجھے بہت دعائیں بھی دے رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

'' آپ بتائیں، مجھے کیا کرنا چاہئے؟'' اُس نے اُلٹا مجھ ہی سے سوال کر ڈالا۔

میں نے کہا۔''نوید عثمانی کی زبانی مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کینٹ اسٹیشن پر کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کیا کراچی میں آپ کا کوئی عزیز رشتے دار نہیں ہے؟''

اُس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔''اتفاق سے نہیں۔''

میں نے کہا۔''پھر میرا مشورہ تو یہی ہے کہ آپ واپس صادق آباد چلے جائیں۔ جس دن

پولیس نے وارث کو عدالت میں پیش کرنا ہے اس سے ایک روز پہلے کراچی آ جائیں۔''
میری تجویز اسے پسند آئی۔ اُس نے میرا پُر جوش شکریہ ادا کیا اور مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔ اور میں نے اپنی گاڑی کو گھر کی سمت موڑ لیا۔

***

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔
اس پیشی پر میں نے اپنے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزم کی درخواست ضمانت بھی عدالت میں دائر کر دی اور عدالتی کارروائی کا آغاز ہوتے ہی میں نے اپنے مؤکل کی ضمانت کے لئے دلائل دینا شروع کر دیئے لیکن میری یہ کوشش ناکام رہی۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے اور اس قتل کے ساتھ تو ''مجرمانہ حملے'' کا دم چھلا بھی فٹ تھا۔ لہٰذا ملزم وارث علی کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔
اس پیشی پر ملزم کا باپ امانت علی بھی عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ جب اس نے اپنے بیٹے کی ضمانت کو نامنظور ہوتے دیکھا تو وہ قدرے مایوس ہوا۔ عدالت سے باہر آنے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔
''بیگ صاحب! میں تو اچھی خاصی رقم کا بندوبست کر کے آیا تھا۔ اگر ذاتی مچلکے پر وارث کی ضمانت ہو جاتی تو کتنا ہی اچھا ہوتا!''
میں نے کہا۔ ''یقیناً، بہت اچھا ہوتا۔ لیکن اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ یہ کوئی عام دنگا فساد یا چوری چکاری کا کیس نہیں ہے۔ قتل کے کیس میں عموماً ذاتی مچلکے اور شخصی ضمانت وغیرہ سب کچھ فیل ہو جاتا ہے...... اور ہمارے کیس میں تو قتل کے الزام کے ساتھ ساتھ وارث علی پر مجرمانہ حملے کی پخ بھی لگی ہوئی ہے جس نے اس کیس کی سنگینی کو بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ آپ حوصلہ نہ ہاریں۔ میں نے اس ایک ہفتے میں کیس کو بڑی باریک بینی سے اسٹڈی کر لیا ہے اور اپنی ڈوریاں ہلا کر اِدھر اُدھر سے بہت ساری مفید معلومات بھی جمع کر لی ہیں۔ انشاء اللہ! جب کیس کی باقاعدہ سماعت ہو گی تو میری یہ محنت آپ کی نگاہ سے چھپی نہیں رہ سکے گی۔ میں اپنے کام سے کلی طور پر مطمئن ہوں۔''
''آپ کا اطمینان میری تسلی کے لئے کافی ہے بیگ صاحب!'' اس نے پُر امید انداز میں کہا۔
میں نے اُسے اس کیس کے اہم نشیب و فراز کے بارے میں چند مفید زاویوں سے آگاہ کیا اور تسلی دلاسا دے کر صادق آباد روانہ کر دیا۔ آئندہ پیشی پندرہ روز کے بعد تھی۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کی خدمت میں اس کیس کی چند اہم اور بنیادی باتیں پیش کر دوں تاکہ عدالتی کارروائی کے دوران آپ کا ذہن کسی اُلجھن کا شکار نہ ہو۔ اس میں زیادہ قابلِ ذکر پولیس کی رپورٹ یعنی استغاثہ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نیلوفر کی موت چار جنوری کی رات آٹھ سے نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب سانس کی آمد شد کا منقطع ہونا بتایا گیا تھا۔ اس بات پر بڑے واضح انداز میں زور دیا گیا تھا کہ مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا اور اسے قتل کرنے سے پہلے مجرمانہ حملے سے بھی گزارا گیا تھا۔ مقتولہ کے مختلف ٹیسٹ اس امر کا ثبوت فراہم کرتے تھے کہ اس کے ساتھ پہلے زیادتی کی گئی، پھر گلا گھونٹ کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا گیا۔

پولیس کی جانب سے استغاثہ کی جو رپورٹ عدالت میں پیش کی گئی، اس کی رو سے میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم وارث علی کو عبرت ناک سزا دلوانے کا پکا پکا انتظام کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق، وقوعہ کے روز اتفاق سے مقتولہ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کا شوہر موجود نہیں تھا۔ وہ دونوں میاں بیوی اس بنگلے میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ملازمین کے نام پر دو افراد اس بنگلے میں کام کرتے تھے جن میں سے ایک کا نام سلیمہ بی بی اور دوسرے کا نام سلطان تھا۔

سلیمہ روزانہ صبح دس بجے کام کاج کے لئے بنگلے پر آتی اور شام کو چھ، ساڑھے چھ بجے چھٹی کر کے اپنے گھر چلی جاتی تھی۔ اس کی رہائش دھوراجی سے متصل ایک بستی میں تھی۔ وہ اس بنگلے پر مختلف نوعیت کی ڈیوٹی کرتی جس میں صفائی ستھرائی، جھاڑو پونچھا اور کپڑے وغیرہ دھونا سب شامل تھا۔ علاوہ ازیں وہ کھانا پکانے میں مقتولہ نیلوفر کی مدد بھی کر دیا کرتی تھی۔

سلطان بنیادی طور پر اس بنگلے کا چوکیدار تھا۔ اسے ڈرائیونگ بھی آتی تھی۔ لیکن مالکان اُس کی اس صلاحیت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے۔ پتہ نہیں اُنہیں اُس کی ڈرائیوری پر بھروسہ نہیں تھا یا اُنہیں کسی ڈرائیور کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بہر حال، وہ اس سے گاڑی چلانے کا کام نہیں لیتے تھے۔ سلطان سکھر کا رہنے والا تھا اور کراچی میں اُس کی رہائش اسی بنگلے کے پچھواڑے بنے ہوئے ایک کمرے کے چھوٹے سے کوارٹر میں تھی۔

وقوعہ کے روز سلطان بنگلے کے گیٹ پر اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا کہ ملزم وہاں پہنچا اور اس سے کہا کہ وہ سیٹھ صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ سلطان نے اُسے بتایا کہ سیٹھ صاحب تو اس وقت بنگلے میں موجود نہیں ہیں۔ ملزم بولا۔ ”بیگم صاحبہ تو ہوں گی؟“

اس سوال پر سلطان نے چونک کر ملزم کی طرف دیکھا اور پوچھا، وہ کون ہے؟ اور کس کام سے وہ سیٹھ صاحب یا میڈم سے ملنے آیا ہے؟ جواب میں ملزم نے اُسے اپنا وزیٹنگ کارڈ تھماتے ہوئے کہا۔ ''آپ میرا کارڈ اندر لے جاؤ، اُنہیں بلانا ہوگا تو بلا لیں گے۔''

چنانچہ سلطان نے اسے گیٹ پر ہی رُکنے کو کہا اور اس کا کارڈ لے کر بنگلے کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ اُس نے مذکورہ کارڈ میڈم نیلوفر کو دکھایا اور ملزم کے بارے میں بتایا۔ میڈم نے کارڈ پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور سلطان سے کہا کہ وہ ملزم کو ڈرائنگ روم میں بٹھائے۔ گویا میڈم نیلوفر نے ملزم سے ملاقات پر آمادگی ظاہر کر دی تھی۔

سلطان واپس گیٹ پر آیا اور ملزم کو میڈم کے فیصلہ نما حکم کے بارے میں بتایا۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ لے کر ڈرائنگ روم تک پہنچا۔ ملزم کو ڈرائنگ روم میں چھوڑنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر اپنی ڈیوٹی سنبھالنے گیٹ پر آ گیا۔

سلطان کے مطابق، ملزم لگ بھگ آدھا گھنٹہ بنگلے کے اندر میڈم نیلوفر سے ملاقات میں مصروف رہا۔ اس دوران اس نے اندر جا کر یہ جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ ملزم وہاں کس مقصد سے آیا تھا اور میڈم نیلوفر سے اس کی کس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اُس کے مالکان اس بات کو قطعاً پسند نہیں کرتے تھے کہ جب وہ کسی کے ساتھ بیٹھے، بات چیت کر رہے ہوں تو ملازمین میں سے کوئی وہاں منڈلاتا ہوا دکھائی دے۔ بہرحال، جب ملزم وہاں سے رخصت ہو گیا تو وہ سن گن کے لئے بنگلے کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔

ڈرائنگ روم خالی پڑا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی ملاقات نہ ہوئی ہو۔ اس مشاہدے نے سلطان کے تجسس کو اور بڑھا دیا اور وہ دبے قدموں آگے بڑھتا چلا گیا۔ وہاں طاری سناٹے سے یوں لگتا تھا، سلطان کے سوا اس بنگلے میں اور کوئی موجود نہ ہو۔ اُس کے ذہن میں ایک خطرناک سوال نے سر اُٹھایا...... میڈم نیلوفر کہاں چلی گئیں؟

اس سوال نے اُسے حد سے زیادہ بے احتیاط کر دیا اور وہ میڈم کی تلاش میں آگے ہی آگے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ پھر جب اس کی نگاہ نے بیڈ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے کمرے کے اندر رسائی حاصل کی تو وہ ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ اُس پر تو گویا حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا جس میں بے یقینی کی کئی چٹانیں بھی شامل تھیں۔

بیڈ روم کی لائٹ جل رہی تھی اور اُس نے روشن بیڈ روم میں جو منظر دیکھا وہ اس کا دماغ چکرانے کے لئے کافی تھا۔ میڈم نیلوفر بیڈ کے عین وسط میں بکھری پڑی تھی۔ اُس کی بے پردگی کو دیکھ کر کوئی عقل کا اندھا بھی یہ اندازہ قائم کر سکتا تھا کہ وہاں کیا واقعہ پیش آیا ہوگا۔

نیلوفر کی حلقوں سے اُبلی ہوئی آنکھوں نے سلطان کو یہ بھی بتا دیا کہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تھی۔

چند لمحات تک وہ وہیں مبہوت کھڑا یہ عبرت ناک منظر دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔ ملزم تھوڑی دیر پہلے بنگلے سے رخصت ہوا تھا۔ سلطان آناً فاناً مین گیٹ سے باہر نکلا اور متلاشی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے ملزم کہیں بھی نظر نہ آیا۔ وہ ملزم کی تلاش میں بے ساختہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ لیکن دس منٹ کی تلاش بسیار کے بعد بھی جب اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے فوراً سیٹھ صاحب کو فون کرنا چاہئے۔

وہ پلٹ کر واپس بنگلے میں آیا اور وہاں سے اپنے مالک فرید عباس کو فون کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اس کا رابطہ سیٹھ کے دفتر سے ہو گیا اور اُسے بتایا گیا کہ فرید عباس گھر جانے کے لئے دفتر سے نکل چکا ہے۔ اُس نے فون رکھ دیا۔ اب فرید عباس کے انتظار کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔

اسے زیادہ دیر تک فرید عباس کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ بنگلے کے اندرونی حصے میں سے نکل کر جیسے ہی گیٹ پر پہنچا، فرید عباس اپنی گاڑی میں وہاں پہنچ گیا۔ اسی لمحے گھریلو ملازمہ سلیمہ بی بی بھی ایک جانب سے نمودار ہوئی۔ وہ اپنے وقت پر چھٹی کر کے گھر جا چکی تھی۔ پتہ نہیں، واپس کیا لینے آئی تھی!

سلطان نے سلیمہ کو نظر انداز کرتے ہوئے، وہیں گیٹ پر ''کھڑے کھڑے'' گھبراہٹ آمیز انداز میں فرید عباس کو آگاہ کیا کہ وہاں کس نوعیت کا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ اُس کی بات سننے کے بعد فرید نے اُسے ڈانٹ پلائی اور بڑی سرعت سے بنگلے کے اندر داخل ہو گیا۔

جب اس نے خواب گاہ میں قدم رکھا تو صورتِ حال اس پر عیاں ہو گئی۔

بڑی افراتفری میں اس نے سلطان کے ساتھ مل کر بیڈ روم اور ڈرائنگ روم کو چھان ڈالا۔ اس کوشش کے نتیجے میں وہ ڈرائنگ روم کی سینٹرل ٹیبل پر سے وہ وزیٹنگ کارڈ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا جو ملزم نے بنگلے کے اندر داخل ہونے کے لئے استعمال کیا تھا۔ وہ کارڈ کو ہاتھ میں تھامے تھامے ٹیلی فون سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''اسٹار انٹر پرائزز'' نامی اس مارکیٹنگ کمپنی کے کارڈ پر دو فون نمبر درج تھے۔ فرید عباس نے باری باری دونوں نمبروں کو ٹرائی کیا۔ ایک نمبر بزی ملا جبکہ دوسرے نمبر پر اس طرف سے فون اٹھا لیا گیا۔ فرید عباس نے دھاڑ سے مشابہہ لہجے میں کہا:

''فیلڈ آفیسر وارث علی سے بات کروائیں۔''
''وہ تو جناب! چھٹی کر کے گھر جا چکا ہے۔'' دوسری طرف سے بولنے والے نے بتایا۔
''اُس نامراد کا گھر کہاں ہے؟'' فرید عباس نے برہمی سے پوچھا۔
''قیوم آباد میں۔'' اُسے بتایا گیا۔
''گھر کا پتہ اور لوکیشن وغیرہ بتائیں؟''
اُس کے سوال کا جواب دے دیا گیا تو اُس نے دوسری طرف سے بولنے والے کا نام دریافت کرلیا۔ اُس شخص نے اپنا نام بتاتے ہوئے فرید عباس سے پوچھ لیا۔
''میں مرتضیٰ بات کر رہا ہوں......آپ کون ہیں؟ اور وارث علی کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہیں؟''
''میں اس کا باپ ہوں۔'' فرید عباس نے یہ کہتے ہوئے کریڈل دبا کر لائن منقطع کر دی۔
دوسرا فون اس نے اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن کو کیا اور انہیں اپنے بنگلے پر پیش آنے والے اندوہ ناک اور بربریت آمیز واقعے کے بارے میں تفصیلاً بتایا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک سب انسپکٹر دو کانسٹیبلوں کے ساتھ اس کے بنگلے پر پہنچ گیا اور وہ لوگ موقع کی کارروائی میں مصروف ہو گئے۔
اسی دوران فرید عباس نے پولیس والوں کو وارث علی کی وہاں آمد کے بارے میں بتایا اور اس سلسلے میں اس نے ''اسٹار انٹر پرائزز'' کو فون کر کے جو کارنامہ انجام دیا تھا اس سے بھی پولیس کو آگاہ کر دیا۔ جب پولیس کو وارث کی رہائش گاہ کا علم ہو گیا تو انہوں نے چھاپہ مار کر رات گیارہ بجے وارث علی کو اس کی قیام گاہ واقع قیوم آباد سے گرفتار کرلیا جہاں وہ سلیم احمد اور نثار حسین کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔
اس کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ ابتدائی صفحات میں بیان کئے جا چکے ہیں۔

***

دو تین پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں۔ یہ ابتدائی کارروائی اتنی بور اور خشک ہوتی ہے کہ اسے ان صفحات میں بیان کر کے آپ کا قیمتی وقت اور صفحات کو ضائع کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا یہاں سے ''کٹ'' کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے ہیں۔
عدالت کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز کوئی تین ماہ بعد ہوا۔ ان دنوں موسمِ بہار شروع ہو چکا تھا اور فضا میں بڑی رومان پرور خوشگواریت رچی بسی محسوس ہوتی تھی۔ کراچی میں ایسا دل دار موسم نہایت ہی مختصر وقفے کے لئے آتا ہے اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ کب آیا اور کب رخصت

ہو گیا۔

جج اپنی مخصوص نشست پر براجمان ہو چکا تو اس نے تنقیدی نگاہ سے حاضرینِ عدالت کا جائزہ لیا۔ دونوں طرف کے تمام متعلقہ افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ اس نے اطمینان بھرے انداز میں گردن کو اثباتی جنبش دی اور باقاعدہ کارروائی کا آغاز کر دیا۔

سب سے پہلے جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔

میرے مؤکل نے نہایت ہی اعتماد کے ساتھ صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا۔ بیان کی تکمیل پر وکیلِ استغاثہ نے اُس پر کڑی جرح کی لیکن وارث علی نے بڑے اعتماد سے ڈٹ کر وکیلِ مخالف کے سوالات کا سامنا کیا اور نہایت ہی نپے تلے انداز میں جوابات دیئے۔ اس ''امتحان'' کے لئے میں نے اُسے اچھی خاصی ''تیاری'' کرا رکھی تھی۔ میں یہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ بہ عین میری ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔

وکیلِ استغاثہ کی جرح موقوف ہوئی تو استغاثہ کے گواہوں کی باری آئی۔ استغاثہ کی طرف سے آٹھ گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر ان میں سے اہم گواہوں کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح کا ہی احوال بیان کروں گا۔

میری فرمائش پر سب سے پہلے اس کیس کے انکوائری آفیسر کو کٹہرے میں بلایا گیا۔ انکوائری آفیسر یعنی آئی او کی حیثیت کسی بھی کیس میں استغاثہ کے ایک گواہ جیسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا ہوتا ہے۔ اس کیس کا تفتیشی یا انکوائری آفیسر رینک کے اعتبار سے ایک سب انسپکٹر تھا۔ اُس کا نام اللہ شیر خان تھا۔

وہ وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں اس کے قریب چلا گیا پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ایک غیر متعلق سوال کیا۔ ''آئی او صاحب! آپ کا نام کچھ عجیب سا نہیں ہے؟''

وہ پہلے ہی قدم پر بدک گیا، بولا۔ ''کیا عجیب ہے؟''

یہ میرا مخصوص طریقۂ واردات ہے۔ میں اپنے مخالف دھڑے کے گواہوں سے ایسے ہی اُلٹے سیدھے ایک دو غیر متعلق سوالات کر کے انہیں ڈسٹرب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ بعد ازاں میری یہ کوشش بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ آپ اسے میرا ایک آزمودہ ہتھیار سمجھ لیں۔

میرا سوال سنتے ہی انکوائری آفیسر اچانک برہم ہو گیا تھا۔

میں نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''آئی او صاحب! آپ میری بات کا برا نہ مانئے گا۔ ویسے عام طور پر شیر اللہ نام سننے اور دیکھنے میں تو آیا ہے مگر یہ...... اللہ شیر کچھ اُلٹا

اور عجیب سا نہیں ہو گیا؟''

وہ اپنی برہمی کو برقرار رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ نام میرے دادا جان نے رکھا تھا۔ مجھے یہ بہت عزیز ہے۔ آپ کو اُلٹا نظر آ رہا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟''

''نہیں......کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔ ''کم از کم مجھے تو بالکل فرق نہیں پڑتا۔''

سب انسپکٹر اللہ شیر خان ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھورنے لگا۔

وکیلِ استغاثہ ہو یا انکوائری آفیسر، یہ ہمیشہ ڈیفنس کونسلر (وکیلِ صفائی) کے خلاف ہوتے ہیں۔ لہٰذا وکیلِ صفائی کے کہے ہوئے کسی سیدھے سادھے جملے کو بھی یہ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس میں مخالفانہ معانی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کیس میں، میں وکیلِ صفائی کا کردار ادا کر رہا تھا۔ لہٰذا اس کا معاندانہ رویہ سمجھ میں آتا تھا۔

میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''آئی او صاحب! آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب دی گئی تھی؟''

اُس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''چار جنوری کی رات لگ بھگ ساڑھے نو بجے۔''

''اطلاع کنندہ کون تھا؟'' میں نے استفسار کیا۔

اُس نے جواب دیا۔ ''مقتولہ کا شوہر فرید عباس۔ اس نے تھانے فون کر کے ہمیں اس افسوس ناک واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

''ٹھیک دس بجے۔''

''آپ نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی سرگرمی نہیں دکھائی؟''

''جناب! ہم تو ہر سلسلے میں ہمیشہ سرگرمی ہی دکھاتے ہیں۔'' وہ میرے طنز کو خاموشی سے پیتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو آپ جیسے چند مہربانوں نے ہماری ریپوٹیشن کے خلاف بڑھ چڑھ کر بولنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ آپ کی وجہ سے بلاوجہ پولیس ڈیپارٹمنٹ بدنام ہو کر رہ گیا ہے۔''

میں نے اس کی شکایت کو دور کرنا مناسب سمجھا اور معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ نے جو کچھ بیان کیا ہے اگرچہ اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں پھر بھی تہہ دل سے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔''

اس نے میرے لہجے میں شامل مخصوص طنز اور تیکھے پن کو فوراً محسوس کر لیا، جلدی سے

بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو معذرت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقیقت کیا ہے، یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور میں بھی۔''

''آپ نے بڑی خوب صورتی سے انصاف کر دیا۔'' میں نے توصیفی نظر سے اس کی طرف دیکھا، پھر پوچھا۔ ''آپ نے ملزم کو کتنے بجے گرفتار کیا تھا؟''

''جب ہم نے قیوم آباد والے گھر سے اُسے پکڑا، رات کے گیارہ بج رہے تھے۔''

''ملزم کی گرفتاری کے سلسلے میں آپ کی راہ نمائی کس نے کی تھی؟''

''اس بارے میں ہمیں مقتولہ کے شوہر فرید عباس نے بتایا تھا۔''

''فرید عباس کو یہ معلومات ملزم کے دفتر سے حاصل ہوئی تھیں۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے مذکورہ دفتر فون کر کے تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کی...... یا مزید کسی قسم کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی؟''

''یہ بات اور یہ پوائنٹ ہمارے ذہن میں بھی موجود تھا۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے خود ملزم کی کمپنی کے دفتر فون کیا تھا لیکن اس وقت دفتر بند ہو چکا تھا اس لئے کسی نے میرا فون اٹینڈ نہیں کیا۔''

''آپ نے مذکورہ دفتر میں کتنے بجے فون کیا تھا؟''

''لگ بھگ سوا دس بجے۔''

''ٹھیک ہے۔ اس وقت آپ کا کسی سے رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن کیا بعد میں آپ نے کبھی اس دفتر اور ملزم کے ساتھ کام کرنے والوں کو چیک کرنے کی کوشش کی؟''

''جی ہاں......!'' اُس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''ملزم کی گرفتاری کے اگلے روز ہی میں اس کمپنی کے دفتر گیا تھا اور وہاں موجود لوگوں سے ملزم کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی۔ انہی میں سے انور کمال نامی ایک شخص استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔''

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''آئی او صاحب! آپ نے جائے واردات سے فنگر پرنٹس اٹھانے کی کوشش تو ضرور کی ہوگی؟''

''جی ہاں...... ڈرائنگ روم کے مختلف حصوں سے ہمیں ملزم کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔''

میں نے انکوائری آفیسر کو تیز نظروں سے گھورا اور پوچھا۔ ''بیڈ روم کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''بیڈروم میں ہمیں کہیں بھی ملزم کے فنگر پرنٹس حاصل نہیں ہو سکے۔''

میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کے خیال میں مقتولہ نیلوفر کو مجرمانہ حملے کے بعد بیڈروم میں قتل کیا گیا تھا یا پھر ڈرائنگ روم میں؟''

''واقعات و شواہد تو یہی بتاتے ہیں کہ یہ واردات بیڈ روم میں ہوئی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کے باوجود بھی......'' میں نے نکیلے لہجے میں کہا۔ ''آئی او صاحب! بیڈروم کے کسی حصے میں ملزم کے ایف پی (فنگر پرنٹس) ڈھونڈنے میں ناکام رہے۔ یہ کوئی سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔''

''میں سمجھاؤں گا تو یقیناً آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔'' وہ ایک گہری چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''استغاثہ کے ایک معزز گواہ اور مقتولہ کے گھریلو ملازم سلطان نے ہمیں بتایا تھا کہ جب ملزم اس بنگلے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ بریف کیس بھی تھا۔'' وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''عین ممکن ہے، اس بریف کیس میں دستانوں کی ایک جوڑی بھی موجود ہو اور ملزم جب اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لئے ڈرائنگ روم سے بیڈروم کی طرف جانے لگا ہو تو اس نے وہ دستانے اپنے ہاتھوں پر چڑھا لئے ہوں گے۔ تبھی مقتولہ کی گردن پر بھی کسی قسم کی انگلیوں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ یہ ناممکن تو نہیں!''

انکوائری آفیسر نے آخری جملہ اس انداز سے ادا کیا تھا کہ اس کے کئی اپنی مرضی کے معانی نکالے جاسکتے تھے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

''آئی او صاحب! اگر آپ کی پیش کردہ تھیوری کو درست مان لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقتولہ نے ملزم کے جبر کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند کیوں نہیں کی؟ اس وقت ان دونوں کے علاوہ اس بنگلے میں سلطان بھی موجود تھا۔ اگر مقتولہ، ملزم کے عمل کے جواب میں کوئی مزاحمتی ردِ عمل ظاہر کرتی تو یقیناً سلطان کو اس کی خبر ہو جاتی۔ چونکہ ایسا نہیں ہوا اس لئے یہ حیرت کی بات ہے۔''

اس نے ایک لمحہ سوچا اور جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے، ملزم نے مقتولہ کو کوئی ایسی شے سونگھا دی ہو جس کے زیرِ اثر مقتولہ کی مزاحمتی قوت دم توڑ گئی ہو یا اتنی کم ہو گئی ہو کہ ملزم کو با آسانی اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو گئی۔''

''آئی او صاحب!'' میں نے قدرے سخت لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔ ''آپ کی رپورٹ

اور بیان میں زیادہ تر باتیں ''ہوسکتا ہے'' پر مبنی ہیں۔اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔''واقعات وشواہد جس جانب اشارہ کر رہے ہیں، میں نے وہی نکات اجاگر کئے ہیں۔''

''او کے.......واقعات اور شواہد کو بعد میں دیکھیں گے۔'' میں نے خاصے دوستانہ انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔''آئی او صاحب! آپ کی رپورٹ کے مطابق یہ ایک مجرمانہ حملے اور قتل کا کیس ہے۔ مقتولہ نیلوفر کو پہلے مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا، ازاں بعد اس خوف سے کہ کہیں وہ ملزم کا راز فاش نہ کر دے۔ ملزم نے گلا گھونٹ کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی آپ کے اس نظریے کی تائید کرتی ہے۔ آپ سے میرا سوال یہ ہے کہ........''

میں لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔''جب آپ نے میرے مؤکل اور اس کس کے ملزم وارث علی کو گرفتار کر لیا تو کیا آپ نے اس کا طبی معائنہ کرایا تھا؟ کیونکہ استغاثہ کی طرف سے عدالت میں جو چالان پیش کیا گیا ہے اس میں ایسے کسی معائنے کی کوئی رپورٹ موجود نہیں؟''

اس نے گردن کو نفی میں حرکت دی اور بتایا۔''ملزم کا ایسا کوئی معائنہ نہیں کرایا گیا تھا۔''

''کیوں؟'' میں نے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔''کیا پولیس ڈیپارٹمنٹ کو ایسی سہولت مہیا نہیں جو اس نوعیت کا معائنہ کرا سکے؟''

''ہمیں ہر قسم کے ٹیسٹ اور معائنے کی سرکاری سہولت میسر ہے۔ لیکن ہم نے ملزم کے کسی ایسے معائنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔''ضرورت کیوں نہیں محسوس کی گئی؟''

وہ بے پرواہی سے کندھے جھٹکتے ہوئے بولا۔''وہ اس لئے کہ جب ہم نے ملزم کو حراست میں لیا تو وقوعہ کو کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس دوران وقت تین گھنٹے آگے سرک گیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ ملزم نے گھر جاتے ہی غسل کر لیا تھا۔ اس صورت میں ایسے کسی بھی ٹیسٹ یا معائنے کی رپورٹ پر انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا۔''

میں نے مزید ایک دو سوالات کے بعد اسے فارغ کر دیا۔

اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے ''اسٹار انٹر پرائزز'' کے ایک ملازم انور کمال کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا۔ انور کمال، ملزم وارث علی کا کولیگ بھی تھا۔ جب وہ اپنا حلفیہ بیان دے کر فارغ ہو چکا تو وکیلِ استغاثہ جرح کے لئے اس کے قریب چلا گیا۔

''انور صاحب!'' اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔''آپ کے

خیال میں ملزم وارث کس قسم کا آدمی ہے؟''

وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ یہ بندہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں انور صاحب؟'' وکیل استغاثہ نے دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا۔

گواہ نے جواب دیا۔ ''وکیل صاحب! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی طبیعت اور مزاج میری سمجھ میں نہیں آیا۔ عجیب سا اکھڑ اور بدمزاج شخص ہے۔ اسے خواتین سے تو بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے۔ ہر وقت فساد کا اندیشہ رہتا ہے اس لئے میں اسے زیادہ منہ نہیں لگاتا تھا۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم ایک جھگڑالو اور بداخلاق شخص ہے۔''

''جی ہاں........جی ہاں.......میرا یہی مطلب تھا۔'' گواہ نے جلدی سے کہا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وکیلِ استغاثہ اس گواہ کو اچھی طرح پڑھا کر عدالت کے اکھاڑے میں لایا تھا۔ وہ دراصل میرے مؤکل کا مورال پست کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لمحے وکیلِ استغاثہ نے ایک اور پن چبھو ڈالی۔ گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''مسٹر انور کمال! آپ نے ملزم کی بدتمیزی کا ذکر کرتے ہوئے خاص طور پر ''خواتین'' کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم کو صرف خواتین سے تمیز دار بات کرنا نہیں آتی ورنہ حضرات سے تو وہ بڑے اچھے انداز میں بات چیت کرتا ہے۔ جبکہ مجموعی طور پر آپ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ملزم ایک جھگڑالو اور بداخلاق شخص ہے۔ یہ کیا معمہ ہے؟''

''معمہ تو کوئی نہیں ہے۔'' استغاثہ کا گواہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل خواتین کا ذکر اس لئے بھی میری زبان پر آ گیا کہ پچھلے دنوں اس شخص کی وجہ سے ایک لڑکی کو بڑی خفت اٹھانا پڑی تھی۔''

''ہاں، ہاں...... بتائیں، کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' وکیلِ استغاثہ نے اصراری لہجے میں پوچھا۔

انور کمال نے ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''پچھلے دنوں ہمارے دفتر میں فرحانہ نام کی ایک لڑکی کو رکھا گیا تھا۔ (پچھلے دنوں سے اس کی مراد وقوعہ سے چند روز پیشتر تھی) فرحانہ کو کسی ٹیکنیکل کام کا تجربہ نہیں تھا لہٰذا اسے آفس ہی میں ریسیپشن پر بٹھا دیا گیا۔ بس پھر کیا تھا، ملزم نے پتہ نہیں اس کے ساتھ ایسی کون سی حرکت کی کہ وہ ہتھے سے اُکھڑ گئی

اور یہ کہتے ہوئے نوکری چھوڑ کر چلی گئی کہ جس دفتر میں ملزم جیسے چھچھورے لوگ کام کرتے ہوں وہاں کوئی شریف لڑکی جاب نہیں کر سکتی۔ اس واقعے سے آپ ملزم کی ذہنیت اور کردار کا بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔''

استغاثہ کا گواہ خاموش ہوا تو وکیلِ استغاثہ فاتحانہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میرے مؤکل کی شہرت اور کردار کو نشانہ بنانے کے لئے وہ من گھڑت واقعہ پیش کیا گیا تھا۔ من گھڑت اور خود ساختہ ان معنوں میں کہ اس میں حقیقت کا عنصر پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ اتنے دنوں تک میں کوئی ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھا رہا تھا۔ میں نے اس کیس کے سلسلے میں بہت دوڑ دھوپ کی تھی اور اپنے ساتھ بشارت علی اور سماجی کارکن نوید عثمانی کو بھی لگا رکھا تھا۔ وہ گاہے بگاہے میری مطلوبہ معلومات مجھ تک پہنچاتے رہتے تھے۔ لہٰذا اس شعبے میں، میں پوری طرح مطمئن تھا۔ اس سلسلے میں ''اسٹار انٹر پرائزز'' اور وہاں کے معاملات بھی میری نگاہ سے اوجھل نہیں تھے لہٰذا مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ ایک معمولی اور میرے مؤکل سے غیر متعلق واقعے میں رنگ آمیزی کر کے اسے میرے مؤکل کے خلاف ایک پہاڑ بنا کر پیش کیا جا رہا تھا۔ میں بڑی بے تابی سے اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے اُمید بھری نظر سے استغاثہ کے گواہ انور کمال کی طرف دیکھنے لگا۔

وکیلِ استغاثہ نے مزید دو چار ایسے ہی تیکھے اور ترچھے سوالات کرنے کے بعد گواہ کو فارغ کیا تو میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اس کے کٹہرے کے نزدیک چلا گیا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے، سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''انور کمال صاحب! آپ بڑے کمال کے انور ہیں۔ واقعی، میں آپ کے کمالات کو مان گیا ہوں۔ آپ نے یہ فن کہاں سے سیکھا تھا؟''

''کون سا فن؟'' وہ اُلجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''بھئی، میں اُردو کے نہیں بلکہ انگریزی کے فن کی بات کر رہا ہوں۔''

''انگلش کا فن؟'' وہ برہمی سے بولا۔ ''کیا آپ مجھے فنی کہہ رہے ہیں؟''

''آپ نے بات ہی ایسی مضحکہ خیز کی ہے کہ میں ایسا سمجھنے پر مجبور ہوں۔''

''کون سی بات؟'' وہ اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے سوال کا جواب آپ کو خود ہی مل جائے گا

اگر آپ ترتیب وار میرے سوالات کے جواب دیتے جائیں گے۔ کیا آپ تیار ہیں؟''

''میں پوری طرح تیار ہو کر ہی عدالت میں آیا ہوں۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔

میں نے گیپ دیکھتے ہوئے بڑی صفائی سے بال کو گلی میں اسکوائر کٹ کیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''ہاں.......وہ تو نظر آہی رہا ہے۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا، خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔

میں نے پوچھا۔''آپ کو اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''پانچ سال۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور ملزم کو؟''

''اس نے صرف تین ماہ ہمارے ساتھ کام کیا تھا کہ وہ واقعہ پیش آ گیا جس کی وجہ سے وہ آج ہتھکڑی میں نظر آ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔''ملزم کا کام فیلڈ کا تھا۔ کیا آپ بھی اسی نوعیت کا کام کرتے ہیں؟''

''ہم میں سے زیادہ تر اسٹاف ممبر فیلڈ میں جاتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔''میں بھی ایک سینئر فیلڈ آفیسر ہوں۔''

''تھینک یو!'' میں نے متشکرانہ انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔''میری معلومات کے مطابق آپ کی کمپنی کے دفتر میں چار خواتین بھی کام کرتی ہیں.......صدف، ماہ جبیں، کنول اور لطیفہ۔ ایم آئی رائٹ؟''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جسے اس کمپنی میں کام کرتے ہوئے دو سال سے کم عرصہ ہوا ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ کی معلومات حیرت انگیز طور پر درست ہیں۔'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔''کیا یہ صحیح ہے کہ صدف اور ماہ جبیں کی ڈیوٹی دفتر کے اندر ہے اور کنول اور لطیفہ دونوں آپ لوگوں کی طرح سروے کے لئے فیلڈ میں جاتی ہیں؟''

''کیا آپ بھی خفیہ طور پر ہماری کمپنی کے لئے کام کرتے ہیں؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں مستفسر ہوا۔

میں نے کہا۔''آپ اس چکر میں نہ پڑیں انور کمال صاحب! کہ میں کس کے لئے خفیہ اور کس کے لئے ظاہرہ کام کر رہا ہوں۔ اس وقت تو میں اپنے مؤکل کی بریّت کیلئے زور لگا رہا ہوں۔ آپ میرے سوال کا جواب دیں۔''

وہ ایک لمحے تک مجھے سوچتی ہوئی نظر سے دیکھتا رہا، پھر تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں.......ان لڑکیوں کی ڈیوٹی اسی نوعیت کی ہے جیسا کہ آپ نے بیان کیا ہے۔''

میں نے اچانک اس سے پوچھ لیا۔ ''کیا ان میں سے کسی کا ملزم کے ساتھ کبھی کسی بات پر جھگڑا ہوا تھا؟''

وہ اُلجھن زدہ مگر پریشان نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے تذبذب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً اضافہ کر دیا۔ ''انور کمال صاحب! آپ ذرا سوچ سمجھ کر میرے اس سوال کا جواب دیجئے گا کیونکہ مثبت میں اگر جواب آیا تو آپ کو اس کا ثبوت بھی پیش کرنا پڑے گا۔ ٹھوس ثبوت!''

وہ گڑبڑا کر رہ گیا پھر قدرے تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''نہیں!''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک میرا مؤکل ''اسٹار انٹرپرائز'' میں کام کرتا رہا اس کا صدف، ماہ جبیں، کنول اور لطیفہ وغیرہ سے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا؟''

وہ لکنت آمیز لہجے میں بولا۔ ''جی.......میرا مطلب.......یہی ہے۔''

میں نے اسے مزید پکا کرنے کی خاطر پوچھ لیا۔ ''انور صاحب! کہیں ایسا تو نہیں کہ مذکورہ چاروں لڑکیاں پیدائشی گونگی ہوں.......اس دوران کبھی ان کی میرے مؤکل سے بات ہی نہ ہوئی ہو۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ بے اختیار اچھل پڑا۔ ''مارکیٹنگ کے شعبے میں کوئی گونگا شخص، خصوصاً لڑکی کیسے چل سکتی ہے؟''

''اس کا مطلب ہے، آپ تصدیق کرتے ہیں کہ وہ چاروں قوتِ گویائی سے مالا مال تھیں۔''

''جی.......جی بالکل۔'' وہ مزید اُلجھ کر رہ گیا۔

''گویا وہ چاروں لڑکیاں دوسرے اسٹاف کی طرح میرے مؤکل سے بھی بات کرتی تھیں؟''

''ظاہر ہے.......اس میں شک و شبے والی کون سی بات ہے؟''

''شکریہ، آپ نے میرا شک دور کر دیا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ بدستور اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے قدرے سخت لہجے میں اس سے استفسار کیا۔

''انور کمال صاحب! تھوڑی دیر پہلے، اسی عدالت کے کمرے میں، معزز منصف کے

روبرو آپ وکیلِ استغاثہ کی جرح کے جواب میں میرے مؤکل یعنی اس مقدمے کے ملزم مسٹر وارث علی کو اخلاق باختہ، بدتمیز، گنوار اور اجڈ........ جانے کیا کیا ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے اور اس ذیل میں آپ نے ایک ریسپشنسٹ فرحانہ کی مثال بھی پیش کی تھی جو ملزم کی کسی بدتمیزی کے نتیجے میں نوکری پر لات مار کر چلی گئی تھی۔ اور اب آپ فرما رہے ہیں کہ ملزم دیگر چار خواتین کے ساتھ بڑے سلوک اور خوش اسلوبی سے رہ رہا تھا۔ یعنی ان کے ساتھ دوستانہ ماحول میں کام کر رہا تھا۔"

میں لمحہ بھر کو متوقف ہوا پھر سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"انور صاحب! آپ کے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟ نمبر ایک، ملزم ایک بدتمیز، غیر شائستہ اور جھگڑالو انسان ہے۔ نمبر دو، وہ ایک امن پسند اور صلح جو انسان ہے۔ یہ دونوں اسٹیٹ منٹس آپ ہی کے جاری کردہ ہیں اور بری طرح آپس میں متصادم ہیں۔"

وہ میرے شکنجے میں پوری طرح کسا جا چکا تھا۔ فرار کا کوئی راستہ نہ پا کر اس نے امداد طلب نظر سے وکیلِ استغاثہ کو دیکھا۔ وہ فوراً اس کی مدد کو لپکا۔

"مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!" اس نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں پر نیلوفر مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور میرے فاضل دوست "اسٹار انٹر پرائزز" کے نجی معاملات کو زیرِ بحث لا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے ہتھکنڈوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

جج نے نظر کے چشمے کے اوپر سے سوالیہ نظر مجھ پر ڈالی اور پوچھا۔ "بیگ صاحب! کیا آپ کی جرح براہِ راست اس کیس سے تعلق رکھتی ہے؟"

"ایبسو لیوٹلی یور آنر!" میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "میرا مؤکل اس کیس کا سب سے زیادہ متعلق کردار ہے۔ تھوڑی دیر پہلے اس کے کردار کو مسخ کرنے کے لئے استغاثہ نے جو بھونڈی کوشش کی ہے، میں تو نہایت ہی سادگی سے اس کا جواب دے رہا ہوں۔ اپنے مؤکل کا دفاع کرنا میرا اخلاقی، قانونی اور انسانی فرض ہے۔ میں اپنے مؤکل کے کردار کو پاک صاف ثابت کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔ دیٹس آل یور آنر!"

جج نے گردن کو اثباتی جنبش دی پھر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کرنے کے بعد مجھ سے کہا۔ "بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

اس کے بعد اس نے کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ کو حکم دیا۔ "مسٹر انور کمال! آپ صاف اور واضح الفاظ میں بیگ صاحب کے سوال کا جواب دیں۔"

جج نے اسے جواب دینے کے لئے پابند کیا تو وہ عجیب سی مشکل میں گرفتار ہو گیا۔ اس نے وکیلِ استغاثہ کے ساتھ مل کر پہلے میرے مؤکل کو بدکردار ثابت کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ کسی نکیلی ہڈی کی مانند اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ بعد ازاں میں نے اپنے تیکھے سوالات کے نتیجے میں اس کے منہ سے یہ اُگلوا کر دکھایا تھا کہ میرا مؤکل ایک ملنسار، متعاون اور خوش اخلاق شخص تھا۔ گویا میں نے اپنے مؤکل کے کردار پر ہونے والے حملے کا منہ توڑ جواب دے ڈالا تھا۔

جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو وہ منمنانے والے انداز میں بولا۔ ''میرا خیال ہے، فرحانہ والے معاملے میں شاید کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی........''

یہ گویا، وہ میرے مؤکل کی حمایت کر رہا تھا۔ میں نے چور کو اس کے گھر تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''انور صاحب! میرے مؤکل کو کسی قسم کی مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی تھی اور نہ ہی فی الحقیقت ایسا کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہوا تھا۔ میں آپ کو اصل معاملے کی یاد دلاتا ہوں مجھے یقین ہے آپ بھولے ہوئے تو نہیں ہیں۔ چلیں، آپ کے توسط سے معزز عدالت کے ریکارڈ پر ایک اہم بات آ جائے گی۔''

وہ پریشانی سے بغلیں جھانکنے لگا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو اختتام تک لاتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ صحیح ہے کہ آپ کی کمپنی کے مالک یعنی آپ کے باس کا نام ایوب چنگیزی ہے؟''

''جی ہاں، ایوب چنگیزی ہی ہمارے باس ہیں۔'' اس نے تصدیقی انداز میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کے باس کچھ زیادہ ہی آزاد خیال اور دل پھینک واقع ہوئے ہیں؟''

وہ جزبز ہو کر رہ گیا اور کن انکھیوں سے جج کی طرف دیکھنے لگا۔

میں نے قدرے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔

''میرے سوال کا جواب دیں مسٹر انور کمال!''

''مم........ میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' وہ جان چھڑاتے ہوئے بولا۔

مگر میں اتنی آسانی سے اُس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ مجھے اپنے مؤکل کے کردار کو بے داغ ثابت کرنے کے لئے انہی طریقوں کو اختیار کرنا تھا۔ لہٰذا سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا یہ درست ہے کہ ایوب چنگیزی نے فرحانہ کو نان ٹیکنیکل اور نو آموز دیکھتے ہوئے اپنی آزاد خیالی آزمانے کی کوشش کی تھی جس کے نتیجے میں وہ بھڑک اُٹھی اور اسی لیے نوکری چھوڑ کر چلی گئی تھی؟''

''جناب! آپ مجھ سے باس کے بارے میں سوال نہ کریں۔ مجھے نوکری........''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس سے کوئی بھیانک غلطی ہونے جا رہی تھی اور اس نے فوراً اپنی زبان کو لگام دے ڈالی تھی۔ میں نے اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''انور صاحب! میں سمجھ گیا، باس کے بارے میں زبان کھولنے سے آپ کی نوکری بھی جا سکتی ہے۔ میں آپ کا دشمن نہیں ہوں لہٰذا اس موضوع کو یہیں ختم کرتا ہوں۔ بہرحال، آپ کے صحت مند تعاون کا بہت بہت شکریہ۔''

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس نے میرے ساتھ کون سا صحت مند تعاون کیا تھا؟ اور میں اس کے تعاون کے نتیجے میں کیا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا؟........ میں نے اُسے اسی ادھیڑ بُن میں مبتلا رہنے دیا اور ایک لمحے کے وقفے سے نیا سوال کر ڈالا۔

''وقوعہ کے روز آپ لوگ کافی دیر تک دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔'' وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''جب بھی کام زیادہ ہو، ہمیں لیٹ سٹنگ کرنا پڑتی ہے اور ایسا اکثر ہوتا ہے۔''

''وقوعہ کے روز آپ کے ساتھ اور کون بیٹھا کام کر رہا تھا؟''

''میرے علاوہ مرتضٰی اور اظفر علی وہاں موجود تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس روز مقتولہ کے شوہر فرید عباس نے آپ کے دفتر فون کر کے ملزم کے بارے میں استفسار کیا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس کی آپ سے بات ہوئی تھی؟''

''نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''مرتضٰی نے اس سے بات کی تھی۔''

میں نے پوچھا۔ ''مقتولہ کے شوہر فرید عباس کا دعویٰ ہے کہ اس نے وقوعہ کے روز رات سوا نو بجے آپ کے دفتر فون کر کے ملزم کی بابت معلومات حاصل کی تھیں۔ کیا آپ وقت کے معاملے میں اس کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں؟''

''جناب! میں نے اس وقت گھڑی پر نگاہ تو نہیں ڈالی تھی لیکن میرا خیال ہے، لگ بھگ اتنے ہی بجے ہوں گے۔''

''ٹھیک ہے........ یہ جواب بھی چلے گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔

''وقوعہ کے رات پولیس کی آمد پر مقتولہ کے شوہر نے انہیں ملزم کے دفتر کے بارے میں بتایا تھا اور کم وبیش سوا دس بجے رات انکوائری آفیسر نے بھی آپ کے دفتر میں فون کیا تھا۔ مگر وہاں کسی نے فون اٹینڈ نہیں کیا؟........ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

'ہم نے اس رات ٹھیک دس بجے آفس بند کر دیا تھا۔' وہ اُکتائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''اس لئے سوا دس بجے وہاں فون اٹینڈ کرنے کے لئے کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ بس، اتنی سی بات ہے!''

میں نے ایک نہایت ہی اہم بات اس کی زبان سے اُگلوانے کی خاطر زاویہ سوالات کو تھوڑا گھما کر اس سے استفسار کیا۔

''انور کمال صاحب! وقوعہ کی رات آپ کے ایک کولیگ مسٹر مرتضٰی نے مقتولہ کے شوہر کے سوال کے جواب میں اسے بتایا کہ ملزم دفتر سے چھٹی کر کے اپنے گھر واقع قیوم آباد جا چکا ہے۔ ذرا سوچ کر جواب دیں، کیا اس معاملے میں آپ کے کولیگ مرتضٰی نے کسی قسم کی غلط بیانی تو نہیں کی تھی؟''

اس نے اُلٹا مجھ سے پوچھ لیا۔ ''کیسی غلط بیانی وکیل صاحب؟'' اُس کے انداز میں اُلجھن بھری حیرت موجود تھی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

''مثلاً........ یہ غلط بیانی کہ ملزم تو اس وقت دفتر کے اندر ہی موجود ہو اور فرید عباس کو محض ٹالنے کے لئے کہہ دیا گیا ہو کہ وہ چھٹی کر کے گھر جا چکا ہے........ جبکہ وہ بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہی رات دس بجے دفتر سے نکلا ہو؟''

وہ کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ میں نے اس کی زبان سے اپنے مطلب کی بات اُگلوانے کے لئے اسے کون سے چکر میں ڈال دیا ہے۔ وہ چونکہ نہیں سوچ سکتا تھا لہٰذا بے ساختہ سوچے سمجھے بغیر اس نے قدرے برہمی سے کہا۔

''جناب! آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں؟........'' پھر اس نے کٹہرے میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کیا اور قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''یہ وہ شکل نہیں کہ رات کو دیر تک دفتر میں بیٹھ کر کام کر سکے۔ اسے تو سرِ شام ہی گھر بھاگنے کی لگی رہتی ہے۔''

''یعنی ملزم لیٹ سٹنگ کا قائل نہیں؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے بتایا۔''جی ہاں....... یہ ان تین مہینوں میں ایک دن بھی زیادہ دیر تک دفتر میں نہیں رُکا۔''
''آپ کے دفتر کے اوقاتِ کار کیا ہیں؟''
''گیارہ بجے دن سے رات سات بجے تک۔'' میں نے جواب دیا۔''دفتر کا زیادہ تر اسٹاف سات بجے چھٹی کر کے اپنے گھروں کو چلا جاتا ہے۔صرف دو تین افراد ہی لیٹ سٹنگ کے لئے دفتر میں موجود رہتے ہیں۔''
''اور آپ بڑے وثوق سے بتا رہے ہیں کہ ملزم کا شمار ان دو تین افراد میں کبھی نہیں رہا جو دفتر میں لیٹ سٹنگ کرتے ہیں جیسا کہ آپ، مرتضیٰ، اظفر علی.......'' میں نے عام سے انداز میں کہا۔''بلکہ یہ دفتر کے اس اسٹاف میں شامل ہے جو''ڈاٹ سات بجے'' چھٹی کر کے گھر چلے جاتے ہیں۔''
''جی ہاں....... بالکل ایسا ہی تھا!'' اُس نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔
میں نے پوچھا۔''کیا وقوعہ کے روز بھی ملزم نے سات بجے ہی چھٹی کی تھی؟''
''بالکل!'' وہ قطعیت سے بولا۔''یہ کوئی چھٹی سے دس پندرہ منٹ پہلے دفتر پہنچا۔ اپنے فارم دفتر کے متعلقہ شعبے میں جمع کرائے، پھر دن بھر کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی اور چھٹی کر کے گھر چلا گیا۔''
''یعنی آپ کا مطلب ہے، فیلڈ میں کام کرنے والوں کو چھٹی سے پہلے دفتر میں دن بھر کی کارکردگی کی رپورٹ دینا ہوتی ہے، اس کے بعد وہ گھر جاتے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز انداز میں استفسار کیا۔''اور گھر جاتے وقت وہ کام اور دفتر سے متعلق تمام کاغذات اور دستاویزات کو مخصوص سیاہ بریف کیس میں بند کر کے دفتر ہی میں چھوڑ کر جاتے ہیں؟''
''جی ہاں....... یہ ہمارے دفتر کا قاعدہ ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''اور اس کی پابندی سب پر لازم ہے۔''
''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ چھٹی کے بعد کوئی بھی فیلڈ آفیسر عملاً مارکیٹنگ کی پوزیشن میں نہیں رہتا۔بس، وہ زبانی جمع خرچ کے قابل ہی رہ جاتا ہے۔''
''حالانکہ یہ کامیاب مارکیٹنگ کے اصولوں کے خلاف ہے۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔''لیکن ہمارے دفتر میں یہی اصول چلتا ہے۔''

''تھینک یو مسٹر انور کمال!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے جج کی جانب مڑ گیا۔

''دی پوائنٹ اِز ٹو بی نوٹڈ یور آنر!'' میں نے چیختے ہوئے لہجے میں کہا۔

جج سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا کہ میں پوائنٹ کی وضاحت کروں۔ میں نے اس وضاحت سے پہلے وکیلِ استغاثہ کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ وہ شخص مجھے خاصا اُلجھا ہوا اور متفکر دکھائی دیا۔ میں نے اس پر ایک طنزیہ، معنی خیز نگاہ ڈالی اور روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے کرارے لہجے میں کہا۔

''جنابِ عالی! یہ بات بالکل درست ہے کہ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔ اس وقت بھری عدالت میں، میں نے اس حقیقت کو عملاً پیش کر کے دکھایا ہے۔ مسٹر انور کمال کا تعلق استغاثہ سے ہے۔ یعنی وہ میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم وارث علی کے خلاف گواہی دینے یہاں آیا تھا اور ابتداء میں اس نے ایسی کوشش بھی کی مگر انتہا تک پہنچتے پہنچتے میں نے غیر محسوس انداز میں اسے ملزم کی حمایت کے لئے قائل کر لیا اور........ جاتے جاتے اس نے ایک ایسی حقیقت کا اعتراف کیا ہے جو میرے مؤکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے۔''

میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا اور بڑی کڑی نظر سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا۔ اُس کی اُلجھن اس وقت ساتویں آسمان کو چھو رہی تھی۔ چہرے پر زلزلے کے آثار تھے جیسے اس کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ میں کیا کہنے جا رہا ہوں........ میں نے کون سا بم پھاڑنے کے لئے یہ سنسنی خیز ایٹمی فضا قائم کی ہے؟

گواہ انور کمال اپنی گواہی مکمل ہونے کے بعد عدالت کے کمرے سے باہر جا چکا تھا۔ اگر اس وقت وہ وہاں موجود ہوتا تو سب سے زیادہ دیدنی حالت اُسی کی نظر آتی۔ کیونکہ میں جو کچھ کہنے جا رہا تھا، اس کی عمارت میں نے انور کمال کے بیان کی پیٹھ پر ہی کھڑی کی تھی۔

جج میرے توقف پر بڑی دلچسپ اور توقع آمیز نگاہ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اپنے مؤقف کی وضاحت میں کہنا شروع کیا۔

''یور آنر! ملزم کی رہائش قیوم آباد کے علاقے میں ہے۔ وہاں یہ دو افراد کے ساتھ کرائے کے ایک مکان میں رہتا ہے۔ وقوعہ کے روز ملزم لگ بھگ پونے آٹھ بجے گھر پہنچا تھا۔ اس نے دن بھر کی تھکن کو اُتار پھینکنے کے لئے جاتے ہی غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور پھر تینوں افراد نے مل کر رات کا کھانا کھایا تھا۔ ازاں بعد، رات گیارہ بجے پولیس نے ملزم کو اسی گھر سے گرفتار کیا تھا۔ ان واقعات اور شواہد کے لئے اگر گواہی کی ضرورت پیش آئی تو میں ملزم کے

دونوں ہم رہائش ساتھیوں سلیم احمد اور نثار حسین کو صفائی کے گواہوں کی حیثیت سے معزز عدالت کے روبرو پیش کرسکتا ہوں۔لیکن مجھے امید ہے، اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اوراس کی بھی ایک خاص وجہ ہے۔"

میں تھوڑی دیر کے لئے ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"یہ ضرورت اس لئے پیش نہیں آئے گی کہ استغاثہ کے معزز گواہ مسٹر انور کمال نے اس بات کی بڑی لوہالاٹ تصدیق کردی ہے۔" میں ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا وکیلِ استغاثہ سمیت حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"جنابِ عالی! تھوڑی دیر قبل، معزز عدالت کے روبرو استغاثہ کے گواہ انور کمال نے بڑے واضح اور دوٹوک الفاظ میں میری جرح کے جواب میں بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز ملزم ٹھیک سات بجے چھٹی کرکے دفتر سے نکل گیا تھا۔ بہادرآباد سے قیوم آباد تک پہنچنے کے لئے کم وبیش پونا گھنٹہ صرف ہوتا ہے لہٰذا وہ پونے آٹھ بجے گھر پہنچ گیا۔ استغاثہ کے گواہ انور کمال نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ دفتر سے چھٹی کرتے وقت فیلڈ آفیسر تمام ضروری کاغذات اور دیگر لوازماتِ سروے کو دفتر ہی میں چھوڑ کر جاتے ہیں، گویا وہ چھٹی کے بعد مارکیٹنگ کا کام نہیں کرتے۔اب میں اس تناظر میں معزز عدالت کی توجہ ایک اہم نکتے کی جانب مبذول کرانا چاہوں گا۔"

میں نے ذرا رک کر جج کے تاثرات کو بھانپنے کی کوشش کی اور اسے پوری طرح اپنی جانب متوجہ پا کر میں نے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جنابِ عالی! حالات وواقعات اور شواہد اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ وقوعہ کی رات ملزم ٹھیک سات بجے دفتر سے نکلا اور کم وبیش پونے آٹھ بجے وہ اپنے گھر پہنچ گیا اور اس کے بعد گرفتاری کے وقت تک وہ گھر کے اندر موجود رہا۔ دفتر سے گھر جانے کے دوران اس کے پاس ایسی کوئی دستاویزی شے (بشمول سیاہ بریف کیس) موجود نہیں تھی کہ وہ "اسٹار انٹر پرائزز" کے نمائندے کی حیثیت سے مارکیٹنگ کرتا پھرتا۔ لہٰذا صرف ایک امکان باقی رہ جاتا ہے کہ وہ سات بجے سے پہلے، یعنی فیلڈ سے دفتر پہنچنے سے بھی پہلے مقتولہ کے بنگلے پر گیا ہو۔لیکن اس صورت میں ایک بہت بڑی خرابی پیدا ہو جائے گی جو استغاثہ کی عمارت کو پلک جھپکتے میں زمین سے بوس وکنار پر مجبور کردے گی۔"

میں نے ایک مرتبہ پھر ڈرامائی توقف کیا، پھر قدرے بلند آواز میں کہا۔

''اور وہ خرابی یہ ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ نیلوفر کی موت چار جنوری، یعنی وقوعہ کی رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ وہی دورانیہ ہے جب ملزم قیوم آباد میں اپنے گھر میں موجود تھا۔ پھر...... یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ آٹھ اور نو بجے کے درمیان اپنی کمپنی کی مارکیٹنگ کے لئے مقتولہ کے بنگلے واقع مقبول آباد پہنچے، اسے مجرمانہ حملے کا نشانہ بنائے اور بعد میں پکڑے جانے کے خوف سے وہ اسے موت کے گھاٹ اتار کر وہاں سے فرار ہو جائے۔ ہاؤ کین اِٹ پاسبل یور آنر؟''

اس سلگتے ہوئے سوال نے بھری عدالت پر ایک سناٹے جیسی کیفیت طاری کر دی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہاں موجود ہر ذی روح اور ہر شے کو کوئی خطرناک سانپ سونگھ گیا ہو۔

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنی گردن کو اثباتی جنبش دی اور میرے اٹھائے گئے ''پوائنٹ'' کو اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات میں سے ایک پر بڑی سنجیدگی سے نوٹ کرنے لگا۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف دو منٹ باقی رہ گئے تھے۔ اس قلیل مدت میں چونکہ کسی اور گواہ کی شہادت ممکن نہیں تھی لہٰذا جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ اِز ایڈجارنڈ!''

میں عدالت کے کمرے سے باہر نکلا تو ملزم کا باپ اور بڑا بھائی میرے دائیں بائیں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ امانت علی اس پیشی پر دیانت علی کو بھی ساتھ لے کر آیا تھا۔ دیانت علی اور وارث علی میں گہری مشابہت پائی جاتی تھی۔ اُس روز امانت علی خاصا پُرجوش دکھائی دیتا تھا۔ پہلے والی مایوسی اور افسردگی اس کے چہرے پر نظر نہیں آتی تھی۔

''بیگ صاحب! آج تو آپ نے کمال کر دیا ہے۔'' امانت علی نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''مجھے اُمید ہے، بہت جلد وارث علی اس مصیبت سے نکل آئے گا۔''

''کوشش تو میں یہی کر رہا ہوں۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں، آگے کیا ہوتا ہے۔ انشاءاللہ! سب ٹھیک ہی ہو گا۔ میں آپ کے بیٹے کو باعزت بری کروا کر ہی دم لوں گا۔''

''مجھے یقین ہے، ایسا ہی ہو گا۔'' وہ پُروثوق انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ واقعی اس کیس کو لڑنے کے لئے بہت محنت کر رہے ہیں۔''

میں نے موقع محل مناسب دیکھتے ہوئے اس کے کان میں پھونک دیا۔ ''میری اس انتھک محنت میں کچھ اور لوگوں کا حصہ بھی شامل ہے جن میں نوید عثمانی اور بشارت علی سرِفہرست ہیں۔

ان دونوں نے بھاگ دوڑ کر کے مجھے بڑی مفید معلومات فراہم کی ہیں۔"

"عثمانی صاحب سے تو میں مل چکا ہوں۔" امانت علی نے کہا۔ "بہت ہی بے لوث، نیک اور خدا ترس انسان ہیں۔ لیکن یہ بشارت علی کون ہے؟"

"بشارت میرے دفتر میں آفس بوائے کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔" میں نے بتایا۔ "بیوی بچوں والا ہے لیکن عہدے کے اعتبار سے اسے آفس بوائے ہی کہا جائے گا۔"

"اچھا، اچھا!" وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ وہی بندہ ہے نا جو بہاول نگر کا رہنے والا ہے؟"

امانت علی کی بات سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ بشارت نامی اس چلتے پُرزے نے یہاں بھی ڈاک خانہ ملانے میں ایک لمحے کی دیر نہیں کی تھی۔ میں نے امانت علی کے سوال کے جواب میں کہا۔

"جی ہاں، میں اسی بشارت کی بات کر رہا ہوں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے مزید اضافہ کر دیا۔ "نوید عثمانی تو اللہ کے فضل و کرم سے ایک صاحبِ حیثیت انسان ہیں لیکن بشارت کے سلسلے میں، میں آپ سے ضرور سفارش کروں گا۔ اس کیس کے سلسلے میں وہ اپنی ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ جو بھاگ دوڑ اور جدوجہد کر رہا ہے، اُسے اس کا صلہ ضرور ملنا چاہئے!"

"کیوں نہیں...... کیوں نہیں!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "میں بشارت کا خاص طور پر خیال رکھوں گا۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔ آخر وہ ہمارا گرائیں بھی تو ہے!"

اسی لمحے میرے ذہن میں بشارت کے کہے ہوئے وہ الفاظ گھوم گئے جو اس نے وارث علی سے ہونے والی پہلی ملاقات کے موقع پر کہے تھے...... "سر جی! دراصل بات یہ ہے کہ وہ بندہ (امانت علی کا بیٹا وارث علی) اپنا گرائیں نکل آیا ہے۔ اس لئے اُس کا خیال کرنا پڑا۔"

یہ بات بالکل اٹل اور مبنی بر حقیقت ہے کہ انسان چاہے دنیا کے کسی بھی خطے میں چلا جائے، اگر وہاں کسی سے اس کا ڈاک خانہ مل جائے تو اسے ضرور فائدہ پہنچے گا۔ "ڈاک خانہ مل جانا" بہت مستعمل ہے جس کے معنی شناسائی نکل آنے کے ہیں۔

امانت علی اور اس کا فرزندِ اوّل دیانت علی مجھ سے پُرجوش معانقہ کر کے رخصت ہوئے تو میں پارکنگ میں موجود اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی طرف سے تین گواہوں کو پیش کیا گیا لیکن میری نگاہ میں وہ تینوں گواہ کسی بھی زاویے سے اہمیت کے حامل نہیں تھے لہٰذا میں گزشتہ پیشی کی عدالتی کارروائی کا ذکر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

***

منظر اسی عدالت کا تھا!

گواہوں والے کٹہرے میں مقتولہ کا گھریلو ملازم سلطان کھڑا نظر آ رہا تھا۔ سلطان کا تعلق سکھر سے تھا تاہم اس ملازمت کے دوران وہ بنگلے ہی میں بنے ہوئے ایک چھوٹے کوارٹر میں رہائش پذیر تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتیس کے قریب لگایا۔ اس کی رنگت سانولی سی تھی۔ صحت اچھی اور قامت دراز۔ اس کی شخصیت کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ وہ معمول سے زیادہ بڑے ہاتھ پاؤں کا مالک تھا۔

سلطان نے اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کرایا تو وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے قریب پہنچ گیا۔ سلطان نے اپنے بیان میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا تھا۔ یہ وہی بیان تھا جو وقوعہ کے روز اس نے پولیس کو دیا تھا۔ میں توقع کر رہا تھا کہ انور کمال پر ہونے والی جرح کے نتیجے میں شاید استغاثہ کی طرف سے کوئی نئی تبدیلی دیکھنے کو ملے لیکن ایسا کچھ بھی سامنے نہیں آیا تھا۔

وکیلِ استغاثہ نے سرسری سی جرح کے بعد سلطان کو فارغ کر دیا تو میں سوال و جواب کے لئے اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ چند لمحات تک میں بہ غور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا، پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر سلطان! آپ کو مقتولہ کے بنگلے پر کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کافی عرصہ ہو گیا ہے جناب!'' اس نے گول مول جواب دیا۔

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''لفظ ''کافی'' میرے سوال کے جواب کے لئے کافی نہیں۔ تم ''سالوں'' میں جواب دو۔''

''جی......یہی کوئی چار پانچ سال ہوئے ہیں۔''

''تم مذکورہ بنگلے پر کیا کرتے ہو؟''

''بنیادی طور پر تو میں چوکیدار ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''اس کے علاوہ اوپر کے تمام کام بھی کر دیتا ہوں۔''

''میری معلومات کے مطابق، تمہاری ڈرائیونگ کی صلاحیت فرید عباس کے علم میں ہے۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''پھر وہ تم سے گاڑی کیوں نہیں چلواتے؟''

''ان کی مرضی ہے جناب! میں کوئی زور تھوڑی دے سکتا ہوں؟'' وہ سادگی سے بولا۔

''مسٹر سلطان!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''وقوعہ کی رات

جب ملزم اس بنگلے پر پہنچا تو کیا تم گیٹ پر موجود تھے؟"

"جی ہاں........میں اس وقت اپنی ڈیوٹی پر حاضر تھا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

"تمہارے خیال میں اس وقت کیا بجا ہوگا؟"

"اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔" وہ رٹے رٹائے انداز میں بولا۔

میں نے پوچھا۔" کیا تم نے گھڑی میں باقاعدہ وقت دیکھا تھا یا اندازے سے بتا رہے ہو؟"

"میں نے گھڑی تو نہیں دیکھی۔" وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔" لیکن میرا اندازہ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس وقت اندھیرا پوری طرح چھا چکا تھا۔"

"جنوری کے مہینے میں ساڑھے پانچ، پونے چھ بجے سورج غروب ہو جاتا ہے اور آدھے گھنٹے بعد تاریکی بھی چھا جاتی ہے۔ یعنی اندھیرے کا آغاز تو چھ، سوا چھ بجے ہی ہو جاتا ہے۔ ساڑھے چھ بجے تو مکمل تاریکی ہر شے کو اپنے پروں تلے سمیٹ چکی ہوتی ہے۔" میں لحہ بھر کو متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم نے مجھے بتایا ہے کہ وہ لگ بھگ سوا چھ بجے مقتولہ کے بنگلے پر پہنچا تھا اور اس نے بہ مشکل دس منٹ وہاں گزارے تھے۔ اس کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ مقتولہ کا شوہر اس وقت گھر پر نہیں تھا اور مقتولہ کو سگریٹ وغیرہ کے سروے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ملزم کا وزیٹنگ کارڈ دیکھ کر اسے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کس قسم کا سروے کرتا پھر رہا ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے تجسّس کی تسکین کے لئے اسے اندر بلا لیا تھا اور تم کہہ رہے ہو........وہ آٹھ بجے بنگلے پر آیا تھا؟"

"جناب! ملزم کو وقت کے معاملے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولا۔" میرا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔ ملزم آٹھ بجے رات ہی بنگلے پر پہنچا تھا۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔" مسٹر سلطان! اس امر کے دو گواہ سلیم احمد اور نثار حسین قیوم آباد میں موجود ہیں کہ آٹھ بجے ملزم ان کے ساتھ تھا۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ملزم بیک وقت آٹھ بجے رات قیوم آباد میں بھی ہو اور مقبول آباد میں بھی؟........ہمزاد یا ہم شکل یا جڑواں والی کہانی عدالت کے کمرے میں نہیں چل سکتی۔ ازیں علاوہ........" میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر سلسلۂ جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ازیں علاوہ ملزم کے کولیگ اور استغاثہ کے معزز گواہ مسٹر انور کمال نے گزشتہ ایک پیشی پر عدالت کو بتایا تھا کہ وقوعہ کی رات ملزم ٹھیک سات بجے دفتر سے چھٹی کر کے گھر چلا گیا تھا۔

بہادر آباد اور مقبول آباد میں بس نام کا فاصلہ ہے۔ انسان آرام سے ٹہلتے ہوئے ادھر سے ادھر پہنچ سکتا ہے۔ اگر ملزم نے اس روز ٹھیک سات بجے چھٹی کی تھی تو اس کا مطلب ہے، وہ کم از کم پونے سات بجے دفتر پہنچا تھا۔ اس حساب سے ملزم کی یہ بات بالکل درست نظر آتی ہے کہ وہ سوا چھ بجے مقتولہ کے گھر پر پہنچا۔ پندرہ منٹ وہاں گزارے۔ ساڑھے چھ بجے بنگلے سے نکلا اور پونے سات بجے اپنے دفتر میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے اپنی دن بھر کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی، بریف کیس کو دفتر میں چھوڑا اور سات بجے دفتر سے چھٹی کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور ٹھیک آٹھ بجے وہ اپنے گھر واقع قیوم آباد میں اپنے ہم رہائش ساتھیوں کے ساتھ موجود تھا۔ تم اتنے سارے ٹھوس حقائق کو کس طرح جھٹلا سکتے ہو؟''

میرے اس تابڑ توڑ حملے نے اُسے بوکھلا کر رکھ دیا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ تاہم اس بوکھلاہٹ میں بھی اُس نے جو جواب دیا اس میں ڈھٹائی بدرجہ اتم موجود تھی۔

''میں نہیں جانتا، دوسرے لوگ ملزم کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ بس، میں نے بالکل ٹھیک بتایا ہے۔ ملزم آٹھ بجے رات کو بنگلے پر آیا تھا!''

میں نے زاویہ سوالات کو تبدیل کرتے ہوئے اسے ایک اور رگڑا دیا۔ ''مسٹر سلطان!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بیان کے مطابق ملزم وقوعہ کی رات آٹھ بجے مقتولہ کے بنگلے پر پہنچا۔ اُس نے فرید عباس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ تم نے اسے بتایا کہ سیٹھ صاحب بنگلے پر موجود نہیں ہیں۔ اس نے تم سے کہا کہ تم اس کا وزیٹنگ کارڈ لے جا کر میڈم کو دے دو، وہ اسے اندر بلا لیں گی۔ تم نے ایک لمحہ سوچا، پھر ملزم کی تجویز پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ گیٹ پر رکا رہا اور تم اس کا وزیٹنگ کارڈ لے کر اندر مقتولہ نیلوفر کے پاس پہنچ گئے۔ اسے جا کر ساری کتھا سنائی۔ اس نے کہا، تم ملزم کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، وہ آ رہی ہے۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

یہ وہ بیان تھا جو اس نے پہلے پولیس کو دیا تھا اور ازاں بعد معزز عدالت کے روبرو ریکارڈ کرایا تھا۔ میں اس کے قدموں کے نشانات پر قدم رکھتے ہوئے چاروں خانے چت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے میرے خاموش ہونے پر اثبات میں گردن ہلائی اور تائیدی انداز میں بولا۔

''جی ہاں......ایسا ہی ہوا تھا۔''

''اس کے بعد ملزم اپنا سیاہ بریف کیس ہاتھ میں تھامے تمہاری معیت میں اس بنگلے کے ڈرائنگ روم تک پہنچ گیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

"نہیں جناب! آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔"

اُس کی بات ختم ہوئی ہی تھی کہ عدالت کے کمرے میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ حاضرینِ عدالت آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ ان میں سے بعض کی آواز اتنی بلند تھی کہ وہاں ہلکے قہقہے اُبھرتے بھی سنائی دیئے۔ میں اس تازہ ترین صورتِ حال کی وجہ سے بخوبی آگاہ تھا۔ لہٰذا جج کی جانب دیکھتے ہوئے میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"جنابِ عالی! استغاثہ کا ایک معزز گواہ مسٹر انور کمال چند روز قبل عدالت کے روبرو یہ بیان دے چکا ہے کہ فیلڈ آفیسر اور آؤٹ ڈور کام کرنے والے افراد چھٹی کے وقت تمام متعلقہ سامان دفتر ہی میں چھوڑ کر گھر کی راہ لیتے ہیں۔ گواہ نے اس بات کی تصدیق بھی کی تھی کہ وقوعہ کے روز ملزم اپنا سیاہ بریف کیس دفتر میں چھوڑ کر ٹھیک سات بجے گھر روانہ ہو گیا تھا اور اب......" میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر وٹنس باکس میں کھڑے سلطان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

"استغاثہ کے گواہ سلطان کا دعویٰ ہے کہ وقوعہ کی رات آٹھ بجے اس نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو سیاہ بریف کیس اٹھائے مقتولہ کے بنگلے کے ڈرائنگ روم تک جاتے دیکھا تھا۔ اس صورتِ حال کی روشنی میں تینوں میں سے کوئی ایک بات درست ہو سکتی ہے۔ اول، ملزم کی دو شخصیات ہوں جو بیک وقت دو مختلف جگہوں پر مصروفِ عمل بھی رہتی ہوں۔ دوم، استغاثہ کے گواہ مسٹر سلطان کی بینائی اسے کوئی سنگین نوعیت کا دھوکا دے رہی ہو۔ سوم، ملزم وارث علی وقوعہ کے روز آٹھ بجے نہیں بلکہ سیاہ بریف کیس اٹھائے لگ بھگ سوا چھ بجے جائے واردات پر پہنچا ہو......!"

میں نے حاضرینِ عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور وکیلِ استغاثہ کو دانستہ نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"یور آنر! اگر ہم امکانِ اوّل کا جائزہ لیں تو اسے رد کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔ عدالت کسی بھی قانون کی رو سے یہ تسلیم نہیں کرے گی کہ ملزم چار جنوری یعنی وقوعہ کے روز اپنی دو شخصیات کے ساتھ بیک وقت قیوم آباد اور مقبول آباد میں نہ صرف موجود تھا بلکہ وہ کسی نہ کسی کارروائی میں بھی مصروف تھا۔ امکان دوم کو غلط یا درست ثابت کرنے کے لئے ہمیں کسی ماہر امراضِ چشم سے گواہ سلطان کی آنکھوں کا معائنہ کرانا پڑے گا۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ گواہ کی نظر بالکل درست ثابت ہو گی لہٰذا امکان دوم بھی خود بہ خود خارج از امکان کی صورت اختیار کر جائے گا۔"

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنے مؤکل کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے سلسلۂ دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''امکان سوم ہی وہ واحد امکان ہے جو ہر لحاظ سے راست دکھائی دیتا ہے۔ یعنی وقوعہ کے روز ملزم کم و بیش سوا چھ بجے جائے واردات پر پہنچا تھا جبکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مقتولہ نیلوفر کو رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان مجرمانہ حملے کا نشانہ بنانے کے بعد گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس صورتِ حال میں میرا مؤکل اور اس کیس کا ملزم وارث علی سراسر بے گناہ نظر آتا ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی یا اتفاقیہ سازش کے تحت اس مقدمے میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لہٰذا میں معزز عدالت سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ میرے مؤکل کو باعزت بری کرنے کے احکام صادر کرے۔''

جج نے بڑے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور سوال کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ کی جرح مکمل ہوگئی یا آپ استغاثہ کے گواہ مسٹر سلطان سے مزید کوئی سوال پوچھیں گے؟''

جج کا حتمی اور دوٹوک انداز دیکھ کر وکیلِ استغاثہ تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس وقت اس کے اندر ایک طوفانی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ اس اندیشے نے اسے بوکھلا کر رکھ دیا تھا کہ کہیں جج اسی وقت ملزم کے حق میں فیصلہ نہ سنا دے۔ واقعی، جج کے تیور کچھ اسی نوعیت کے دکھائی دے رہے تھے۔ جج نے سوال مجھ سے کیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، وکیلِ استغاثہ اضطراری لہجے میں بول اُٹھا۔

''جنابِ عالی! ابھی تو استغاثہ کا ایک اہم گواہ باقی ہے....... مقتولہ کا شوہر فرید عباس۔''

جج نے استغاثہ کے گواہوں کی فہرست پر نگاہ ڈالی اور اُلجھے ہوئے لہجے میں وکیلِ استغاثہ سے استفسار کیا۔ ''تو پھر؟''

جج کے اس مختصر سے سوال نے وکیلِ استغاثہ کو گڑبڑا دیا۔ اُس نے میرا نمبر اُٹھالیا تھا۔ اب کی بار میں نے اس کے ساتھ یہی سلوک کر کے حساب چکتا کر دیا۔ اس سے قبل کہ وہ جج کے استفسار کے جواب میں لب کشائی کرتا، میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے جلدی سے کہہ دیا۔

''جنابِ عالی! دراصل میرے فاضل دوست کو یہ خدشہ بے چین کئے ہوئے ہے کہ کہیں معزز عدالت اسی پیشی پر مقدمے کا فیصلہ نہ سنا دے۔ تبھی یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ استغاثہ کا ایک گواہ ابھی باقی ہے۔''

میری اس دردناک چوٹ پر وکیلِ استغاثہ تلملا کر رہ گیا۔ عدالت کا احترام ملحوظ تھا ورنہ

اس کے تاثرات سے تو یہی جھلکتا تھا کہ اگر میں اس وقت کمرۂ عدالت میں نہ ہوتا تو وہ میری تکہ بوٹی کر کے رکھ دیتا۔

جج نے برا سا منہ بنایا اور قدرے طنزیہ لہجے میں سوال کیا۔ ''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

اس جملے سے اُس کی مراد یہ تھی کہ وہ کسی گواہ کو نظر انداز یا فراموش کر کے مقدمے کا فیصلہ کیسے سنا سکتا ہے۔ میرے کٹیلے وار اور جج کی ناگواری سی برہمی پر وکیلِ استغاثہ بل کھا کر رہ گیا تاہم منہ سے کچھ نہ بولا۔ میں نے جج کے استفسار کے جواب میں کہا۔

''جنابِ عالی! میرے فاضل دوست نے مجھے یاد دلایا ہے کہ ابھی استغاثہ کا ایک اہم گواہ میری جرح کا بڑی بے تابی سے انتظار کر رہا ہے۔ میں اس یاد دہانی کے لئے وکیلِ استغاثہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور جہاں تک وٹنس باکس میں کھڑے استغاثہ کے گواہ سلطان کا تعلق ہے تو اس سے میں چند سوالات مزید کرنا چاہوں گا۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ......آنکھوں کی سُوئیاں باقی ہیں! میں یہی ''سُوئیاں'' نکالنا چاہتا ہوں تاکہ اس آفاقی قانون کو تقویت مل سکے کہ کبھی کوئی شے خالی نہیں رہتی۔'' میں لمحہ بھر کو رُکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! میرے مؤکل کو اس کیس میں ملوث کر کے اس کے لئے پھانسی کا ایک پھندا تیار کیا گیا تھا۔ اگر میں ملزم وارث کی گردن کو اس پھندے میں فٹ نہیں ہونے دوں تو اس میں پھندے بے چارے کا کیا قصور ہے؟ اسے تو کوئی نہ کوئی گردن چاہئے نا!......اس بات میں تو کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی کہ مجرمانہ حملے اور قتل کی ایک سنگین واردات ہوئی ہے۔ واردات ہوئی ہے تو اس کا کوئی ذمہ دار بھی ہے۔ لہٰذا، میں اتمام حجت کے طور پر استغاثہ کے گواہ سے چند اہم سوال کروں گا۔ ممکن ہے، بھوکے پیاسے پھندے کی مراد برآئے۔ لیکن اس سلسلے میں، میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا!''

''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔'' جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

جج کا یہ موافق اور حوصلہ افزاء جملہ میری مہمیز کے لئے بہت کافی تھا۔ میں نے مقتولہ کے گیٹ کیپر اور اس کیس میں استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آنے والے سکھر کے سلطان کو اپنی جرح کی چکی میں پیس ڈالا۔

''سلطان صاحب!'' اس مرتبہ میں نے اُسے قدرے شائستہ انداز میں مخاطب کیا۔ یہ کچھ ایسی نوعیت کی خاطر داری تھی جو بکرے کو ''قربان'' کرنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ میں نے بھی اس سے بڑے منفرد انداز میں قربان کرنے کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ ''آپ نے پہلے پولیس کو اور بعد ازاں معزز عدالت کے روبرو جو بیان دیا ہے اس کی روشنی میں آپ نے

وقوعہ کے روز جب اپنی مالکن مقتولہ نیلوفر کو اس کے بیڈ روم میں بے آبرو اور زندگی سے خالی دیکھا تو آپ پہلے ملزم کی تلاش میں بنگلے سے باہر آئے۔ بہ قول آپ کے، ملزم آپ کو کہیں دکھائی نہ دیا۔ پھر آپ نے بنگلے کے اندر پہنچ کر مقتولہ کے شوہر فرید عباس کو فون کیا۔ لیکن یہ اتفاق ہے کہ آپ کی اُس سے بات نہ ہوسکی۔ کیونکہ وہ گھر آنے کے لئے اپنے دفتر سے نکل چکا تھا۔ آپ کے اس بیان کی تصدیق یا تردید کے چکر میں پڑے بغیر ہم آگے بڑھتے ہیں...... جب مقتولہ کا شوہر فرید عباس جائے وقوعہ پر پہنچتا ہے۔''

یہاں تک کہنے کے بعد میں نے دانستہ لمحاتی توقف کیا، پھر استغاثہ کے گرد پھیلائے ہوئے اپنے جال کو سمیٹتے ہوئے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھا دیا۔

''مسٹر سلطان! کیا یہ صحیح ہے کہ جب مقتولہ کا شوہر اپنی گاڑی میں جائے واردات پر پہنچا تو اسی لمحے گھریلو ملازمہ بھی ایک جانب سے نمودار ہوئی تھی؟ سلیمہ اپنے وقت پر چھٹی کر کے جا چکی تھی۔ شاید وہ کسی ضروری کام سے واپس آئی تھی؟''

''ہاں...... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''اس کا کچھ ضروری سامان بنگلے پر رہ گیا تھا۔ وہ وہی سامان لینے آئی تھی۔ بہر حال، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' جواب کے اختتام پر اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں نے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مسٹر سلطان! آپ کی یادداشت بڑی کمال کی ہے۔ واہ، واہ...... آپ کو تو یہ بھی یاد ہوگا کہ جب مقتولہ کا شوہر بنگلے پر پہنچا اور...... ملازمہ اپنا سامان لینے واپس آئی، اس وقت...... اس لمحے پڑوس والے بنگلے کا ملازم محمد حسین اتفاق سے گیٹ پر موجود تھا۔ تھوڑی دیر پہلے آپ نے اسے اپنے بنگلے میں ہونے والی واردات کے بارے میں بتایا تھا۔ محمد حسین اپنے گیٹ پر کھڑا تھا نا؟''

''ہاں، کھڑا تھا۔'' وہ اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''لیکن ان فضول سے سوالات سے آخر آپ کا مقصد کیا ہے؟''

میں نے ڈرامائی انداز میں اپنے کانوں کو چھوا، پھر تنبیہی لہجے میں کہا۔ ''توبہ کریں سلطان صاحب! آپ ان نہایت ہی اہم سوالات کو فضول کہہ رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ ان سوالات سے برآمد ہونے والے نتائج کس طور پر آپ کی درگت بنائیں گے۔''

وہ خفگی آمیز سراسیمہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے ڈانٹ سے مشابہہ سخت لہجے میں کہا۔ ''مسٹر سلطان! اب میں آپ سے جو سوال کرنے جا رہا ہوں، اس کا بہت سوچ سمجھ کر جواب دینا۔ اس سلسلے میں پہلے جیسی غلط بیانی سے

کام نہیں چلے گا۔ کیونکہ میں جو حقیقت بیان کرنے جا رہا ہوں اس کے تین عینی گواہ ہیں یعنی فرید عباس، محمد حسین اور سلیمہ بی بی۔"

اس کے چہرے اور آنکھوں میں نامعلوم اور معلوم اُلجھنوں کا ایک گنجلک جال سا پھیل گیا۔ پہلی مرتبہ وہ مجھے متذبذب اور خوف زدہ دکھائی دیا۔ اُس کی ڈھٹائی اور ہٹ دھرمی اچانک غائب ہو گئی تھی اور وہ اضطراری انداز میں بار بار وکیلِ استغاثہ کو دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ "مسٹر سلطان! کیا یہ سچ ہے کہ وقوعہ کی رات، مقتولہ کے شوہر کی آمد پر جب آپ نے اسے بنگلے میں پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا تو اس نے آپ کو بری طرح جھڑک دیا تھا........ اور تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے بنگلے کے اندر داخل ہو گیا تھا؟"

تھوڑے سے تامل کے بعد اُس نے جواب دیا۔ "ہاں........ یہ سچ ہے۔"

سلطان کے بڑی سرعت سے زائل ہوتے اعتماد نے مجھے بتا دیا کہ میں نے اس کی دُکھتی رگ سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی۔ میں ادب آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بڑے جارحانہ انداز میں اس سے مخاطب ہوا۔

"مسٹر سلطان! کیا تم معزز عدالت کے سامنے اپنے مالک کی "جھڑکی" کی وضاحت کرو گے؟........ عدالت ان الفاظ سے آگاہی حاصل کرنا چاہتی ہے جو تمہیں ڈانٹ پلاتے وقت مقتولہ کے شوہر فرید عباس کی زبان سے ادا ہوئے تھے........ اور اس امر کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنے ذہن سے محو نہیں ہونے دینا کہ اس حقیقت کے تین تین عینی شاہد یعنی آئی وِٹنس موجود ہیں۔"

اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ مجھے کڑی مصیبت میں دکھائی دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ ابھی وٹنس باکس سے نکل کر بھاگ جائے گا۔ لیکن میں اسے ایسی کسی کوشش کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے تو میں نے اسے اپنی جرح کے جال میں پھانسا تھا۔ پھندے میں پھنسے ہوئے شکار کو شکاری کبھی جانے نہیں دیتا۔ میں اُسے کیسے چھوڑ دیتا؟"

میرے اس چبھتے ہوئے سوال نے اس کا چہرہ متغیر کر دیا تھا۔ وہ تیزی سے پہلو بدلتے ہوئے بار بار وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے رُعب دار آواز میں کہا۔

"مسٹر سلطان! میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ اگر تین سیکنڈ کے اندر اندر تم نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو میں معزز عدالت کے سامنے تمہارا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دوں گا۔"

سچی بات تو یہ ہے کہ میں اُس کے ''کچے چٹھے'' کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ بشارت نے اپنی ''ریسرچ'' کے دوران مقتولہ کے پڑوس والے بنگلے کے ایک ملازم محمد حسین سے دوستی کر لی تھی اور یہ جاننے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وقوعہ کے روز مقتولہ کے شوہر فرید عباس نے اپنے ملازم سلطان کو بری طرح ڈانٹا تھا۔ مالک اپنے ملازمین کو ڈانٹتے ہی رہتے ہیں، یہ کوئی خاص بات نہیں۔ لیکن فرید عباس کی ''ڈانٹ'' میں ایک ایسا نکتہ پوشیدہ تھا جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ نکتہ موجودہ صورتِ حال سے لگا نہیں کھاتا تھا۔

''چور کی داڑھی میں تنکا'' کے مصداق میرے استفسار پر سلطان کے بری طرح گھبرا جانے نے مجھے بتا دیا کہ دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ وہ پوری دال ہی کالی ہے۔ میری تین سیکنڈ کی دھمکی نے اُسے بنیاد سے ہلا دیا اور وہ نہایت ہی گھبرائے ہوئے انداز میں بولا۔

''انہوں نے مجھ........ سے کہا تھا........ تم یہاں کھڑے........ کیا کر رہے ہو؟''

'تم اپنے مالک کی ڈانٹ میں ایڈیٹنگ کر رہے ہو مسٹر سلطان!'' میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، گھی سیدھی اُنگلی سے نہیں نکلے گا۔ تمہارے جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لئے سلیمہ اور محمد حسین کو اندر بلانا ہی پڑے گا۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے اچانک ایسی نظر سے عدالت کے کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا جیسے باہر کھڑے محمد حسین اور سلیمہ کو اندر آنے کا اشارہ کر رہا ہوں۔ یہ ایک میری نفسیاتی چال تھی جو بروقت اور مؤثر ثابت ہوئی۔ سلطان نے کٹہرے کی ریلنگ کا سہارا لیتے ہوئے مُردہ سے لہجے میں کہا۔

''مم........ مجھے صحیح الفاظ........ یاد نہیں آ رہے........ فرید صاحب نے شاید........ یہ کہا تھا........ ابھی تک تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کوئی بات نہیں مسٹر سلطان!'' میں اُس کے انتہائی قریب چلا گیا اور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہیں صحیح الفاظ یاد نہیں آ رہے تو میں یاد دلاتا ہوں۔'' میں نے لمحہ بھر کو توقف کیا، پھر نہایت ہی سنسنی خیز لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر سلطان! وقوعہ کی رات مقتولہ کا شوہر فرید عباس جیسے ہی اپنی گاڑی سے اُترا اور اس کی نظر تم پر پڑی تو اس نے چیخ کر غصیلے انداز میں کہا تھا........ تم گئے نہیں ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو؟........ تمہارا یہ بیان مبنی بر دروغ ہے کہ پہلے تم نے فرید عباس کو وہاں پیش آنے والی صورتِ حال سے آگاہ کیا، اس کے بعد فرید عباس نے تمہیں ڈانٹ پلائی تھی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے، فرید عباس نے تم پر نگاہ پڑتے ہی تمہیں بری طرح جھڑک دیا تھا۔ اس کے بعد

تم نے وقوعہ کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ بتاؤ، میں نے ابھی فرید عباس کے جن ڈانٹ آمیز کلمات کا ذکر کیا ہے اس میں کوئی غلطی یا خامی موجود ہے؟''

''نن........نہیں۔'' وہ نحیف سی آواز میں بولا اور اس کے ساتھ ہی نفی میں گردن ہلا دی۔

''اس کا مطلب ہے، تم تصدیق کرتے ہو کہ وقوعہ کے روز فرید عباس نے تم پر نظر پڑتے ہی یہ کہا تھا........تم گئے نہیں؟ ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''جج......جی۔'' وہ اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پھنسی پھنسی آواز میں بولا۔ ''انہوں نے غصے کے عالم میں مجھ سے یہی کہا تھا۔''

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس روز تمہیں کہیں جانا تھا۔'' میں نے اُسے تیز نظر سے گھورتے ہوئے کہا۔ ''اسی لئے تمہیں وہاں دیکھ کر فرید عباس کو شدید حیرت ہوئی تھی اور اس نے تمہیں ڈانٹ دیا تھا۔''

اُس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔ ''مسٹر سلطان! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تمہیں کہاں جانا تھا؟''

اُس نے ایک مرتبہ پھر اضطراری انداز میں اپنی گردن کو سہلایا اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''پپ........پانی........!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

❋❋❋

آئندہ پیشی پر سلطان نے اقبالِ جرم کر لیا۔

عدالتی کارروائی کے دوران ہر گزرتے لمحے کے ساتھ جو جو اہم باتیں ثابت ہو کر سامنے آتی ہیں، انہیں باقاعدہ نوٹ کر کے ایک ریکارڈ کی صورت دے دی جاتی ہے۔ میں نے اب تک کی جرح میں اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کر دیا تھا۔ ازیں علاوہ، گزشتہ پیشی پر میں نے استغاثہ کے اہم گواہ سلطان کو جس طرح اپنے چبھتے ہوئے سوالات کی چکی میں پیس ڈالا تھا اس سے کیس کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ بالآخر وہ گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ اُس نے اقرارِ جرم کرتے ہوئے ایک طویل اور سنسنی خیز بیان دیا جس میں اُس نے مقتولہ کے شوہر فرید عباس کو بھی رگڑ ڈالا۔ وکیلِ استغاثہ فرید عباس کی گواہی کا انتظار ہی کرتا رہ گیا اور میں نے استغاثہ کے اس گواہ کو ایک مجرم کی حیثیت سے کٹہرے میں لا کھڑا کیا تھا۔ آپ کے تجسس کی تسکین کے لئے میں سلطان کے بیان کا خلاصہ یہاں پیش کر رہا ہوں۔

سلطان کے مطابق، فرید عباس نے مال و جائیداد اور کاروبار کے حصول کی خاطر اپنی بیوی مقتولہ نیلوفر کو موت کے گھاٹ اُتارنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کام کے لئے اس نے سلطان کا انتخاب کیا تھا۔ پروگرام کے مطابق، سلطان نے گلا گھونٹ کر نیلوفر کو موت کے گھاٹ اُتارنا تھا۔ فرید عباس گھر آ کر اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتا اور مطمئن ہونے کے بعد اسے پچاس ہزار کے کرنسی نوٹ دے دیتا۔ وہ یہ رقم لے کر کہیں بھی غائب ہو جاتا۔ فرید عباس دنیا والوں کو یہی بتاتا کہ اس کا گھریلو ملازم اس کی بیوی کو قتل کر کے کہیں فرار ہو گیا ہے اور جاتے ہوئے زیورات اور نقدی بھی چرا کر لے گیا ہے۔ سلطان نے مطالبہ کیا تھا کہ وہ پچاس ہزار روپے اسے پیشگی دے دے تاکہ اپنا کام کرنے کے بعد وہ کہیں بھی نکل جائے۔ لیکن فرید عباس یہ رِسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے سلطان سے کہا کہ وہ اپنا ''کام'' کر کے طارق روڈ پر ایک ہوٹل میں اس کا انتظار کرے گا۔ وہ گھر پہنچ کر اس کی کارکردگی کا جائزہ لے گا، پھر ہوٹل میں آ کر ادائیگی کر دے گا۔ سلطان اس بات کے لئے راضی ہو گیا۔ اسی لئے فرید عباس نے سلطان کو دیکھتے ہی حیرت اور غصے کے ملتے جلتے الفاظ میں بے ساختہ کہا تھا......تم گئے نہیں؟ ابھی تک یہاں کیا کر رہے ہو؟

سلطان شاید طے شدہ پروگرام پر عمل کر ڈالتا لیکن وارث علی کی آمد نے اُسے ایک نئی راہ سجھا دی اور یہ بات بھی اُس کی ایک ''حماقت'' کے بعد اُس کے ذہن میں اُجاگر ہوئی تھی۔ فرید عباس کے ساتھ طے تھا کہ وہ رات آٹھ اور نو بجے کے درمیان گلا گھونٹ کر نیلوفر کی زندگی کا چراغ گل کر دے گا۔ وہ اسی پروگرام پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ لیکن جب ملازم وارث علی بنگلے سے رخصت ہوا تو اس کے دل میں کھد بد ہونے لگی کہ اندر جا کر دیکھے، نیلوفر کیا کر رہی ہے۔ اسی اشتیاق کے باعث اس نے نیلوفر کے بیڈ روم کے دروازے تک کئی چکر لگائے اور ایک مرتبہ وہ بیڈ روم میں داخل ہو ہی گیا۔ مقتولہ اس وقت ڈریسنگ کے سامنے بیٹھی کہیں باہر جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔ نیلوفر ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ بناؤ سنگھار نے اُس کے حُسن اور دلکشی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ سلطان کے مطابق، اسی لمحے شیطان نے اُس کے ذہن کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اُس کے ذہن میں صرف ایک ہی سوچ تھی کہ اگر اُس کے ہاتھوں سے اس حُسن و شباب کے خزانے کو دفن ہونا ہی ہے تو وہ بھی کیوں نہ تھوڑا فیض اُٹھا لے!

اور اُس نے اپنی اس شیطانی سوچ پر عمل کر ڈالا!

جب وہ اپنی اور اپنے مالک فرید عباس کی خواہش کی تکمیل کر چکا تو اُسے ایک گہری تشویش نے آ گھیرا۔ فرید عباس نے اُس کے ذمے جو کام لگایا تھا اُس نے اس سے کہیں زیادہ

''سرانجام'' دے ڈالا تھا۔لہٰذا اُسے یقین تھا کہ اُس کے پچاس ہزار روپے تو پتہ نہیں اسے ملیں گے یا نہیں ملیں گے البتہ یہ ممکن ہے، فرید عباس کوئی نئی چال چل کر اُسے کسی مصیبت میں ضرور گرفتار کرا سکتا تھا۔ چنانچہ اس کے اُلجھے ہوئے اور پریشان دماغ نے یہی مشورہ دیا کہ اس بنگلے پر پیش آنے والے واقعات کی پوری ذمہ داری اگر وارث علی کے کندھوں پر ڈال دی جائے تو بچت ہی بچت ہے۔

میں حالات و واقعات کی روشنی میں تمام حقائق کو ٹھوس دلائل اور ثبوت کے ساتھ معزز عدالت کے علم میں لا چکا تھا۔لہٰذا آئندہ پیشی پر جج نے میرے مؤکل اور اس مقدمے کے ملزم وارث علی کو باعزت بری کر دیا۔

وارث علی اپنی رہائی پر بہت خوش تھا۔ اس وقت اُس کا بڑا بھائی دیانت علی اور باپ امانت علی بھی وہاں موجود تھے۔ اور ظاہر ہے، وہ بھی اپنے گھر کے ایک فرد کی بریّت پر خوش تھے۔ میں نے مذاق کے انداز میں وارث علی سے پوچھ لیا۔

''کیا اب بھی تم اسی قسم کی نوکری کرو گے یا........؟''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ دونوں ہاتھ اپنے کانوں کو لگاتے ہوئے بولا۔

''بیگ صاحب! میری توبہ........ بس ایک تجربہ ہی کافی ہے۔ ملازمت میں ملازم ہمیشہ زیر رہتا ہے اور مالک زبر!........ جب اللہ نے ہمیں عزت دے رکھی ہے تو پھر اپنے خاندانی کام کو ہی کیوں نہ آگے بڑھاؤں۔ نوکریوں وغیرہ میں کیا رکھا ہے، سوائے پریشانی اور خواری کے۔''

امانت علی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ انداز میں کہا۔''اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ دیر ہی سے سہی، لیکن اسے عقل تو آ گئی۔''

امانت علی کا اشارہ اپنے بیٹے وارث علی کی جانب تھا۔ میں نے اس موقع پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وارث علی! تم حالات کے نشیب و فراز میں اس طور اُلجھ کر رہ گئے تھے کہ تمہیں زمانے کے زیر و زبر کا بہ خوبی اندازہ بلکہ تجربہ ہو گیا ہے۔ لیکن ابھی ''پیش'' کا تجربہ باقی ہے۔''

''پیش؟'' وہ متعجب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''ہاں........ پیش!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔''جس طرح ''زیر'' اور ''زبر'' ہوتے ہیں نا، بالکل ویسے ہی ''پیش'' بھی ہوتا ہے۔''

''تو میں ''پیش'' کے تجربے سے کیسے گزروں؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس تجربے سے گزرنے کا واحد ذریعہ شادی ہے۔''

اُس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اُس نے کن انکھیوں سے اپنے باپ اور بھائی کی طرف دیکھا، پھر گردن جھکاتے ہوئے بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''ٹھیک ہے بیگ صاحب!........ میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔''

''سوچو گے تو ایک دن عمل کرنے کے فیصلے پر بھی پہنچ جاؤ گے۔''

اُس نے دھیرے سے اثبات میں گردن ہلا دی۔

..........*

اُلجھی ڈور

ایک روز میں عدالت کے کمرے سے نکل کر پارکنگ کی طرف جا رہا تھا تو اپنے عقب میں ایک نامانوس سی آواز سن کر چونک اٹھا۔ اس چونکنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ کسی شخص نے اجنبی آواز میں مجھے ہی پکارا تھا۔

"بیگ صاحب! ذرا ایک منٹ۔"

لامحالہ مجھے رُکنا پڑا۔ کیونکہ پکارنے والا جو کوئی بھی تھا اسے مجھ سے کوئی کام تھا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو وہ ایسے پُر اشتیاق انداز میں مجھے آواز نہ دیتا۔ رُکتے ہی میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا۔ دس بارہ قدم کے فاصلے پر مجھے ایک دُبلا پتلا، دراز قامت شخص نظر آیا۔ یقیناً اسی شخص نے مجھے آواز دی تھی۔ کیونکہ وہ مجھ تک پہنچنے کی کوشش میں دکھائی دیتا تھا۔ آس پاس اس وقت کوئی اور بندہ بشر نظر نہیں آ رہا تھا اس لئے بھی مجھے یقین تھا کہ ایک لمحے پہلے اس کے سوا کسی اور نے مجھے نہیں پکارا ہو گا۔

وہ دراز قامت شخص میرے قریب آیا اور خاصی کراری آواز میں بولا۔

"السلام علیکم بیگ صاحب!"

"وعلیکم السلام!" میں نے سنجیدہ لہجے میں اُس کے سلام کا جواب دیا۔

اُس نے اسی پر بس نہیں کی اور باقاعدہ مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے معانقے کی فرمائش نہیں کی تھی ورنہ خوامخواہ میں ایک آزمائش سے دوچار ہو جاتا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ میں معانقے کے خلاف ہوں یا میں اسے پسند نہیں کرتا بلکہ میں جس مصروف ترین پیشے سے وابستہ ہوں اس کا تقاضا ہے کہ "نہ جان، نہ پہچان" والے معاملے میں زیادہ بے تکلفی ٹھیک نہیں ہوتی۔ پھر عدالت کی مثال کسی میلے ٹھیلے یا پکچر ہاؤس جیسی ہی ہے جہاں بھانت بھانت کے لوگ گھومتے پھرتے ہیں جن میں ہر شعبۂ جرم کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا علیک سلیک خصوصاً معانقے کے معاملے میں

خاصا محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پتہ نہیں کس وقت کون شخص ''کیا کام'' دکھا جائے۔ میں یہاں پر خاص طور پر صرف ان لوگوں کا ذکر کر رہا ہوں جو آپ کے لئے شناسا نہ ہوں ورنہ جان پہچان کے اور دیکھے بھالے لوگوں کے معاملے میں ایسی کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔

مجھے پکارنے والا وہ دُبلا پتلا، دراز قامت شخص بھی چونکہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا لہٰذا میں نے معانقے کے سلسلے میں ایک احتیاطی اصول کا ذکر کر دیا۔ اس شخص نے بڑے پُر جوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا پھر ایک معروف مجسٹریٹ کا نام لے کر پوچھنے لگا۔

''آپ ان کی عدالت میں تھے؟''

اس نے کسی شک وشبے والی بات نہیں کی تھی لہٰذا میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''ہاں!''

وہ بولا۔ ''میں نے آپ کو وہاں مصروف دیکھ لیا تھا۔ اسی لئے عدالت سے باہر آپ کا انتظار کر رہا تھا۔''

''اچھا، اچھا......'' میں نے جلدی سے کہا، پھر پوچھا۔ ''آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟''

میں ابھی تک اس شخص کی غرض وغایت کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ کسی کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہ رہا ہوگا۔ اس نے جتنے اعتماد سے ''بیگ صاحب!'' کہہ کر مجھے پکارا تھا۔ ازیں علاوہ مذکورہ عدالت اور وہاں کے مجسٹریٹ کا حوالہ دیا تھا، اس سے لگتا تھا کہ وہ عدالت اور عدالتی معاملات میں کسی نہ کسی طور واسطہ ضرور رکھتا ہے۔ میں انہی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ اس کا جواب میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''بیگ صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ واقعی، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے اسی لئے تو میں آپ کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں۔ بندے کو غلام مرتضٰی کہتے ہیں۔'' بات کے اختتام پر اس نے اپنا رسمی تعارف بھی کرا دیا۔ تعاقب والی بات بھی اس نے خوب کہی تھی۔

''جی غلام مرتضٰی صاحب!'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''اگر آپ کسی کیس کے سلسلے میں مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں یا میرے توسط سے آپ کو اور کسی قسم کا قانونی تعاون درکار ہے تو ایک گھنٹے بعد آپ میرے دفتر آجائیں۔'' پھر میں نے اسے اپنے دفتر کا پتہ بتایا جو سٹی کورٹ کے نزدیک ہی ایک عمارت میں واقع تھا اور کہا۔ ''میں آپ کو دفتر ہی میں مل جاؤں گا۔''

وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! میں نے آپ کا دفتر دیکھ رکھا ہے لیکن

مجھے آپ سے جو کام ہے، اس کے لئے دفتر جانا ضروری نہیں۔" وہ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑنے کے بعد تجویزی لہجے میں بولا۔" کیوں نہ تھوڑی دیر کے لئے کینٹین میں بیٹھ جائیں۔ اسی بہانے آپ کے ساتھ ایک چائے پینے کا اعزاز بھی حاصل ہو جائے گا۔"

میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا کہ وہ عدالت اور عدالتی متعلقات سے بہ خوبی واقف تھا۔ اس کی تجویز پر عمل کرنے میں بھی مجھے کوئی قباحت نظر نہ آئی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا اور میرے لنچ میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ عموماً چائے کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ بھوک کی دشمن ہے۔ خالی پیٹ میں ایک کپ چائے ڈال دو تو سمجھو، کھانے کی چھٹی۔ لیکن میرے ساتھ چائے کا معاملہ اس کے بالعکس ہے۔ یہ اللہ کی نعمت میرے لئے ایک مؤثر اور عمدہ اپی ٹائزر کے طور پر کام کرتی ہے۔ بہرحال، ہر شخص کا اپنا اپنا مزاج اور اپنا اپنا تجربہ ہے۔

میں اُس غلام مرتضیٰ نامی دراز قامت شخص کے ساتھ عدالت کی کینٹین میں جا بیٹھا۔

"آپ مجھ سے کوئی کام کی بات کرنے والے تھے؟"

"جی!" وہ کچھ اس انداز سے چونک کر میری جانب متوجہ ہوا جیسے میں نے اسے گہری نیند سے جگا دیا ہو۔ "وہ دراصل .... میں آپ کے لئے کچھ کام کرنا چاہتا ہوں۔" اُس نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔

"مثلاً .... آپ میرے لئے کیا کیا کر سکتے ہیں؟"

"میں اِدھر عدالت میں اور اُدھر عدالت کے باہر جگہ جگہ گھومتا پھرتا ہوں۔" اُس نے بتانا شروع کیا۔ "میرے پاس طرح طرح کی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیاں موجود ہوتی ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں آپ کو اچھی اور معیاری کہانیاں مہیا کر سکتا ہوں۔"

"میں ان کہانیوں کا کیا کروں گا بھلا؟"

"وہ .... وہ آپ سسپنس ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھتے ہیں نا" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس لئے آپ کو نت نئی کہانیوں کی ہر وقت ضرورت رہتی ہوگی۔ میں نے سوچا، اگر میں آپ کو منفرد قسم کی کہانیاں دینا شروع کر دوں تو آپ کے لئے کافی آسانی ہو جائے گی اور میرا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا۔"

"ایسی کسی کوشش میں آپ کا کیا بھلا ہو سکتا ہے مرتضیٰ!........ میرا مطلب ہے غلام مرتضیٰ صاحب!"

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ "میں نے یہی سوچ کر آپ سے کہانیوں والی بات کی ہے کہ چلو، اسی بہانے میری آمدنی کا ایک ذریعہ نکل آئے گا۔"

''دیکھو بھائی صاحب! سسپنس ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی جن کہانیوں کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس سلسلے میں ایک وضاحت کر دوں کہ وہ اِدھر اُدھر کی جمع کی ہوئی مرچ مسالے دار قصے کہانیاں نہیں ہوتیں بلکہ وہ میرے کامیاب کیسز کی روداد ہوتی ہے اور........''

''اوہ........!'' وہ قدرے مایوس سا ہو گیا۔ پھر ایک بوجھل بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے، میں بالکل غلط سمجھ رہا تھا۔''

''ہاں، ایسی ہی بات ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جو حقیقت ہے وہ میں نے آپ کے سامنے بیان کر دی ہے۔ مجھے افسوس ہے، آپ کی ایک متوقع آمدنی کا دروازہ کھلنے سے پہلے ہی بند ہو گیا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس میں آپ کا کیا قصور! جب میری قسمت ہی خراب ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟''

اس نے قسمت کی خرابی کا ذکر کچھ ایسے انداز سے کیا تھا کہ میں اپنے دل میں اس شخص کے لئے ہمدردی کے جذبات اُبھرتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ پتہ نہیں، وہ شخص بے روزگاری کی کسی صورت کا مارا ہوا تھا۔ میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں اسے کریدنے کی کوشش کروں اور ہو سکے تو اس کی کچھ مدد بھی کر دوں۔

بے روزگاری فی زمانہ سب سے بڑا عذاب ہے بلکہ اسے اگر ایک لعنت کہا جائے تو غلط نہیں ہو گا۔ کوئی ایسا انسان نہیں جس کے ساتھ پیٹ لگا ہوا نہ ہو اور یہ پیٹ ہر حال میں کھانے کو مانگتا ہے۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ حاملِ پیٹ روزگار والا ہے یا بے روزگار۔ امیر ہے یا غریب۔ اختیار والا ہے یا بے اختیار۔ اسے اس بات سے بھی کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے اندر پہنچنے والا کھانا جائز ذرائع اختیار کر کے حاصل کیا گیا ہے یا کسی ناجائز حرکت کا شاخسانہ ہے۔ شاید اسی بناء پر اسے ''جہنم'' اور ''پاپی پیٹ'' جیسے خطابات سے نوازا جاتا ہے۔

میں چند لمحات تک گہری نظروں سے غلام مرتضٰی کو دیکھتا رہا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھ لیا۔ ''غلام مرتضٰی صاحب! آپ کا اصل ذریعۂ روزگار کیا ہے؟''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور بتایا۔ ''بنیادی طور پر میں آپ کا ہم پیشہ ہوں جناب!''

اس انکشاف نے مجھے اُچھلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''یعنی آپ بھی ایک وکیل ہیں؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ اسی لئے متاملانہ انداز میں اس سے استفسار کیا۔ ''اگر آپ نے باقاعدہ وکالت پڑھ رکھی ہے تو پھر اس پیشے کو ذریعۂ روزگار کیوں نہیں بناتے؟ میرا خیال ہے، اگر آپ وکالت کی پریکٹس شروع کر دیں تو آپ کے جملہ مسائل چٹکی بجاتے میں حل ہو جائیں گے۔''

اُس نے اپنے بائیں ہاتھ سے ایک چٹکی بجائی، پھر قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''زندگی بڑی تلخ اور کڑوی ہے۔ اس کے مسائل یوں چٹکی بجاتے میں حل نہیں ہو جاتے۔ یہ الگ بات کہ سب لوگ آپ کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتے۔''

اُس نے یاس انگیز انداز میں توقف کیا اور رشک بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں منتظر رہا کہ وہ کچھ آگے بھی بولے۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

''بیگ صاحب! میں نے باقاعدہ وکالت کا امتحان پاس کیا ہے اور اس سلسلے کی تمام اسناد اور سرٹیفکیٹ وغیرہ بھی میرے پاس ہیں۔ میں نے باقاعدہ پریکٹس کرنے کی کوشش بھی کی لیکن بری طرح ناکام رہا۔ کچھ عرصہ تک ایک نامور اور سینئر وکیل کے ساتھ بھی وزنی فائلیں اُٹھائے اُس کے دفتر سے عدالت اور عدالت سے دفتر کے چکر کاٹتا رہا۔ سوچا تھا، شاید اس طرح کامیابی کا کوئی راستہ نکل آئے۔ مگر اس محاذ پر بھی مجھے ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آپ یقین نہیں کریں گے، میں اس بے روزگاری کے ہاتھوں کس قدر پریشان ہوں........ اس پریشان دماغ اور بیمار سوچ کے ساتھ میں یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ شاید میں دنیا کا بدقسمت ترین شخص ہوں۔''

بولتے بولتے اُس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہاں پر مجھے ناکامی، مایوسی اور دل شکستگی کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ بے روزگاری کا عفریت جس تیزی، سفاکی سے زندگی کے مختلف شعبوں اور کام کے مختلف پیشوں کو نگلتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا اس کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا۔ میں ایسے کئی وکلاء کو بھی ذاتی طور پر جانتا تھا کہ جو دن بھر عدالت کے برآمدے میں کسی مؤکل کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے رہتے ہیں مگر مؤکل ہے کہ ان کے قریب نہیں پھٹکتا۔ ان میں سے بعض تو باقاعدہ یہ صدا لگاتے ہوئے بھی سنے گئے ہیں........ ''بھائی صاحب! کوئی کیس کروانا ہے؟ بہت سستے میں کر دوں گا۔'' مگر میں سمجھتا ہوں کہ ایسے تمام ناکام لوگوں، چاہے وہ وکلاء ہوں یا زندگی کے کسی دوسرے شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد........ ان کی نامرادیوں میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ غالب ہاتھ ان کی اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور خامیوں کا بھی ہوتا ہے۔

اس کی مدد کا خیال تو میرے دل میں پیدا ہو ہی چکا تھا، ایک قابلِ عمل آئیڈیا بھی فوراً ہی

سوچ گیا۔ میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں اس سے کہا۔ ''تم فوری طور پر میرے لئے کام کرنا شروع کر دو۔ اپنے دائیں بائیں نظر رکھو اور میرے لئے مختلف کیس پکڑتے رہو۔ میں تمہیں ہر کیس پر پانچ سو روپے دے سکتا ہوں۔ اس طرح اگر تم نے مہینے بھر میں چار پانچ کیس بھی میرے حوالے کر دیئے تو تمہارا روزگار چل نکلے گا۔ آگے اللہ مالک ہے!''

میں نے غلام مرتضٰی کو یہ پیشکش اس غرض سے نہیں کی تھی کہ خدانخواستہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے مکھیاں مارتا رہتا تھا۔ میرے پاس کیسز کی کبھی کمی نہیں رہی۔ میں محض اس کی مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں پانچ سو روپے کی بڑی اہمیت تھی اور کسی بے روزگار شخص کے لئے تو یہ رقم کچھ زیادہ ہی اہمیت کی حامل تھی۔ غلام مرتضٰی نے ایک لمحہ سوچنے میں ضائع نہیں کیا اور فوراً ہی میری اس پیشکش کو قبول کر لیا۔ میں نے اس کی تسلی کی خاطر مزید کہا۔

''اس دوران میں اس بات کا خیال بھی رکھوں گا کہ اگر کوئی آسان کیس ہاتھ لگ جائے تو میں وہ تمہارے ہاتھ سے ڈیل کراؤں۔ اس طرح تمہاری پریکٹس تو ہو گی ہی، اس کے ساتھ ہی تمہارے اعتماد میں اضافہ ہو گا۔ اور ظاہر ہے، ڈائریکٹ کوئی کیس ٹیکل کرنے پر آمدنی بھی بڑھے گی۔''

وہ فرطِ جذبات میں چند لمحات تک عقیدت بھری نظر سے مجھے دیکھتا رہا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''بیگ صاحب! لگتا ہے، آپ انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ ہو۔''

''بس، بس۔'' میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر قدرے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میں ایک گناہ گار، خطا کار انسان ہوں۔ مجھے انسان ہی رہنے دو۔''

''یہی تو آپ کا بڑا پن ہے۔'' وہ بدستور عقیدت بھرے انداز میں بولا۔

''ٹھیک ہے......'' میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ہپ پاکٹ میں سے والٹ برآمد کر لیا، پھر اس کے اندر سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر غلام مرتضٰی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رکھ لو۔ پہلا کیس مجھ تک پہنچانے کی فیس۔''

میں نے ''کمیشن'' کو ''فیس'' کا نام دے کر اس کا مان بڑھا دیا تھا۔ وہ حیرت اور اُلجھن بھری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''لل...... لیکن...... میں نے تو ابھی کوئی بھی کیس آپ کے حوالے نہیں کیا؟''

''جانتا ہوں۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں پہلے کیس کی فیس ایڈوانس میں دے رہا ہوں۔''

غلام مرتضٰی نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہ نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر اپنی جیب

میں ڈال لیا۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دُشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ اس وقت سخت ضرورت مند تھا۔

***

دو روز کے بعد غلام مرتضٰی میرے دفتر میں موجود تھا۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بتانے لگا۔

''بیگ صاحب!'' وہ پہلے سے بھی زیادہ بے تکلفی سے مخاطب ہوا۔ ''آپ نے ایڈوانس میں رقم دے کر مجھے ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ دو دن ہی میں، میں نے آپ کے لئے ایک کیس ڈھونڈ نکالا ہے۔''

میں نے اس کے عقب میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیس کہاں ہے؟''

''کیس کو میں اپنے ساتھ لے کر نہیں آیا۔'' وہ بے ساختہ بولا۔ ''سوچا، پہلے آپ سے ملاقات کرلوں، پھر اُسے بھی آپ سے ملوادوں گا۔''

– ''بہت اچھا کیا آپ نے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''بیگ صاحب! زاہدہ بہت ہی مظلوم لڑکی ہے۔'' وہ اپنی کوششوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بولا۔ ''اس کا سوتیلا باپ لیاقت اس پر بہت ستم ڈھاتا ہے .... حتیٰ کہ وہ اس پر بری نظر بھی رکھتا ہے۔ اگر زاہدہ کو جلد از جلد اس ماحول سے نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی تو کوئی بہت بڑا....... شرم ناک واقعہ بھی پیش آسکتا ہے۔ اس کے علاوہ زاہدہ کی ماں خدیجہ سے بھی اس کا رویہ بہت ظالمانہ ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہاری بات اور جذبات میری سمجھ میں آ گئے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم ایک ہمدرد اور پُرخلوص دل رکھتے ہو۔ لیکن یہ بات میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس صورتِ حال میں، میں کیا کرسکتا ہوں؟''

وہ چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا، پھر لایعنی سے انداز میں بولا۔ ''مجھے یہ تو پتہ نہیں، آپ کس طرح ان ماں بیٹی کی مدد کرسکتے ہیں۔ لیکن اتنی بات میں جانتا ہوں کہ آپ اگر قانون کا سہارا لیں تو ان کے لئے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔''

''دیکھو غلام مرتضٰی! پہلی بات تو یہ کہ جب تک زاہدہ یا اس کی ماں خدیجہ اپنے ساتھ ہونے والی ظلم و زیادتی کی شکایت لے کر گھر سے نہ نکلیں، ان کے لئے کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ اور یہ کہ انہیں یہ شکایت لے کر اپنے علاقے کے تھانے میں پہنچنا چاہئے یا پھر وہاں کی مصالحتی کونسل وغیرہ کے پاس جانا چاہئے۔ مجھے اُمید ہے، علاقے کا کونسلر ان کا مسئلہ حل کردے گا۔ یا

پھر تھانہ انچارج اس معاملے میں کوئی قانونی کارروائی ڈال سکتا ہے۔ یہ سیدھا سیدھا پولیس کیس ہے۔ اس میں فی الحال کسی وکیل کے لئے کارکردگی دکھانے کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔''

اُس کا منہ لٹک گیا اور وہ خاصا مایوس دکھائی دینے لگا۔ اُس کے چہرے کے مرجھائے ہوئے تاثرات کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں یہ خیال اُبھرا کہ غلام مرتضٰی کو زاہدہ اور اس کے گھر کے معاملے کی اتنی زیادہ فکر کیوں ہے۔ کیا یہ محض جذبۂ ہمدردی ہے یا پھر کوئی اور سلسلہ ہے؟ اسی بات کی تصدیق کے لئے میں نے اُس سے سوال کیا۔

''غلام مرتضٰی! کیا ان لوگوں سے تمہاری کوئی رشتے داری ہے؟''

''رشتے داری تو نہیں۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''بس محلے داری ہے۔''

''کوئی اور قریبی تعلق؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے تھوڑے تامل کے بعد نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے کہا۔ ''بس تو پھر زاہدہ اور اس کی ماں کے لئے جو کچھ کیا جا سکتا ہے اس کی تفصیل میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ تم اپنے طور پر انہیں گائیڈ کر سکتے ہو۔''

وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''ٹھیک ہے جناب! میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔''

اس نے کوشش کا وعدہ کیا اور مجھے سلام کر کے دفتر سے رخصت ہو گیا۔

میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ کوشش کے سلسلے میں اس نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا یا نہیں۔ البتہ ٹھیک چار روز کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس بار وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔

وہ اپنے ساتھ درمیانے قد کے ایک سانولے سے شخص کو بھی لے کر آیا تھا۔ مذکورہ شخص کی عمر تیس کے قریب رہی ہو گی۔ اس وقت ان دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ سخت پریشان دکھائی دیتے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ اُدھر گولیمار میں کوئی بڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے غلام مرتضٰی سے استفسار کیا۔ ''خیریت تو ہے؟ تمہارا رنگ کیوں اُڑا ہوا ہے؟''

''خیریت کہاں ہے بیگ صاحب!.......'' وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''پولیس نے معاملہ ہی اُلٹا دیا ہے۔''

میں یہی سمجھا کہ وہ زاہدہ کے سوتیلے باپ کی شکایت لے کر اپنے علاقے کے تھانے میں تھانہ انچارج سے ملنے پہنچے ہوں گے اور اس نے اُلٹا اُنہیں ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دیا ہو گا۔ اسی سوچ کے پیشِ نظر میں نے اس سے پوچھ لیا۔

”لگتا ہے پولیس والوں نے رپورٹ درج نہیں کی؟“

”ایسی بات نہیں ہے جناب!“ غلام مرتضیٰ نے بدستور اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔”ایک دن رپورٹ درج کی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ اگلے دن وہ لوگ زاہدہ کے سوتیلے باپ کو تھانے بلا کر سمجھائیں بجھائیں گے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا بلکہ ایک دن کے وقفے سے پولیس نے زاہدہ کو گرفتار کر کے حوالات میں ڈال دیا ہے۔“

”کیا؟.......“ میں اُچھل پڑا۔”یہ تو تم بڑی ہی عجیب کہانی سنا رہے ہو غلام مرتضیٰ!“

”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں بیگ صاحب!“

میری حیرت اُلجھن میں بدل گئی۔ میں نے پوچھا۔”پولیس نے زاہدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟“

”ٹھہریں جناب! میں بتاتا ہوں۔“ غلام مرتضیٰ کی بجائے اس کے ہم راہی سانولے شخص نے کہا۔”مرتضیٰ بھائی تو پریشانی میں حواس کھو بیٹھتے ہیں۔ یہ حالات کو صحیح طرح سے آپ کے سامنے پیش نہیں کر پا رہے۔“

وہ شخص جو کچھ بھی کہہ رہا تھا، میں اس سے صد فیصد اتفاق کرتا تھا۔ پریشانی میں کیا، میں نے خود دیکھا تھا کہ غلام مرتضیٰ بغیر پریشانی کے بھی معقول انداز میں اپنا مطمع نظر پیش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ شخص مزید کچھ کہتا، میں نے اس سے کہا۔

”آپ کی تعریف؟.......آپ نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا۔“

”میرا نام پرویز ہے وکیل صاحب!“ اس شخص نے جواب دیا۔”میں بھی گولیمار ہی میں رہتا ہوں۔ اُدھر میری ہارڈ ویئر اور سینیٹری فلنگ کی ایک چھوٹی سی دکان ہے۔“ یہاں تک بتانے کے بعد وہ لمحے بھر کے لئے خاموش ہوا پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”مرتضیٰ بھائی نہایت ہی نیک اور مخلص انسان ہیں۔ لیاقت کے گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی وجہ سے ہم اور دیگر محلے دار سخت کوفت میں تھے۔ مرتضیٰ نے آپ سے مشورہ کیا اور اسی مشورے کی روشنی میں ہم تین چار افراد مل کر تھانے پہنچے اور تھانے دار کو سارا قصہ کہہ سنایا۔ اس نے پوری توجہ سے ہماری بات سنی اور آخر میں سوال کیا، ہم میں سے مدعی کون ہے؟ ظاہر ہے، ہم میں سے کوئی بھی مدعی ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا ہم ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ تھانے دار نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا، میں محلے داروں کی شکایت پر اس وقت تک کوئی قانونی کارروائی نہیں کر سکتا جب تک زاہدہ یا اس کی ماں خدیجہ میں سے کوئی یہاں آ کر لیاقت کے خلاف رپورٹ درج نہ کرائے یا کم از کم ان میں سے کوئی ایک محلے داروں کے ساتھ ضرور

موجود ہو۔'' وہ لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا، ایک گہری سانس لی اور سلسلہ بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔ ''ہم ابھی یہی سوچ رہے تھے کہ اس معاملے کو کس طرح ہینڈل کریں کہ گزشتہ رات پولیس نے زاہدہ کو گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیا ہے۔''

''یہاں تک تو ٹھیک ہے۔'' میں نے پرویز کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''لیکن ابھی تک مجھے میرے سوال کا جواب نہیں ملا۔ پولیس نے زاہدہ کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''اس پر قتل کا الزام ہے۔'' پرویز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''زاہدہ نے کس کو قتل کیا ہے؟''

''اس نے کسی کو قتل نہیں کیا وکیل صاحب!'' پرویز قدرے احتجاجی انداز میں بولا۔ ''پولیس اس پر جھوٹا الزام لگا رہی ہے۔''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''الزام جھوٹا ہے یا واقعی زاہدہ نے کسی کو قتل کیا ہے، اس بات کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں، زاہدہ کو کس شخص کے قتل کے الزام میں پولیس نے گرفتار کیا ہے؟''

''لیاقت حسین کے قتل کے الزام میں۔'' پرویز نے بتایا۔

''کیا......؟'' میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ''تم زاہدہ کے سوتیلے باپ لیاقت حسین کی بات کر رہے ہو نا؟''

''جی ہاں......جی ہاں......'' وہ دونوں بیک وقت بول اٹھے۔

یہ ایک سنسنی خیز اور حیرت انگیز اطلاع تھی۔ میں اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ان دو افراد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیاقت حسین قتل ہو گیا۔ زاہدہ اپنے سوتیلے باپ کے قتل کے الزام میں حوالات میں بند ہے۔ آپ دونوں کا ان دونوں سے کوئی سنجیدہ رشتہ ناتا نہیں ہے۔ بتائیں، پھر اس سلسلے میں، میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

''آپ ہمارے لئے کچھ نہ کریں جناب!'' مرتضٰی نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ زاہدہ کا کیس لڑیں۔ وہ مظلوم اور بے گناہ ہے۔ آپ اسے باعزت بری کروا دیں گے تو یہ ایک بہت بڑی نیکی ہوگی۔''

پرویز نے کہا۔ ''مرتضٰی بھائی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت اونچے وکیل ہیں۔ اسی حساب سے آپ کی فیس بھی بہت ہائی ہے......لیکن آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی فیس اور دیگر عدالتی اخراجات میں برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ بس آپ یہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کی ہامی

بھرلیں۔"

میں نے انہیں کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا کرنے کی بجائے واضح اور دوٹوک الفاظ میں کہا۔ "میں کسی بھی شخص کا کیس لیتے ہوئے چند باتوں کی تسلی ضرور کرتا ہوں۔ جہاں تک فیس کی ادائیگی کا تعلق ہے تو وہ میرے حرکت میں آنے کا نقطہ آغاز ہے۔"

میری بات فوراً پرویز سینٹری اینڈ ہارڈویئر والے کی سمجھ میں جا بیٹھی۔ وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ "جناب! میں گھر سے خالی ہاتھ نہیں نکلا ہوں۔ آپ پہلے تو اپنی فیس وصول کریں، باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔" جملہ مکمل کرتے ہی اس نے اپنی جیب سے چرمی بٹوہ نکالا اور اسے کھولتے ہوئے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھ کر پوچھنے لگا۔ "بتائیں جناب! آپ کی فیس کتنی ہے؟"

میں نے اسے اپنی فیس کے بارے میں بتایا اور اس کے ساتھ ہی کہا۔ "فی الحال تم یہ بٹوہ اپنی جیب میں رکھ لو۔ میں چند باتیں تم پر واضح کردوں، پھر فیس بھی وصول کرلوں گا۔"

اس نے چرمی والٹ کو اپنی جیب میں منتقل کیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں اسے سمجھانے لگا۔ "اول تو میں پہلی فرصت میں ملزمہ زاہدہ سے ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہوں گا۔ تاکہ یہ اندازہ لگا سکوں کہ اس کیس کی نوعیت کیا ہے۔ دوم، میں اس وقت تک یہ کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتا جب تک ملزمہ کی ماں یا اور کوئی قریبی رشتے دار اس کیس کی پشت پناہی کے لئے موجود نہ ہو۔"

میں نے سانس لینے کے لئے تھوڑا توقف کیا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"اس لئے بہتر یہی ہوگا کہ آپ زاہدہ کی ماں خدیجہ کو لے کر میرے پاس آجائیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔ انشاء اللہ! اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔"

"ہم ابھی اسے لے کر آپ کے پاس آتے ہیں۔" انہوں نے بڑے عزم سے بیک زبان ہو کر کہا۔

میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا پھر کہا۔ "اتنی تیز رفتاری دکھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ تم لوگوں کے آنے جانے میں اچھا خاصا وقت لگے گا اور اس دوران میں اپنا دفتر بند کر کے گھر جا چکا ہوں گا۔ اور پھر یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ جاتے ہی خدیجہ تم لوگوں کو مل جائے......اور تمہارے ساتھ یہاں آنے کے لئے تیار بھی ہوجائے۔ اس لئے تم اس کام کو کل کے لئے بچا کر رکھو۔ ویسے بھی فوری طور پر کسی قانونی کارروائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

انہوں نے بیک وقت اثبات میں گردنیں ہلا کر اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ

وہ میری باتوں کے مقصد تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔

***

میں ''یک نہ شد، دو شد'' جیسی صورتِ حال سے دوچار تھا۔ غلام مرتضٰی ہی کچھ کم نہیں تھا کہ وہ اپنے ساتھ پرویز کو بھی نتھی کر لایا تھا۔ دونوں اپنے خیالات اور انداز میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ میں ابھی تک یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ آخر وہ خدیجہ کے گھر کے معاملات میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہے تھے۔

ان کے جانے کے بعد اور رات کو گھر آ کر بھی میں زیادہ تر انہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ غلام مرتضٰی کو جہاں تک میں سمجھ پایا تھا، وہ ایک دلبرداشتہ، مایوس اور ناکام شخص تھا اور اس کا سب سے بڑا سبب اس کی بے وقوفی اور احمقانہ طرزِ عمل تھا۔ اسے زندگی کو برتنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا اور اپنی تمام تر ناکامیوں کا ذمہ دار وہ قسمت اور مقدر کو ٹھہراتا تھا جو کہ کسی بھی طور درست نہیں تھا۔ ویسے غلام مرتضٰی میں، میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی اور وہ یہ کہ اس کے دل و دماغ میں انسانی ہمدردی البتہ ضرور موجود تھی۔ اس کے اسی وصف کی بناء پر میں نے اسے اپنے ساتھ نتھی کرنے کے بارے میں فیصلہ کیا تھا۔ چلو، وہ جیسا بھی لولا لنگڑا چلتا رہے گا، اپنے لئے روزی روٹی تو کما ہی لے گا۔ مگر پرویز کا معاملہ مجھے خاصا ٹیڑھا نظر آ رہا تھا۔

اُس کی انسانی ہمدردی کسی اور ہی سمت میں کئی ہاتھ آگے بڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ وہ ہارڈ ویئر اور سینیٹری کی دکان چلاتا تھا مگر خدیجہ وغیرہ سے اس کی کوئی رشتے داری نہیں تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ اپنی جیب سے زاہدہ کا کیس لڑنے کا عزم رکھتا تھا۔ میں نے ان دونوں سے یہ تو معلوم کر لیا تھا کہ وقوعہ والے گھر میں صرف تین افراد رہتے تھے۔

نمبر ایک، لیاقت حسین........ جسے قتل کر دیا گیا تھا۔ نمبر دو، زاہدہ........ جو لیاقت حسین کے قتل کے الزام میں اس وقت تھانے کی حوالات میں بند تھی۔ نمبر تین، خدیجہ........ جس پر اچانک ہی دوطرفہ اُفتاد آن پڑی تھی۔

اس واضح صورتِ حال میں اگر پرویز کی یہ خواہش تھی کہ میں زاہدہ کا کیس لڑ کر اسے بے گناہ ثابت کر کے باعزت بری کروا لوں تو اس کا مطلب تھا، اس کی تمام تر دلچسپی زاہدہ کی ذات سے جڑی ہوئی ہے۔ وگرنہ اگر صرف انسانی ہمدردی کی بات ہوتی تو وہ یہی کام خدیجہ کے توسط سے کرتا اور ایسا جذباتی بھی دکھائی نہ دیتا جیسا نظر آ رہا تھا۔ میرے دماغ کی سُوئی اسی مقام پر اٹک کر رہ گئی کہ پرویز کا زاہدہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سنجیدہ تعلق ضرور ہے۔ تبھی وہ

اسے بے گناہ سمجھتے ہوئے اس کی آزادی کا خواہاں ہے۔ اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے اس کی بے قراری ساتویں آسمان کو چھو رہی ہے۔

میں نے اپنے طور پر جو بھی نتیجہ اخذ کیا تھا، اس کی بنیاد حقیقت پسندی اور منطق تھی۔ میرا دماغ مجھے کسی اور زاویے میں سوچنے کی اجازت ہی نہیں دے رہا تھا۔ بہر حال، اگر وہ اگلے روز خدیجہ کو اپنے ساتھ میرے دفتر تک لانے میں کامیاب ہو جاتا تو اس معاملے میں مزید روشنی پڑ سکتی تھی۔ خدیجہ کے انٹرویو سے یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی کہ پرویز اور اس کی ہمدردی کی حقیقت کیا تھی۔ میں اپنے خیال میں یہی توقع کر رہا تھا کہ خدیجہ ان دونوں کے ساتھ میرے پاس نہیں آئے گی۔ لیکن اگلے روز جب وہ تینوں سہ پہر کے بعد میرے چیمبر میں داخل ہوئے تو مجھے حیران ضرور ہونا پڑا۔ اس حیرانی میں خدیجہ کی آمد سے زیادہ اُس کے حلیے کا ہاتھ تھا۔ اُس کی نک سک کو دیکھ کر کوئی بھی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اُسے بیوہ ہوئے ابھی صرف دو ہی دن ہوئے ہیں۔

وہ پوری تیاری کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی جیسے کسی ڈاکٹر کے کلینک میں یا پھر شاپنگ کے لئے گھر سے نکلی ہو۔ اُس کے اس غیر معمولی رویے نے مجھے بڑی شدت سے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ان تینوں کے سلام کا مشترکہ جواب دیا۔ پھر جب انہوں نے نشستیں سنبھال لیں تو میں بہ غور خدیجہ کا جائزہ لینے لگا۔

اس کے بارے میں میرے اکثر اندازے غلط ثابت ہوئے۔ میں نے اس کی عمر کے بارے میں یہ اندازہ لگایا تھا کہ وہ اُنتیس تیس سے زیادہ کی نہیں ہو گی اور اس بات پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ دونوں ہمدردوں کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا، زاہدہ کی عمر اٹھارہ اُنیس سال کے قریب ہے۔ اس حساب سے زاہدہ کی ماں کی عمر اٹھائیس اُنتیس سال کسی بھی صورت نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جب ازاں بعد مجھے پتہ چلا کہ خدیجہ اپنی زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی ہے تو میری حیرت لمحے بھر میں زائل ہو گئی تھی۔ وہ ایک ایسی عورت تھی جسے دیکھ کر اس کی عمر کا صحیح اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی اصل عمر سے کم از کم دس سال چھوٹی نظر آتی تھی۔

ازیں علاوہ اس کی صحت بھی ایسی تھی کہ ڈھلتی ہوئی عمر کو چھپانے میں بڑی معاون ثابت ہو رہی تھی۔ پھر اس پر قدرت کی مہربانی سے حُسن اور جوانی نے بھی کسی کنجوسی اور بخل سے کام نہیں لیا تھا۔ پھر اس کی تیاری کے انداز نے اس کیفیاتی تاثر کو فائنل ٹچ لگا کر اسے ایک یادگار شخصیت بنا دیا تھا۔

یہ ساری خوبیاں اور کمال تو رہے ایک طرف، مجھے جس بات سے حیرت کا جھٹکا لگا تھا وہ

یہ تھی کہ اس موقع پر تو اسے ''خیال'' رکھنا چاہئے تھا جو اس نے ''بالکل'' نہیں رکھا تھا۔ اُس کا یہ طرزِ عمل غیر فطری اور ناشائستہ تھا جو موقع محل اور حالات کی سنگینی سے میل نہیں کھاتا تھا۔

خدیجہ کے بارے میں تفصیل سے بتانے کا مقصد صرف اتنا سا ہے کہ آپ اس کی شخصیت سے بڑے بھرپور انداز میں متعارف ہو جائیں تا کہ بعد میں کسی خلافِ معمول بات پر آپ کا ذہن کسی اُلجھن کا شکار نہ ہو۔

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا تو خدیجہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! ان دونوں نے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔ میں تو اپنی بچی کے لئے ایک وکیل سے بات کر آئی تھی لیکن پرویز اور مرتضٰی کی باتوں نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ آپ سے ملنے چلی آئی ہوں۔''

پھر وہ ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے رسمی سے لہجے میں بولی۔ ''آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ!''

الفاظ کے اعتبار سے اس نے پرویز اور مرتضٰی کا شکریہ ادا کیا تھا لیکن انداز ایسا تھا جیسے وہ ان سے کہہ رہی ہو، میں اپنی منزل پر پہنچ گئی ہوں۔ آپ چاہیں تو مجھے یہاں چھوڑ کر واپس اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔ ازاں بعد یہ بات سولہ آنے درست ثابت ہوئی۔

میں پوری طرح خدیجہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! کیا یہ ممکن ہے کہ میں تنہائی میں آپ سے بات کر سکوں؟''

جملہ مکمل کرنے کے بعد اس نے یکے بعد دیگرے غلام مرتضٰی اور پرویز کی طرف دیکھا اور سوالیہ انداز میں مجھے تکنے لگی۔ میں فوراً سے پیشتر اس کی بات کی تہہ میں اتر گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ نہ لگا کہ وہ ان دونوں کی غیر موجودگی میں مجھ سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ یہ بات تو میں نے اس کے رویے ہی سے جھلکتی محسوس کر لی تھی۔ بہرحال، اس نے اتمامِ حجت میں بھی کسی تامل یا تاخیر سے کام نہیں لیا تھا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''کیوں نہیں...... یہ تو آپ کا حق ہے خدیجہ بیگم!''

پھر میں نے پرویز اور مرتضٰی کی جانب دیکھتے ہوئے قدرے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''آپ دونوں باہر جا کر انتظار گاہ میں بیٹھیں۔ کسی مرحلے پر آپ کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں آپ کو بلوا لوں گا۔''

انہوں نے ایک لمحے کے لئے حیرت اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات سے ایک دوسرے

کو دیکھا۔ پھر وہ کرسیوں سے اٹھے اور زبان سے ایک لفظ ادا کئے بغیر میرے چیمبر سے نکل گئے۔ ان کے رخصت ہوتے ہی خدیجہ بیگم نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

''وکیل صاحب! بڑی مہربانی.......آپ نے میری ایک پریشانی کو تو ٹالا۔''

اس کا واضح اشارہ پرویز اور مرتضیٰ کی سمت تھا اور لہجے سے بے حد بیزاری بھی ٹپکتی تھی۔ تاہم میں نے احتیاطاً تصدیقی انداز میں پوچھ لیا۔

''آپ نے ان دونوں کو پریشانی کہا ہے نا؟''

''یہ دونوں کسی مصیبت سے کم نہیں ہیں۔'' وہ اُکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں نے تو صرف پریشانی کہہ کر گزارہ چلا لیا ہے۔''

خدیجہ کے رویے نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''میں نے ان دونوں کو آپ کے معاملات میں خاصا سنجیدہ اور پُرخلوص پایا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے آپ شکریہ ادا کرنے والے انداز میں ان کی تعریف بھی کر چکی ہیں۔ پھر.......؟''

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جھٹ سے بولی۔ ''ان کے خلوص، ہمدردی اور سنجیدگی کا سبب کچھ اور ہے۔''

''ہاں، ہاں.......بتائیں، کیا سبب ہے؟'' میں نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے، اس موضوع پر ہم بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔ زاہدہ کا معاملہ فی الحال زیادہ اہم ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے ہاں میں ہاں ملانے پر اکتفا کیا۔

وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''وکیل صاحب! لیاقت جیسا تیسا بھی تھا، بہرحال وہ میرا شوہر تھا۔ اس کی موت کا مجھے افسوس ہے لیکن میں یہ بھی جانتی ہوں، زاہدہ اتنا بڑا قدم نہیں اُٹھا سکتی۔ آپ کسی بھی طرح میری بچی کو بچا لیں۔''

''آپ نے جب شروع میں یہ کہا تھا کہ.......میں تو اپنی بچی کے لئے ایک وکیل سے بات کر آئی تھی.......تو میں نے اسی وقت یہ اندازہ کر لیا تھا کہ آپ اپنی بیٹی زاہدہ کو بے گناہ سمجھتی ہیں۔ آپ کے خیال میں زاہدہ نے لیاقت کو قتل نہیں کیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لیاقت کا قتل ہوا ہے۔''

میں سانس لینے کے لئے لمحے بھر کو رُکا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''لیاقت آپ کا شوہر تھا۔ آپ نے اس کے لئے ''جیسا تیسا'' جیسے الفاظ استعمال کر کے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ آپ کی اس کے ساتھ زندگی اچھی نہیں گزر رہی تھی۔ پرویز اور مرتضیٰ کی

زبانی مجھ تک جو خبریں پہنچی ہیں ان کی روشنی میں مقتول بہت ظالم اور سفاک شخص تھا۔ وہ آپ کو زدوکوب کرتا تھا اور زاہدہ کے ساتھ بھی اس کا رویہ مناسب نہیں تھا۔ اسی بناء پر زاہدہ مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

جواب دینے سے پہلے اس نے متذبذب نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''آپ غلط نہیں کہہ رہے وکیل صاحب!''

''ان حالات کے دوران لیاقت کا قتل ہو جاتا ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور پولیس زاہدہ کو اپنے سوتیلے باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے تھانے میں بند کر دیتی ہے۔ آپ کی نظر میں زاہدہ اس معاملے میں بے قصور ہے۔ پھر پولیس نے کس بنیاد پر اسے ایک قاتل کی حیثیت سے گرفتار کیا ہے؟ یہ سارا معاملہ اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ کوئی بھی شے اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی دکھائی نہیں دیتی....... خاص طور پر پرویز اور مرتضٰی کے کردار عجیب سا تاثر پیش کرتے ہیں۔ جب تک آپ مجھے اس کیس کے پس منظر سے آگاہ نہیں کریں گی اور میں حالات کو سمجھ نہیں پاؤں گا، اس وقت تک میں آپ کی بھرپور مدد نہیں کر سکوں گا۔''

وہ چند لحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں قابلِ بھروسہ وکیل ہوں یا نہیں۔ پھر کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور تھکے ہوئے انداز میں بولی۔

''اس کا مطلب ہے، یہ کہانی مجھے شروع سے سنانا ہوگی۔''

''بالکل....... تب ہی صورتِ حال واضح ہو سکے گی۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اور اس کہانی میں پرویز اور مرتضٰی کے کرداروں کا بھی ذکر ہونا ضروری ہے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی، چند لمحے خاموش رہ کر بکھرے ہوئے خیالات کو مجتمع کیا اور ٹھہرے ہوئے انداز میں اپنی زندگی کی کہانی سنانے لگی۔

آگے بڑھنے سے قبل میں ان حالات و واقعات کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آپ عدالتی کارروائی کے دوران کسی ذہنی اُلجھن کا شکار نہ ہوں۔ ان میں بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں مگر ربط و ضبط کے تقاضے نبھاتے ہوئے میں انہیں ایک ترتیب سے پیش کر رہا ہوں۔ اسی طرح خدیجہ کے بیان کی بہت سی غیر ضروری باتوں کو میں نے حذف کر دیا ہے۔

***

ملزمہ زاہدہ کا باپ ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا تھا۔ مذکورہ ٹیکسٹائل مل کا نام ظاہر کرنا

مناسب نہیں ہوگا کیونکہ اس مل کے ساتھ ایک انتہائی افسوس ناک واقعہ بھی نتھی ہے۔ اگر نام لے کر اس مل کا ذکر ہوگا تو پھر اس واقعے کو زیر بحث لانا ضروری ہو جائے گا اور موجودہ کیس سے اس کا کوئی تعلق نہیں نکلتا لہٰذا ہم یہیں تک رہتے ہیں کہ......زاہدہ کا باپ مظفر علی ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کرتا تھا۔

مظفر اور خدیجہ میں کبھی بنی نہیں تھی۔ صبح و شام چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان لڑائی جھگڑا ہوتا رہتا۔ زاہدہ اُن کی اکلوتی اولاد تھی اور والدین کے تنازع سے اسے بے حد ذہنی کوفت ہوتی تھی۔ وہ جب تنہائی میں بیٹھ کر اُن کے رویوں پر غور کرتی تو کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پاتی تھی۔ کبھی تو وہ دونوں ہی اسے غلط نظر آتے اور کبھی دونوں درست دکھائی دیتے۔ جن معمولی باتوں پر خدیجہ اور مظفر کے درمیان ''جنگ'' کا آغاز ہوتا ان میں سرِ فہرست ''کم آمدنی اور زیادہ خرچ'' تھا۔ ہمارے ملک کے نوے فیصد گھروں کا یہ مشترکہ مسئلہ ہے۔ صرف دس فیصد گھر ایسے ہوں گے جہاں آمدنی خرچے کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتی ہو۔

مظفر علی مذکورہ ٹیکسٹائل مل میں ایک مشین آپریٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا لہٰذا اس کی آمدنی بھی محدود تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی آمدنی میں اس تناسب سے اضافہ نہ ہو سکا جس تناسب سے مہنگائی بڑھی تھی اسی لئے مشکلات پیش آ رہی تھیں۔ خدیجہ کا رونا اپنی جگہ درست تھا لیکن مظفر بھی اس معاملے میں بے قصور نظر آتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، وہ معاشی عفریت کو پچھاڑنے کے لئے کون سا داؤ آزمائے۔ ایک روز یہی سوال اس نے خدیجہ سے بھی کیا۔

وہ آدھے گھنٹے سے اسی مسئلے پر چونچیں لڑا رہے تھے کہ مظفر نے جھلا کر اس سے پوچھ لیا۔ ''تم ہی بتاؤ......میں کیا کروں؟''

''میں کیا بتاؤں؟'' وہ بے نیازی سے بولی۔ ''کرنا تمہیں ہے اس لئے سوچنا بھی تمہی کو چاہئے۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ گھر میں خوش حالی آنی چاہئے۔ میں روز روز کے ان مسائل سے تنگ آ گئی ہوں۔''

''مجھ سے جو ہو سکتا ہے وہ تو کر رہا ہوں۔'' وہ برہمی سے بولا۔ ''تم جیسی ناشکری عورت میں نے کوئی اور نہیں دیکھی۔''

''میں نے کیا ناشکرا پن کیا ہے؟'' خدیجہ نے حیرت بھری نظر سے اسے دیکھا۔

مظفر نے کہا۔ ''میری حیثیت کے اور کتنے لوگ ہیں جن کے پاس اپنے ذاتی گھر ہوں؟''

مظفر نے اسی ٹیکسٹائل مل کی آمدنی میں سے جیسے تیسے بچت کر کے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ اس

کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اور اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش بھی نہیں نظر آتی تھی۔ اپنا ذاتی گھر چاہے ایک چھوٹی سی کٹیا ہی کیوں نہ ہو، اس کی اہمیت، افادیت اور سکون و راحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس بات کا احساس صرف انہی لوگوں کو ہے جو اپنے گھر سے محروم کرائے کے گھروں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

خدیجہ، مظفر کی بات کی تہہ میں اُتر گئی۔ طنز بھری نظر سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟.... کیا یہی کہ جن کے پاس اپنا گھر ہو، پھر ان کی اور کوئی ضرورت نہیں رہتی؟ بس وہ دن رات بیٹھے اس گھر کی دیواروں اور کھڑکیوں، دروازوں کو چاٹتے رہتے ہیں۔ انہیں بھوک لگتی ہے نہ پیاس اور نہ ہی ان کی اور کوئی ضرورت باقی رہتی ہے؟''

خدیجہ کے زہر میں بجھے ہوئے ان الفاظ نے مظفر کے جگر کو چھید ڈالا۔ وہ خدیجہ کے چھوٹے موٹے تلخ و ترش رویوں کو سہنے کا عادی تھا لیکن ایسا دل پاش انداز اس نے پہلے کبھی اختیار نہیں کیا تھا۔ اس نے جھگڑے کو ہوا دینے کی بجائے صرف اتنا کہا۔

''میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔''

''پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟'' خدیجہ نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

وہ متحمل لہجے میں بولا۔ ''میں جو کہنا چاہ رہا ہوں، تم بہ خوبی سمجھتی ہو۔ میں اس وقت بھی اپنی ہمت سے زیادہ محنت کر رہا ہوں۔''

''تمہاری ہمت اور محنت پر مجھے کوئی شک نہیں ہے۔'' خدیجہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہاری سمت درست نہیں اسی لئے ساری مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔''

''ساری زندگی جس سمت میں کام کیا ہے، تمہاری نظر میں وہ درست نہیں؟'' مظفر نے افسوس ناک انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں لگی بندھی مل کی نوکری چھوڑ کر تمہاری خوشی کی خاطر کسی بینک میں ڈاکہ ڈال بیٹھوں۔''

''اب تم اتنے بھی ہمت والے نہیں ہو۔'' وہ اُکسانے والے انداز میں بولی۔ ''ایسے کاموں کے لئے شیر کا دل گردہ درکار ہوتا ہے۔''

''تو ٹھیک ہے........'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں ایسا کرتا ہوں کہ ٹیکسٹائل مل کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر جنگل کی طرف نکل جاتا ہوں۔''

''جنگل کی طرف؟'' خدیجہ نے منہ ٹیڑھا کر کے عجیب سے انداز میں دوہرایا۔ ''کراچی جیسے بھرے پرے شہر میں تمہیں جنگل کہاں سے ملے گا؟'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوئی پھر چونکنے والے انداز میں بولی۔ ''کہیں تم انسانوں کے جنگل کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''انسانوں کے جنگل میں تو ہم اس وقت رہ رہے ہیں۔'' مظفر نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں انسانوں کے نہیں، جانوروں کے جنگل کی بات کر رہا ہوں۔''

''اوہ......تم اس جنگل کی طرف کیوں جانا چاہتے ہو؟'' خدیجہ نے پوچھا۔

''شیر کے شکار کے لئے۔'' مظفر بدستور سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''شیر کا شکار!'' خدیجہ لڑائی جھگڑے کو بھول کر شوہر کی باتوں میں اُلجھ گئی۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا؟''

وہ اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ابھی تک تو دماغ اپنے ٹھکانے پر ہے۔ لیکن بعد کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''پتہ نہیں، تم کس قسم کی فضول باتیں کر رہے ہو۔''

''میں تو تمہاری خواہش پوری کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

خدیجہ اُلجھن بھری نظر سے اسے تکنے لگی۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو اللہ کی بندی! تمہیں بہت ساری دولت چاہئے نا۔ ایک ساتھ اتنی زیادہ دولت بینک ڈکیتی ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن تم نے شرط لگا دی ہے کہ ایسے کاموں کے لئے شیر کا دل گردہ درکار ہوتا ہے۔ تو میں نے سوچا......''

وہ بڑے معنی خیز انداز میں لمحے بھر کو متوقف ہوا تو خدیجہ تنبیہی نظر سے اسے گھورنے لگی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مظفر اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ قبل اس کے کہ وہ جواب میں کوئی سخت جملہ کہتی، مظفر نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے سوچا سیدھا جنگل جاتا ہوں۔ شیر کا شکار کرتا ہوں۔ اسے مار گرانے کے بعد اس کا دل گردہ نکالتا ہوں اور ڈکیتی کی نیت سے کسی بھی بینک میں گھس جاتا ہوں۔ ایسے کاموں کے لئے چونکہ شیر کے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا وہ لوگ شیر کا دل گردہ دیکھتے ہی وہاں موجود ساری رقم ایک تھیلے میں ڈال کر میرے حوالے کر دیں گے۔ اللہ اللہ، خیر سلا!''

اس خوب صورت اور شائستہ مذاق پر خدیجہ بے اختیار ہنسنے لگی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''مظفر! ایسے پُرمزاح لطیفوں سے ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ کچھ سوچو...... کچھ کرو......''

''خدیجہ!'' وہ خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ ''مجھے تنگ نہ کیا کرو۔ ہم اس وقت بھی ہزاروں سے اچھے ہیں۔ انسان کو ہمیشہ اپنے نیچے دیکھنا چاہئے۔ ہم کسی رات بھوکے نہیں سوئے۔ معقول اور مناسب لباس بھی پہنتے ہیں۔ رہنے کے لئے اللہ نے اپنی زمین اور چھت دے رکھی

ہے۔ہم اُس ذات کا جتنا بھی شکر ادا کریں، کم ہے........'' بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔

''تم مجھ سے جھگڑا کرتی ہو نا........لیکن دیکھ لینا........ جب میں نہیں ہوں گا تو تم دھاڑیں مار مار کر مجھے یاد کرو گی........میں بہت یاد آؤ ں گا۔''

''میں اپنے لئے کچھ تھوڑی چاہتی ہوں؟'' خدیجہ نے اُس کی ذہنی کیفیت کے پیشِ نظر جلدی سے کہا۔ ''میں تو روکھی سوکھی کھا کر بھی گزارہ کر سکتی ہوں لیکن زاہدہ........؟''

خدیجہ نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو مظفر تڑپ کر بولا۔ ''کک........کیا ہوا ہے میری زاہدہ کو؟''

مظفر کو اپنی اکلوتی اولاد زاہدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ ہر والدین اپنی اولاد سے محبت کرتے ہیں اور بیٹی کا معاملہ تو اور بھی حساس اور نازک ہوتا ہے........اور بیٹی بھی اکلوتی ہو تو محبت کی شدت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ دنیا میں کوئی باپ ایسا نہ ہو گا جسے اپنی بیٹی سے محبت نہ ہو۔ اور اگر ہو گا تو پھر وہ انسان نہیں ہو گا۔ ایسے شخص کو گوشت پوست کی متحرک مشین کہا جا سکتا ہے جس کے سینے میں دھڑکتے ہوئے کسی لوتھڑے کی بجائے ایک ڈیجیٹل آلہ رکھا ہو، جس میں احساسات اور جذبات پیدا نہ ہوتے ہوں بلکہ بڑی سرعت سے ہندسوں کی جمع تفریق کا عمل جاری رہتا ہو۔

خدیجہ نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''زاہدہ کو ابھی تو کچھ نہیں ہوا لیکن اگر تم یونہی آنکھیں بند کئے بیٹھے رہے تو بہت کچھ ہو جائے گا۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ ''صاف صاف بات کیوں نہیں کرتی ہو؟''

خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''زاہدہ نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا ہے۔ وہ جوان ہو گئی ہے تو اس کا مطلب ہے ہمیں اس کی شادی بھی کرنا چاہئے۔ اور تم جانتے ہو یوں خالی پیلی شادی نہیں ہو جاتی۔ لڑکے والے لڑکی کو بعد میں اور اس کے گھر کو پہلے دیکھتے ہیں۔ اس کے گھر کے مالی وسائل کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہاں سے کیا کچھ ملنے کی توقع باندھی جائے۔ اور یہاں........ہمارے گھر میں........''

خدیجہ نے ایک مرتبہ پھر معنی خیز، سوالیہ انداز میں جملہ نامکمل چھوڑ دیا اور اپنے شوہر کو تکنے لگی۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں مانتا ہوں تم نے جو حالات بیان کئے، ہمارے معاشرے کا ایسا ہی چلن ہو گیا ہے۔ لیکن میں نصیب پر یقین رکھتا ہوں اور مجھے قوی اُمید ہے........بنانے والے نے میری زاہدہ کا نصیب بہت ہی اچھا بنایا ہے۔''

''نصیب.......اونہہ!'' خدیجہ نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

ان کے درمیان جب بھی بحث یا تلخ کلامی ہوتی، ''نصیب'' پر آ کر موقوف ہو جاتی۔ اس کے بعد کہنے اور سننے کے لئے کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ نصیب کے معاملے میں دونوں کی سوچ اور زاویہ نظر الگ الگ تھا۔ اختلافِ رائے پر عموماً جھگڑا شروع ہوتا تھا لیکن اس کے بالعکس وہ دونوں اس نقطے پر پہنچ کر شانت ہو جاتے تھے۔ شاید وہ منزل پر کھڑے ہو کر تلاشِ منزل کے لئے نکلتے تھے۔ لہٰذا اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔

حالات اسی انداز اور رفتار سے ایک لگی بندھی ڈگر پر آگے بڑھ رہے تھے کہ مظفر کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا.......حادثہ ٹیکسٹائل مل کے اندر ہی پیش آیا تھا۔ غلطی مظفر کی تھی لہٰذا زیادہ ہنگامہ نہیں پھوٹ پایا۔ ورنہ مل والوں کو لینے کے دینے پڑ جاتے.......انسانی ہمدردی اور متوفی کی فیملی کی مالی امداد کے طور پر مل والوں نے مبلغ پچیس ہزار روپے خدیجہ کو دیئے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

مظفر نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ جب وہ زندہ نہیں رہے گا تو بہت یاد آئے گا۔ خدیجہ نے اس کی کمی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ زاہدہ ماں کی بہ نسبت باپ کے زیادہ نزدیک تھی لہٰذا مظفر کی ابدی جدائی نے اسے ذہنی اور جذباتی طور پر توڑ کر رکھ دیا۔ وہ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔ اپنے آپ میں گم ہو کر رہ گئی۔

خدیجہ کے سامنے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اب اس گھر کی معاشی گاڑی کیسے چلے گی۔ مظفر کم زیادہ جتنا بھی کما کر لا رہا تھا اس سے گزر بسر تو ہو رہی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد آمدنی کا مستقل ذریعہ تو بند ہو گیا تھا۔ مل والوں نے جو پچیس ہزار روپے دیئے تھے وہ کتنے دن چلتے۔ ان میں سے چار پانچ ہزار تو مظفر کی تجہیز و تکفین پر خرچ ہو گئے تھے۔ اگر وہ ہاتھ روک کر بھی خرچ کرتی تو پانچ چھ ماہ چل جاتے۔ اس کے بعد کیا ہوتا؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے ان ماں بیٹی کو بے حد پریشان کر دیا تھا۔ زاہدہ نے فیصلہ کن انداز میں اپنی ماں سے کہہ دیا۔

''امی! میں آپ کی عدت پوری ہونے تک گھر میں بیٹھوں گی۔ اس کے بعد ملازمت کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑی ہوں گی.......اور سن لیں، آپ میری ملازمت کی مخالفت نہیں کریں گی۔''

زاہدہ کا انداز دوٹوک اور جارحانہ تھا۔ خدیجہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی، پھر پوچھا۔ ''نادان! تم کون سی ملازمت کرو گی؟ تمہیں تو کچھ آتا جاتا بھی نہیں۔''

''میرے پاس ہنر نہ سہی، مگر تعلیم ہے۔'' زاہدہ نے پُر اعتماد انداز میں کہا۔ ''کوئی چھوٹی موٹی نوکری تو مل ہی جائے گی۔''

زاہدہ نے میٹرک تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی۔ اگرچہ یہ کوئی بہت زیادتعلیم نہیں تھی لیکن اُس زمانے میں آج کل کی طرح تعلیم اتنی بے وقعت نہیں ہوئی تھی۔ پھر مسابقت کا وہ عالم نہیں تھا جو آج کل دکھائی دیتا ہے۔ ایک میٹرک پاس لڑکے یا لڑکی کو باآسانی کہیں بھی نوکری مل جاتی تھی۔ زاہدہ بڑی ہونہار اسٹوڈنٹ رہی تھی۔ اس نے میٹرک میں اے گریڈ حاصل کیا تھا اور آگے بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھنا چاہتی تھی لیکن گھریلو حالات اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔ پچھلے دو تین سال سے وہ گھر میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔

خدیجہ کی عدت کی مدت ختم ہوئی ہی تھی کہ ان ماں بیٹی کی دنیا میں ایک نیا کردار داخل ہوا۔ اس کردار کا نام تھا......لیاقت حسین!

خدیجہ اور زاہدہ، لیاقت حسین کو نہیں جانتی تھیں۔ وہ اس سے زندگی میں پہلی مرتبہ مل رہی تھیں۔ لیکن اُس چرب زبان شخص نے کچھ ایسے گھماؤ پھراؤ سے اپنا تعارف کروایا کہ وہ اس کے چکر میں آ گئیں۔ خدیجہ کے اپنے قریبی رشتے دار یا تو زیادہ تر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے یا پھر ان میں سے کوئی باقی بھی تھا تو اس سے میل ملاقات نہیں تھی۔ لیاقت نے رشتے داروں کا ایسا اُلجھا ہوا منظر کھینچا کہ وہ کئی قسم کی جمع تفریق اور ضرب تقسیم کے بعد خود کو خدیجہ کا کزن ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ بھی ان دُکھ اور پریشانی کے لمحات میں اس پُرخلوص، ہمدرد اور نیک سیرت ماموں زاد لیاقت حسین سے مل کر بہت خوش ہوئی۔ اس ملاقات کے اختتام پر لیاقت حسین نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدیجہ! میں تمہارے گھریلو حالات سے پوری طرح آگاہ ہو چکا ہوں اس لئے مجھے کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں زاہدہ نوکری وغیرہ کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کا جذبہ اپنی جگہ قابلِ قدر ہے لیکن میں اِس بچی کو کمانے کی غرض سے گھر سے نہیں نکلنے دوں گا۔ آج کے بعد اس گھر کی کفالت کا میں ذمہ لیتا ہوں۔''

''لیکن......'' خدیجہ نے اُلجھن بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم اتنی بڑی ذمہ داری......میرا مطلب ہے، تمہارا اپنا بھی گھر ہوگا، سو مسئلے مسائل ہوں گے۔ پھر تم......''

''بس خدیجہ!'' وہ بڑے حتمی انداز میں قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''گھر یاد دلا کر میرے زخم ہرے نہ کرو۔ کبھی میں بھی گھر اور بیوی والا ہوتا تھا۔ لیکن اب کچھ بھی باقی نہیں ہے۔'' وہ بڑے گمبھیر انداز میں یکدم خاموش ہو گیا۔

خدیجہ کو کرید ہوئی کہ اس کی کہانی سے آگاہی حاصل کرے۔ تھوڑی سی ٹٹول کے بعد لیاقت نے اپنی پلاننگ کے مطابق خدیجہ کو ایک پُر اثر اور جذباتی کہانی سنا دی۔ اس کہانی کی رو سے کچھ عرصہ پہلے لیاقت حسین نے ایک خوب صورت عورت سے شادی کی تھی۔ وہ اس کی خوب صورتی اور دلکشی پر اس قدر مر مٹا کہ اس نے اپنا سب کچھ اسی کے نام کر دیا۔ گھر، کاروبار اور دیگر سب کچھ اسی عورت کا ہو گیا۔ وہ کہنے کو اس عورت کا شوہر اور ہر شے کا مالک تھا لیکن قانونی اعتبار سے صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ لیاقت کی حیثیت ایک ملازم جیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور پھر اس حسین عورت نے وہ چال چلی جس کی خاطر اس نے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا تھا۔ اس نے باقاعدہ عدالت سے رجوع کیا اور لیاقت سے الگ ہو گئی۔

وہ الگ ہوئی تو قانونی طور پر لیاقت حسین کو گھر اور چلتے ہوئے کاروبار سے بے دخل ہونا پڑا۔ وہ کچھ عرصہ تک اس ٹریجڈی پر پاگلوں کی طرح دیوانہ وار اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اُس کی پوزیشن ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی سابق بیوی کے خلاف کچھ کر سکتا۔ اُس کے ساتھ حالات نے جو بھی کھیل کھیلا تھا، اس میں غالب ہاتھ خود اس کی اپنی حماقتوں کا تھا۔ لیکن وہ اپنا سر پیٹنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس نے بہت جلدی خود کو سنبھال لیا۔ پہلے وہ اپنا بزنس کرتا تھا، اب وہ سائٹ کی ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور اس کی رہائش کرائے کے ایک کوارٹر میں تھی۔ اپنی اس افسوس ناک کہانی کے اختتام پر اس نے جذبات انگیز لہجے میں کہا۔

''خدیجہ! میرا اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔ جب سے مجھے تمہارے حالات کا پتہ چلا ہے، میں بہت بے چین ہوں۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈتے ڈھانڈتے یہاں تک پہنچا ہوں۔ میرے قریبی رشتے داروں میں ایک تم ہی باقی بچی ہو۔ اگر میں تمہارے کسی کام آ سکوں تو مجھے بے حد خوشی ہو گی۔ مجھے اُمید ہے تم میری اس نیکی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کرو گی۔''

اس چالباز نے خدیجہ کو ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے پاس انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی لیاقت نے روزانہ رات کو ان کے گھر کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ وہ کچھ ایسی ہمدردی اور محبت سے پیش آیا تو خدیجہ اپنے دل اور گھر میں اس کے لئے اچھی خاصی گنجائش نکالنے پر مجبور ہو گئی۔ اگرچہ زاہدہ کو ماں کا یہ فیصلہ زیادہ پسند نہیں آیا تھا لیکن کوئی اختلاف یا احتجاج کرنے کی بجائے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ ایک رات خدیجہ نے لیاقت حسین سے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔

''تم خوامخواہ کوارٹر کا کرایہ کیوں بھرتے ہو؟ یہ گھر بھی تمہارا اپنا ہی ہے۔ تم اپنا سامان

اٹھاؤ اور یہاں آ جاؤ۔"

خدیجہ کے منہ سے یہی الفاظ سننے کے لئے تو لیاقت نے اتنے دن تک "محنت" کی تھی۔ گویا اس رات اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اس نے خدیجہ کی پیشکش کے سامنے کمزور سی مزاحمت کی پھر بڑے رضا کارانہ طور پر ہتھیار پھینک دیئے اور آئندہ روز وہ کرائے کے کوارٹر کو چھوڑ کر خدیجہ کے گھر میں مقیم ہو گیا۔

لیاقت گزشتہ چند روز سے ان ماں بیٹی کے ساتھ جس حُسنِ سلوک کا مظاہرہ کر رہا تھا اس کے اثرات تو اپنی جگہ تھے ہی، اس کے علاوہ بھی نگاہوں ہی نگاہوں میں اس نے خدیجہ پر بھی ایک خاص "کام" کیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ اس کے دل میں ایک خاص "جگہ" پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زاہدہ نے لیاقت کا اپنے گھر میں آ کر رہنا تو کسی حد تک گوارا کر لیا تھا لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد جب ماں نے اسے اپنے "فیصلے" سے آگاہ کیا تو وہ بھڑک اُٹھی۔ وہ کسی بھی شخص کو اپنے باپ کے مقام پر "فائز" دیکھنے کی روادار نہیں تھی چاہے وہ شخص کتنا بھی مہربان اور ہمدرد انسان کیوں نہ ہو۔

ماں نے اسے زمانے کی اُونچ نیچ سے روشناس کرایا۔ حالات کے تقاضوں سے آگاہ کیا اور سمجھانے بجھانے کے اختتام پر کہا۔ "مجھ سے شروع میں بھول ہو گئی کہ میں نے لیاقت کو اپنے گھر میں رہنے کی پیشکش کر دی۔ ٹھیک ہے، وہ ہمارا اپنا ہے لیکن لوگ تو یہ بات نہیں سمجھتے نا۔ تمہیں کیا معلوم میں لوگوں کی کیسی کیسی معنی خیز نظروں کا سامنا کرتی ہوں۔"

"تو مت سامنا کریں۔" زاہدہ نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا۔ "کسی اچھے انداز میں اُس سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی رہائش کا الگ کہیں بندوبست کر لے۔"

"یہ بات لیاقت کو بری بھی لگ سکتی ہے۔" خدیجہ نے کہا۔ "اور پھر یہ بھی دیکھو، وہ کتنی ہمدردی اور اپنائیت سے ہماری مالی مدد بھی تو کر رہا ہے۔"

زاہدہ پتہ نہیں اُس روز کس موڈ میں تھی، اُکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں نے تو ابو کے انتقال کے وقت ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ روزی اور ملازمت کی تلاش میں گھر سے نکلوں گی۔ لیکن آپ نے اور آپ کے اس کزن نے میرا راستہ روک لیا۔ مجھے یقین ہے اگر میں نے کوئی جاب کر لی ہوتی تو ہمیں کسی کی مالی مدد کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔ میں اب بھی یہ کر سکتی ہوں۔ اس گھر کی معاشی ذمہ داریاں اُٹھانے کا حوصلہ ہے مجھ میں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تمہاری بات سے اتفاق کرتی ہوں۔" خدیجہ نے نرم لہجے میں

کہا۔ ''تم جو کہہ رہی ہو، وہ کر کے بھی دکھا سکتی ہو۔ لیکن اس کے علاوہ بھی کوئی فیصلہ کرتے وقت بہت سی باتوں کو دیکھنا پڑتا ہے۔ تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

زاہدہ نے شاکی نظر سے خدیجہ کی طرف دیکھا اور زخمی لہجے میں بولی۔

''میں آپ کی بات بڑی اچھی طرح سمجھ گئی ہوں امی!.......آپ نے ایک فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس کے لئے جواز تلاشنے اور تراشنے کی کوشش نہ کریں لیکن........''

وہ لمحہ بھر کو رُکی، پھر چٹانی الفاظ میں بولی۔ ''لیکن امی! مجھ سے کبھی یہ توقع نہ رکھنا کہ میں اس شخص کو اپنے ابو کا درجہ دے سکوں گی۔ کوئی بھی شخص وہ مقام حاصل کر ہی نہیں سکتا جو میرے دل میں میرے ابو کے لئے ہے۔''

ماں اور بیٹی میں دوبارہ اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد نہایت ہی سادگی کے ساتھ خدیجہ اور لیاقت کی شادی ہو گئی۔ لیاقت حسین نے ایک خاص پلاننگ کے تحت خدیجہ کو اپنے شیشے میں اُتارا تھا اور اس کا یہ مقصد بڑی حد تک پورا ہو گیا تھا۔ یہ شادی اس کے لئے ایک ایسی بنیاد تھی جس پر وہ اپنے عزائم کی من چاہی عمارت کھڑی کر سکتا تھا۔

شادی کے بعد کچھ عرصہ تک تو سب ٹھیک ٹھاک رہا، پھر میاں بیوی میں آئے روز جھگڑے ہونے لگے۔ زاہدہ اوّل روز ہی سے اپنے سوتیلے باپ کو ناپسند کرتی تھی۔ جب لیاقت نے اس کی ماں کے ساتھ غیر انسانی سلوک شروع کیا تو اس کا رویہ ناپسندیدگی سے بڑھ کر غم و غصے میں بدل گیا اور جب وہ اس پر بھی بری نظر ڈالنے لگا تو زاہدہ، لیاقت سے شدید نفرت کرنے لگی۔ دراصل لیاقت حسین جس مقصد کے حصول کی خاطر اس گھر پر ''نازل'' ہوا تھا، اس میں وہ بڑی حد تک کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ اب اسے وہاں سے آف ہونا تھا.......کسی بھی وقت اور کسی بھی بہانے۔ لیکن اس فرار سے پہلے ہی موت نے اسے اپنے سفاک جبڑوں میں بھینچ لیا۔

اس کہانی کے چند پہلوؤں کو میں نے دانستہ آپ سے چھپا لیا ہے۔ ان کی نقاب کشائی عدالتی کارروائی کے دوران مناسب موقع پر کی جائے گی۔

جب میں خدیجہ سے مختلف سوالات کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا تو میں نے غلام مرتضٰی اور پرویز کے بارے میں بھی استفسار کیا۔ وہ یوں چونکی جیسے اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی ہو۔ پھر میز پر قدرے آگے جھکتے ہوئے بولی۔ ''وکیل صاحب! آپ ان دونوں کو اس کیس سے دور ہی رکھیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ ان کی وجہ سے خوامخواہ میری پریشانی بڑھے گی۔ ویسے میں ان کے بارے میں آپ کو بتاتی ہوں۔''

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

''یہ جو مرتضٰی ہے نا، اسے تو آپ خدائی فوج دار سمجھ لیں۔ دنیا بھر کے انسانوں کا درد شاید اسی کے دل میں سما گیا ہے۔ جہاں بھی کوئی مسئلہ دیکھتا ہے، فوراً مدد اور تعاون کے لئے کود پڑتا ہے لیکن ہے بالکل احمق۔ اس کی شمولیت سے اکثر بنتے بنتے معاملات بھی بگڑ جاتے ہیں۔ میں اس کے خلوص اور نیت پر شک نہیں کر رہی ہوں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ اس کی حماقتیں بجائے فائدہ پہنچانے کے نقصان کا باعث بن جاتی ہیں۔ اور یہ جو پرویز ہارڈ ویئر والا ہے نا......''

وہ ایک مرتبہ پھر رُکی، ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگی۔ ''یہ شخص مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس کے دل میں ہماری ہمدردی صرف زاہدہ کی وجہ سے ہے۔ یہ مردود خود بھی زاہدہ پر نگاہ رکھے ہوئے ہے اور کسی نہ کسی بہانے آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ اب یہ جو لیاقت کی موت کا موقع ہاتھ آیا ہے تو وہ پوری طرح سرگرمِ عمل نظر آ رہا ہے۔''

غلام مرتضٰی کے بارے میں خدیجہ کی رائے سے مجھے اتفاق تھا۔ میں نے خود بھی اُسے ایسا ہی چغد اور بے وقوف پایا تھا۔ خدیجہ نے بڑی حد تک پرویز کے حوالے سے بھی میرے اندازے کی تصدیق کی تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ زاہدہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ خدیجہ نے بھی کچھ ایسی ہی بات بتائی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں، میں اپنا اطمینان بھی ضروری سمجھتا تھا۔ لہٰذا خدیجہ سے پوچھ لیا۔

''زاہدہ پر نگاہ رکھنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟'' میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا پرویز، زاہدہ سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے؟''

وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''یہ بات اس نے براہِ راست مجھ سے تو نہیں کہی لیکن اگر وہ ایسا سوچتا بھی ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرا ایسا کوئی خیال نہیں ہے لہٰذا اس کی ہر حرکت مجھے اوچھی اور کمینی نظر آتی ہے۔''

''اگر آپ کا واقعی ایسا کوئی ارادہ نہیں تو پرویز کو صاف الفاظ میں بتا دینا چاہئے۔'' میں نے مشورہ دینے والے انداز میں کہا۔ ''تا کہ وہ کسی خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔''

''میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔'' وہ رُوکھے لہجے میں بولی۔

میں نے اس گھرانے کے لئے پرویز کی تڑپ کو خود اپنی آنکھوں سے ملاحظہ کیا تھا۔ وہ واقعی بہت فکرمند اور پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اسی تناظر میں، میں نے خدیجہ سے پوچھا۔

''آپ کو اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں اس سلسلے میں پرویز سے بات کروں؟''

''وکیل صاحب! میں نے کہا ہے.......آپ ان لوگوں کو بھول جائیں۔'' وہ بیزاری سے بولی۔ ''آپ میری بچی کو جلد از جلد اس وبال سے نکالنے کی کوشش کریں تو میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے.......'' میں نے پُر یقین انداز میں کہا۔ ''میں اپنی پوری توجہ زاہدہ پر مرکوز کر رہا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے دل میں کہا، میں پرویز کو یکسر نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ جتنی شد و مد سے زاہدہ کی رہائی اور بریّت کا خواہاں نظر آتا ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ زاہدہ کو چاہتا ہے اور اسے خدیجہ سے بھی دلی ہمدردی ہے۔ تبھی تو وہ لیاقت کے ظلم وستم کی داستانیں سنانے میرے پاس آیا تھا۔

میں نے اپنی یادداشت میں سے اس کیس کی حد تک غلام مرتضٰی کو ڈیلیٹ کیا اور پرویز کے نام پر سرخ دائرہ بنا دیا۔ یہ وہ شخص تھا جو ملزمہ زاہدہ سے محبت کرتا تھا اس لئے اسے اس کیس سے نکالنا چاہتا تھا۔ وہ ملزمہ کی بے گناہی کے لئے بھی پُر یقین تھا۔ دوسری جانب ملزمہ، مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی۔ اس کی گرفتاری کا ایک سبب یہ کھلی نفرت بھی تھی۔ ازیں علاوہ اسی بناء پر پرویز بھی مقتول کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ لیاقت حسین کو موت کے گھاٹ اُتارا جا چکا تھا۔ اگر یہ قتل زاہدہ نے نہیں کیا تھا تو پھر قاتل کون تھا؟

اس خطرناک سوال کے ممکنہ جواب کے سلسلے میں پرویز کا نام سرِ فہرست چمکتا دکھائی دیتا تھا اسی لئے میں نے اسے سرخ دائرے میں بند کر دیا تھا۔

خدیجہ سے ضروری معاملات طے کرنے کے بعد میں نے اسے اپنے دفتر سے رخصت کر دیا اور ''پرویز اینڈ کمپنی'' کو اپنے پاس بلا لیا۔ ان کے چہرے اُلجھن آمیز سنسنی سے سجے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے پرویز نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا رہا بیگ صاحب؟''

یہ سوال غلام مرتضٰی کے خیالات کی ترجمانی بھی کرتا تھا لہٰذا میں نے جواب دینے سے پہلے باری باری ان دونوں کو دیکھا اور کہا۔ ''آپ لوگوں کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے زاہدہ کا کیس اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

انہوں نے میری بات سننے کے بعد اُلجھن زدہ نظر سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر غلام مرتضٰی نے مجھ سے پوچھا۔ ''لیکن بیگ صاحب! خدیجہ نے تو ہم سے بات تک نہیں کی، کچھ بتایا بھی نہیں اور خاموشی سے چلی گئی۔ ہم اسے اپنے ساتھ لے کر یہاں آئے تھے اور.......''

''وہ بہت زیادہ پریشان ہے نا، اس لئے۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اور میں آپ لوگوں کو بتا رہا ہوں نا، فکر اور تردد والی کوئی بات نہیں۔ جب میں نے زاہدہ کا کیس پکڑ لیا ہے تو اسے باعزت بری بھی کراؤں گا۔ آپ لوگ اطمینان سے گھر جا سکتے ہیں۔ اور ہاں.......'' میں نے چونکنے کی اداکاری کی اور مزید کہا۔ ''خدیجہ کی خواہش ہے کہ آپ دونوں اس کے معاملے میں کہیں نظر نہ آئیں۔''

غلام مرتضیٰ نے یہ سن کر بے پرواہی سے کندھے اُچکا دیئے۔ جبکہ پرویز بے حد متفکر دکھائی دینے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کیس سے الگ ہوتے ہوئے وہ بڑی تکلیف محسوس کر رہا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''پرویز! تم ایک آدھ روز میں مجھ سے ملنے آنا....... میں نے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میں اس رنگ کو کوئی نام نہ دے سکا کہ وہ خوشی کا رنگ تھا یا غم کا۔

غلام مرتضیٰ نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں چند دنوں کے لئے حیدر آباد جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ مجھے چھٹی دے دیں تو میں کل صبح روانہ ہو جاؤں؟''

وہ مجھ سے کچھ اس انداز میں رخصت مانگ رہا تھا جیسے کوئی باقاعدہ میرا ملازم ہو۔ میں نے اس کی بے روزگاری اور پریشان حالی پر ترس کھا کر اسے اپنے ساتھ نتھی کر لیا تھا۔ ورنہ وہ جس قسم کی ''صلاحیتوں'' کا مالک تھا ان سے میں بہ خوبی واقف تھا اور ماشاءاللہ! اب تو آپ بھی مکمل آگاہی حاصل کر چکے ہوں گے۔ چنانچہ میں نے اس سے کہہ دیا۔

''ہاں، ٹھیک ہے، تم حیدر آباد کا چکر لگا آؤ۔ میری طرف سے تمہیں پوری اجازت ہے۔''

اس کے بعد وہ دونوں مجھے ''خدا حافظ'' کہہ کر میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔

اگلے روز میں فرصت نکال کر متعلقہ تھانے پہنچا اور اس کیس کی ملزمہ زاہدہ سے ایک بھرپور ملاقات کی۔ مجھے چونکہ اس کی وکالت کرنا تھی لہٰذا اس سے ملاقات ضروری تھی۔ آدھے گھنٹے کی اس ملاقات میں زاہدہ کی زبانی مجھے بہت سی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ان میں سے بعض تو خدیجہ کے بیان کی تصدیق میں تھیں اور بعض انکشافات کی حامل تھیں۔ میں نے وکالت نامے اور چند ضروری کاغذات پر زاہدہ کے دستخط لئے اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم ایک ذہین اور باصلاحیت لڑکی ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اُمید ہے بہت جلد اس کیس سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔''

وہ متذبذب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کیس سے جان چھوٹ جائے

گی والی بات تو سمجھ میں آ رہی ہے کہ آپ کو اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں پر اعتماد ہوگا۔ لیکن میری صلاحیت اور ذہانت کا اندازہ آپ نے کس شے سے لگایا ہے؟"

یہ سوال کر کے اس نے اپنی ذہانت ہی کا ثبوت تو دیا تھا۔ بہر حال، میں نے اس کے تذبذب کو دور کرنے کی خاطر کہہ دیا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تمہیں دستخط کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"دستخط کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ کیا مطلب؟" اس کی آنکھوں میں اُلجھن تیرنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے بائیں ہاتھ سے دستخط کئے ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوا کہ تم لیفٹ ہینڈر ہو۔ میں نے سن اور پڑھ رکھا ہے بلکہ میرے تجربے میں بھی آیا ہے کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے لوگ بڑے باصلاحیت اور ذہین ہوتے ہیں۔"

وہ خوش ہونے کی بجائے ایک دم اُداس ہوگئی۔ میں نے اس کی تعریف کی تھی۔ فطری طور پر اسے خوش ہونا چاہئے تھا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ بجھ سی گئی تھی اور میں اس کی وجہ بھی سمجھ رہا تھا۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر رہی تھی اس کا تقاضا بری طرح اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ مری وضاحت کے جواب میں اس نے صرف اتنا کہا۔

"ذہین اور باصلاحیت ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ میں ایک ناکردہ جرم میں اس وقت یہاں پڑی ہوئی ہوں۔"

"یہ عارضی پریشانی ہے۔" میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "جب یہ بات طے ہے کہ تمہارا جرم ناکردہ ہے تو تمہیں بہت جلد اس مصیبت سے نجات بھی مل جائے گی۔ میں تمہیں آزادی دلانے کی خاطر ہی تو کوشش کرنے جا رہا ہوں۔"

وہ قدرے مطمئن دکھائی دینے لگی۔ میں نے اسے چند ضروری باتیں سمجھائیں اور وہاں سے واپس آ گیا۔ اب ہماری ملاقات عدالت کے کمرے ہی میں ہوتی۔

***

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں اس کیس کا چالان پیش کر دیا۔ اس دوران میں خاصی تیاری کر چکا تھا۔ لہٰذا میں نے وکالت نامے کے ساتھ ہی ملزمہ کی درخواست ضمانت بھی دائر کر دی۔ قتل کے ملزم کی ضمانت ناممکن حد تک مشکل ہوتی ہے اور وہ بھی پہلی پیشی پر تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ جج نے میرے پیش کردہ دلائل کو رد کرتے ہوئے ملزمہ زاہدہ کو جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

آئندہ دو تین پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہوگئیں۔ عدالت کی باقاعدہ

کارروائی شروع ہونے میں کوئی دو ماہ لگ گئے۔ لیکن آگے بڑھنے سے قبل میں چند ضروری باتیں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اس میں سب سے اہم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق مقتول لیاقت حسین کی موت بارہ اپریل کی رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اُسے گھر کے اندر گردن کاٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ رپورٹ میں اس بات کی وضاحت موجود تھی کہ جب اس کی گردن پر کسی تیز دھار آلے کی مدد سے وار کیا گیا اس وقت وہ حلت نیند میں تھا۔ گویا سوتے میں اسے قتل کیا گیا تھا۔

اس دوران پرویز گاہے بہ گاہے میرے پاس چکر لگاتا رہتا تھا۔ میں نے اسے ہر زاویے سے گھس کر دیکھ لیا۔ اس نے تھوڑے تامل کے بعد اس بات کا اقرار تو کر لیا تھا کہ وہ ملزمہ زاہدہ سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کا خواہش مند تھا لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی اس نے یہ مان کر نہیں دیا کہ کسی بھی حوالے سے لیاقت حسین کی موت میں اس کا ہاتھ رہا ہو۔ اس سلسلے میں وہ بڑی بڑی قسمیں کھانے کے بعد بولا۔

''بیگ صاحب! اگر مجھے یہی کام کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکا ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو پرویز! تمہارا دعویٰ ہے کہ زاہدہ نے اپنے سوتیلے باپ کو قتل نہیں کیا۔ وہ بے گناہ اور بے قصور ہے۔ وکیلِ صفائی ہونے کے ناتے میرا اندازہ بھی یہی ہے۔ لیکن ہمارے ان خیالات اور اندازوں کی عدالت میں کوئی اہمیت نہیں۔ عدالت ہر بات کے لئے ٹھوس ثبوت مانگتی ہے۔ کیا تم اپنے دعوے کی سچائی ثابت کرنے کے لئے کوئی مضبوط دلیل دے سکتے ہو؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''دلیل اور ثبوت تو کوئی نہیں ہے میرے پاس۔ لیکن میرا دل کہتا ہے، زاہدہ کو کسی گہری سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ وہ قاتل نہیں ہے۔''

''عدالت دل کے کہے کا اعتبار نہیں کرتی پرویز!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ وہ اُلجھن زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''پرویز! لیاقت حسین قتل ہوا ہے تو اس کا مطلب ہے اسے کسی نے قتل بھی کیا ہے۔ اگر زاہدہ قاتل نہیں .... جیسا کہ ہمارا خیال ہے تو پھر ہمیں یہ پتہ چلانا ہوگا کہ لیاقت حسین کو کس نے قتل کیا ہے؟ یہ بہت ضروری ہے۔ کیا تم اس بارے میں کوئی اندازہ قائم کر سکتے ہو؟''

وہ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''جناب! سچی بات پوچھیں تو میرا دھیان زاہدہ کی ماں

خدیجہ کی طرف جا رہا ہے........خدیجہ کوئی اچھی عورت نہیں ہے۔"

میں نے اس کے فروعی تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔"تمہارا دھیان کس بناء پر خدیجہ کی طرف جا رہا ہے؟"

وہ مجھے کوئی مدلل جواب نہ دے سکا۔ میں نے اُسے یہ ڈیوٹی سونپ کر رخصت کر دیا کہ وہ اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھے........اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ لیاقت حسین کا اصل قاتل کون ہے؟ اُس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ میری ہدایت پر عمل کرے گا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، عدالت کی باقاعدہ کارروائی میں کوئی دو ماہ لگ سکتے تھے۔ جس روز اس پیشی کا وقت آیا، عدالت کا کمرہ سامعین سے بھرا ہوا تھا۔ جج اپنے چیمبر سے نکلا اور کرسی انصاف پر براجمان ہو گیا۔ چند لمحات تک وہ حاضرینِ عدالت کو ٹٹولتی ہوئی گاہ سے دیکھتا رہا پھر کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ اس کی مخاطب اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل زاہدہ تھی۔

"بی بی! تم پر الزام ہے کہ بارہ اپریل کی رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان تم نے اپنے سوتیلے باپ لیاقت حسین کو موت کے گھاٹ اتارا ہے........کیا تم اپنے اس جرم کا اقرار کرتی ہو؟"

جج کے استفسار کے جواب میں ملزمہ زاہدہ نے صحتِ جرم سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد استغاثہ کے گواہوں کی باری آئی لیکن اس سے پہلے کہ گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوتا، میں نے جج سے درخواست کی کہ میں اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔ کسی بھی آئی او (انکوائری آفیسر) کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ جیسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر انکوائری آفیسر کو عدالت کے کمرے میں موجود رہنا پڑتا ہے۔

جج نے میری درخواست کو لائق توجہ جانا اور اس کے اشارے پر تفتیشی افسر وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ شاید میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ اس کیس کے تفتیشی افسر کا نام شفیع شاہ تھا۔ وہ عہدے کے اعتبار سے ایک انسپکٹر تھا اور متعلقہ تھانے کا انچارج بھی وہی تھا۔

"شاہ صاحب!" میں نے آئی او کی طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔"آپ ایک طرح سے استغاثہ کے والی وارث ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"نہیں جناب!" وہ بھی دوستانہ انداز میں بولا۔"آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔"

میں نے کہا"میں نے استغاثہ کی رپورٹ کا بہ غور مطالعہ کیا ہے اور میری سمجھ میں یہ بات آئی ہے کہ ملزمہ زاہدہ کو صرف اس بناء پر گرفتار کیا گیا ہے کہ وہ مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی؟"

’’اس کی گرفتاری کی ایک وجہ نفرت بھی ہے۔‘‘ آئی او نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔
’’اس کے علاوہ سب سے مضبوط جواز یہ ہے کہ مقتول نے اپنی موت سے ایک روز قبل تھانے میں آ کر اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ ملزمہ کی طرف سے اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ اس گھر میں خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرتا ہے۔ اس رپورٹ کے اگلے روز ہی وہ اپنی خواب گاہ میں قتل کر دیا گیا۔ لہٰذا مقتول کے آخری خدشاتی بیان کو ہم نے بہت زیادہ اہمیت دی اور ملزمہ کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دی۔‘‘

’’ہوں!‘‘ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ’’تو کیا اس تفتیش کے دوران ملزمہ نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا؟‘‘

’’نہیں جناب! وہ صحتِ جرم سے انکاری ہے۔‘‘ اس نے اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے جواب دیا۔ ’’لیکن استغاثہ کے پاس کچھ ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ ملزمہ کا جرم معزز عدالت کے روبرو ثابت ہو جائے گا۔‘‘

میں نے سلسلۂ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’شاہ صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ اپنی موت سے ایک روز قبل مقتول آپ کے پاس آیا تھا اور اس نے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ ملزمہ اس کی جان لینا چاہتی ہے۔ مقتول کی موت بارہ اپریل کی رات واقع ہوئی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ گیارہ اپریل کو آپ کے پاس آیا تھا؟‘‘ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ’’شاہ صاحب! آپ کو یاد ہوگا، وقوعہ سے دو روز قبل یعنی دس اپریل کو مقتول کے محلے کے چند افراد آپ کے پاس آئے تھے اور انہوں نے مقتول کے ظالمانہ رویے کی شکایت کرتے ہوئے آپ سے تعاون کی درخواست کی تھی؟‘‘

’’ہاں....... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔‘‘ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ’’میں نے ان کی شکایت پوری توجہ سے سنی تھی۔‘‘

’’لیکن اس شکایت پر کوئی قانونی کارروائی کرنے کی بجائے انہیں سوکھا ٹرخا دیا تھا۔‘‘ میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ ترش لہجے میں بولا۔ ’’وکیل صاحب! آپ تو قانون دان ہیں۔ میں بھلا آپ کو کیا سمجھاؤں گا؟ کوئی بھی قانونی کارروائی کرنے کے لئے ہمیں بھی کچھ دیکھنا اور سوچنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی شکایت ’’مدعی سست، گواہ چست‘‘ کی زندہ مثال تھی۔ اصولی طور پر زاہدہ یا خدیجہ کو میرے پاس آنا چاہئے تھا اور میں نے ان سے کہا بھی یہی تھا اور ان ماں بیٹی میں سے کسی کو میرے پاس لے آئیں تو میں ان کی شکایت دور کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن.......‘‘ وہ لمحہ

پھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''لیکن ان کی بجائے اگلے روز مقتول خود مجھ سے ملنے تھانے آ گیا اور اس نے مجھے بالکل مختلف کہانی سنائی۔ میں نے اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ اس کے خلاف میرے پاس ایک سنگین نوعیت کی شکایت درج کرائی گئی ہے۔ وہ اپنی بیوی خدیجہ اور سوتیلی بیٹی زاہدہ کے ساتھ بڑا ظالمانہ برتاؤ کرتا ہے۔ اس پر وہ بڑی بڑی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ مجھے بالکل غلط بتایا گیا ہے۔ جبکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ وہ اپنی بیوی اور سوتیلی بیٹی کا بہت خیال رکھتا ہے۔ بیوی سے چھوٹا موٹا جھگڑا ہو جانا الگ بات ہے لیکن اس نے کبھی زاہدہ کو اُف تک نہیں کی۔ بہرحال، میں نے اسے سمجھا بجھا کر رخصت کر دیا تھا۔ اس سے اگلے روز اسے قتل کر دیا گیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''آئی او صاحب! آپ نے بتایا ہے، مقتول اس خدشے کے ساتھ آپ کے پاس پہنچا تھا کہ ملزمہ سے اس کی جان کو خطرہ ہے۔ کیا اُس نے اس خدشے کا کوئی سبب بھی بتایا تھا؟''

''جی ہاں.......'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا کہنا تھا، ملزمہ اس سے شدید نفرت کرتی ہے۔''

''اُس نے اس شدید نفرت کی وجہ بھی بتائی ہو گی؟''

''ملزمہ کو گوارا نہیں تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کے باپ کی جگہ لے۔'' آئی او نے جواب دیا۔

''پھر تو اسے اپنی ماں سے بھی نفرت کرنا چاہئے تھی؟'' میں نے ایک اہم نکتہ اُٹھایا۔ ''کیونکہ اس کی مخالفت کے باوجود بھی خدیجہ نے اپنی مرضی سے یہ شادی کی تھی؟''

''ہو سکتا ہے وہ اپنی ماں خدیجہ سے بھی نفرت کرتی ہو۔'' وہ بے پرواہی سے بولا۔ ''مجھے ان کے گھریلو حالات کا تفصیلی علم نہیں ہے۔''

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے انکوائری آفیسر سے پوچھا۔

''مجھے پتہ چلا ہے، آلۂ قتل تلاش کرنے میں آپ کو ایک بھی پاپڑ نہیں بیلنا پڑا تھا۔ وہ تیز دھار چھری جس کی مدد سے مقتول کی شہ رگ کاٹی گئی، وہ مقتول کے بیڈ کے نیچے پڑی مل گئی تھی۔ اس خون آلود چھری کو آپ نے فوراً اپنے قبضے میں کر لیا تھا؟''

اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''آپ کو بالکل درست پتہ چلا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آلۂ قتل کو قبضے میں کرتے ہی آپ نے اس پر سے فنگر پرنٹس تو ضرور

اُٹھائے ہوں گے۔ لیکن پتہ نہیں، فنگر پرنٹس کی رپورٹ دیکھنے کو کیوں نہیں ملی؟''

''وہ رپورٹ اس لئے آپ کی نظر سے نہیں گزری کہ فنگر پرنٹس اٹھانے میں کامیابی نہیں ہوسکی تھی۔'' شفیع شاہ نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ اس لئے کہ آلۂ قتل پھل سے لے کر دستے تک خون میں لتھڑا ہوا تھا۔'' آئی او وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''ایک آدھ معمولی سی کھلی جگہ ملی لیکن وہاں کوشش کرنے کے باوجود بھی قاتل کی انگلیوں کے نشانات کو حاصل نہیں کیا جاسکا۔ آپ اسے ایک اتفاق سمجھیں یا پھر ملزمہ کی خوش قسمتی!''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور معنی خیز انداز میں کہا۔ ''میں اسے اتفاق سے زیادہ ملزمہ کی بدقسمتی سمجھوں گا۔''

''بدقسمتی......!'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں دوہرایا۔ ''وہ کیوں وکیل صاحب؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''بدقسمتی اس لئے کہ اگر آپ آلۂ قتل پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات اٹھانے میں کامیاب ہو جاتے تو اسی لمحے میری موکل کی بے گناہی ثابت ہو جاتی۔ کیونکہ آپ کو کہیں بھی ملزم کے فنگر پرنٹس نہ ملتے اور جو پرنٹس آپ کو حاصل ہوتے وہ ملزمہ کی انگلیوں کے نشانات سے قطعی مختلف ہوتے۔''

میرا بیان کردہ نکتہ پتہ نہیں اس کی سمجھ میں آیا تھا یا نہیں، بہرحال وہ اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''یقیناً آپ نے جائے وقوعہ کا بڑی تفصیل سے معائنہ کیا ہوگا۔ میں نے اپنی کوشش کے تحت کچھ معلومات حاصل کر لی ہیں۔ آپ سے ان کی تصدیق چاہوں گا۔ واضح رہے کہ ملزمہ کی والدہ خدیجہ ان معلومات کی تصدیق کر چکی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... پوچھیں، آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' وہ بے پرواہی سے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ جائے وقوعہ یعنی مقتول کا بیڈ روم دس ضرب بارہ فٹ کی پیمائش کا حامل کمرہ ہے اور اس کے ایک کونے میں بیڈ بچھا ہوا ہے۔ بیڈ کی پیمائش پانچ بائی چھ فٹ ہے؟''

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی معلومات درست ہیں۔''

اس کے جواب دینے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے توقع کر رہا ہو، میں جرح کی پٹاری میں سے

کوئی خطرناک سانپ برآمد کرنے والا ہوں۔ میں نے اس کی توقع کو پورا کرتے ہوئے کہا۔

''آئی او صاحب! اس بیڈ روم میں داخل ہونے کا راستہ مغربی دیوار میں ہے جبکہ مذکورہ بیڈ مغربی اور شمالی دیوار کے اتصال سے بننے والے کونے میں بچھا ہوا ہے.......اور وہ بھی اس طرح کہ بیڈ کا سرہانہ دیواروں سے بننے والے کونے کی سمت ہے۔ اسی بیڈ پر لیاقت حسین کو سوتے میں قتل کیا گیا ہے.......اور اسی بیڈ کے نیچے سے آپ کو آلۂ قتل ملا تھا؟''

''جی.......جی، آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''آپ نے آلۂ قتل یعنی اس خطرناک چھری پر بھی تحقیق فرمائی ہے جس کے نتیجے میں آپ کو پتہ چلا تھا کہ وہ اس گھر میں استعمال ہونے والی چھری نہیں تھی بلکہ وہ اس گھر کے لئے ایک نئی چیز تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جی ہاں.......خدیجہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس چھری کا ان کے گھر سے کوئی تعلق نہیں۔''

''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ مقتول کو سوتے میں قتل کیا گیا تھا۔'' میں نے جرح کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کی موت کا وقت رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہے جب رات کا آغاز ہوتا ہے۔ کیا آپ مجھے بتانا پسند فرمائیں گے کہ مقتول رات شروع ہوتے ہی ایسی بے خبری کی نیند کیوں سو رہا تھا کہ کسی نے اس کی گردن کاٹ کر اسے موت کی نیند سلا دیا اور اسے مطلق خبر نہ ہو سکی؟''

''آپ کے اس سوال کا بالکل متشفی جواب تو ملزمہ کی ماں خدیجہ ہی دے سکتی ہے.......''

وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''میری معلومات یہ ہیں کہ اس روز مقتول کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔''

''او کے!.......میں آپ کی موجودگی میں یہ سوال مقتول کی بیوہ خدیجہ سے ضرور پوچھوں گا۔'' اُس نے مصالحانہ انداز میں کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ جب آپ جائے وقوعہ پر پہنچے تو آپ نے مقتول کو کس حالت میں دیکھا تھا؟''

''مردہ حالت میں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

''میں اس کی لاش کو پوزیشن کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''وہ اپنے بستر پر چت لیٹا تھا۔'' آئی او میرے سوال کی تہہ میں اُترتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کی گردن شہ رگ پر سے کٹی ہوئی تھی۔''

''یعنی آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب اس کی گردن پر چھری چلائی گئی تو اس نے خاموشی

سے جان دے دی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔''وہ جیسا چت لیٹا تھا، بالکل ویسا ہی پڑا رہا؟''

وہ جلدی سے بولا۔''آپ میرا مطلب سمجھ نہیں سکے۔ یا پھر میں اپنی بات کی وضاحت نہیں کر سکا ہوں۔''

''جی....... میں سن رہا ہوں۔ آپ ارشاد فرمائیں۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔''میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میرے خیال میں جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ اپنے بیڈ پر چت سویا ہوا تھا۔ گردن کٹنے کے سبب اس کے بدن میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی پوزیشن وہ نہ رہی جو پہلے تھی....... میں نے جب اُس کی لاش کو دیکھا تو وہ کم و بیش کروٹ کے بل بیڈ کے سرے پر پہنچا ہوا تھا۔''

''کون سے سرے پر؟'' میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی سوال داغ دیا۔

''وہ سرا جو دیوار کی جانب ہے۔'' آئی او نے جواب دیا۔

''شمالی دیوار والا سرا نا؟''

اس نے آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن میں جائے وقوعہ کے نقشے کو تازہ کیا پھر آنکھیں کھولتے ہوئے بولا۔''بالکل....... بالکل! بیڈ کی ایک سائیڈ کمرے کی شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ہے اور دوسری سائیڈ سے بیڈ پر اُترنا چڑھنا ہوتا ہے۔ اگر اس کا مُردہ جسم اس سمت میں بیڈ پر پڑا ہوا ملتا تو پھر دیوار کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔''

وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بستر کی حالت اور اس پر لگے ہوئے خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل مقتول بیڈ کی دیوار والی سائیڈ ہی میں چت لیٹا ہوا تھا۔''

''تھینک یو آئی او صاحب!'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اچانک ہی اس سے پوچھ لیا۔''کیا آپ کو معلوم ہے، اس کیس کی ملزمہ اور میری مؤکل زاہدہ لیفٹ ہینڈر ہے؟''

''نن....... نہیں.......'' وہ گڑبڑا گیا۔''ہاں....... ہاں.......''

جج نے چونک کر انکوائری آفیسر کی طرف دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''شاہ جی! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟....... آپ نے وکیل صاحب کے ایک سوال کے دو مختلف جواب دیئے ہیں....... کیوں؟''

وہ اُلجھ تو چکا ہی تھا، سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے وضاحت پیش کی۔''وہ.......

جنابِ عالی! بات دراصل یہ ہے کہ وکیلِ صفائی نے اتنا اچانک یہ سوال کیا ہے کہ میں تھوڑا اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ میرا مطلب ہے، میرا دھیان اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ جبکہ........ میں جانتا ہوں، ملزمہ بائیں ہاتھ سے لکھنے اور کام کرنے کی عادی ہے۔ میں نے اس کی حرکات وسکنات کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے اور ایک دو ضروری کاغذات پر اسے دستخط کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔''

''یہ بڑی اچھی بات ہے کہ آپ نے ملزمہ کی حرکات وسکنات کا بغور جائزہ لیا ہے۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

اس پیشی پر ہمارے کیس کا نمبر خاصا پیچھے لگا ہوا تھا اس لئے کارروائی کے لئے زیادہ وقت نہ مل سکا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

***

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے سلمٰی نامی ایک عورت کو گواہی کے لئے پیش کیا گیا۔ سلمٰی بھی گولیمار ہی کی رہنے والی تھی۔ اس کا گھر خدیجہ والی گلی میں چار گھر چھوڑ کر واقع تھا۔ وہ واجبی سی شکل وصورت کی مالک ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔

سلمٰی نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا اور اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروا دیا۔ اس کے بعد وکیلِ استغاثہ جج کی اجازت سے گواہوں والے کٹہرے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور استغاثہ کی گواہ سلمٰی کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ کو اس محلے میں رہتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، خود کو گولیمار ہی کی گلیوں میں دیکھا ہے۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔ ''بزرگ بتاتے ہیں کہ وہ شروع سے وہیں رہ رہے ہیں۔''

''شروع'' سے پتہ نہیں اس کی کیا مراد تھی۔ یہ دنیا شروع ہوتے وقت یا قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں سے؟ چونکہ وکیلِ استغاثہ نے اس سلسلے میں کوئی وضاحت ضروری نہیں سمجھی تھی اس لئے گواہ نے از خود کوئی تفصیل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔

''پھر تو آپ ملزمہ اور اس کے گھر والوں کو بڑی اچھی طرح جانتی ہوں گی؟'' وکیلِ استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

گواہ نے ملزمہ زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی........ بہت اچھی طرح!''

''ملزمہ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

''یہ بہت ہی غصہ ور ہے۔'' استغاثہ کی گواہ نے جواب دیا۔ ''ایک دم آگ کا گولا۔''
''اس کا مطلب ہے ملزمہ سے اکثر آپ کی بات چیت ہوتی رہتی۔''
''جب ایک محلے، ایک گلی میں رہیں گے تو لازمی بات ہے، اُٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے بات چیت تو ہوگی ہی۔''
وکیلِ استغاثہ نے اس سے پوچھا۔ ''ٹھیک ہے........ بعض لوگوں کو کم غصہ آتا ہے اور بعض افراد کو زیادہ۔ لیکن آپ نے خاص طور پر ملزمہ کے لئے ''آگ کا گولا'' کے الفاظ کیوں استعمال کئے ہیں؟........ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''
میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا، وکیلِ استغاثہ اس انداز میں جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کون سی منزل تک پہنچانا چاہتا ہے۔ لٰہذا خاموشی سے اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔
استغاثہ کی گواہ سلمٰی نے اس کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''میں نے ملزمہ کو آگ کا گولا اس لئے کہا ہے کہ اس کے غصے میں ایک خاص قسم کا انتقامی جارحانہ پن پایا جاتا ہے۔ یہ جسے نشانے پر رکھ لیتی ہے پھر اس کے خلاف سوچتے ہوئے اسے کسی بات کی پرواہ نہیں رہتی۔ اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ یہ کیا کر رہی ہے۔ کیا کہہ رہی ہے۔ آپ اسے آتشی مزاج کہہ سکتے ہیں۔''
''ہوں!'' وکیلِ استغاثہ نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور پوچھا۔ ''کیا آپ معزز عدالت کے روبرو ملزم کی آتش مزاجی کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہیں؟''
میں وکیلِ استغاثہ کی چال کو شروع ہی میں سمجھ گیا تھا۔ اب اس کے عزائم کھل کر سامنے آ رہے تھے۔ سلمٰی نے اس کے استفسار کے جواب میں بڑے دھڑلے سے ملزمہ کی سمت انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''سب سے بڑی مثال تو آپ کے سامنے ہے وکیل صاحب! ملزمہ اپنے سوتیلے باپ سے شدید نفرت کرتی تھی اور بالآخر اس نفرت نے ملزمہ کو آج عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگر یہ لڑکی اپنے غصے اور جلال کو قابو میں رکھتی تو اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔''
وکیلِ استغاثہ بڑی پلاننگ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے گواہ کے جواب ہی سے ایک نکتے کو اُچک لیا اور قدرے اضطراری انداز میں استغاثہ کی گواہ سلمٰی سے پوچھا۔
''کیا کبھی ملزمہ نے آپ کے سامنے اپنی اس نفرت کا اظہار بھی کیا تھا جو وہ سوتیلے باپ یعنی مقتول لیاقت حسین کے لئے اپنے دل میں رکھتی تھی؟''
''کوئی ایک بار کیا؟'' سلمٰی نے مخصوص انداز میں اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور جواب کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اس نے کئی مرتبہ اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے ہر دفعہ اسے سمجھایا کہ اس کی ماں خدیجہ نے جو بھی کیا وہ حالات کا تقاضا تھا۔ دوسری شادی کرنا

کوئی جرم یا گناہ کا کام نہیں ہے۔ ٹھیک ہے، وہ اپنے باپ مظفر علی سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ میں مانتی ہوں، مظفر تھا بھی اسی لائق کہ دوسرے اس سے محبت کریں۔ مگر یہ تو کوئی طریقہ یا اصول نہیں کہ سگے باپ کی محبت کو سوتیلے باپ سے نفرت میں بدل دے۔ وہ مقتول کو مرحوم کا مقام نہیں دینا چاہتی، نہ دے لیکن اس کے بدلے میں شدید نفرت کی تو کوئی تک نہیں بنتی نا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں......'' وہ تھوڑی دیر کے لئے متوقف ہوئی، دو چار گہری گہری سانسیں کھینچیں، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں، تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ میں نے ایک دو بار ملزمہ کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ یہ مقتول سے اس قدر نفرت کرتی ہے کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ اور......آپ دیکھ لیں......'' وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوئی، پھر اکیوزڈ باکس میں کھڑی ملزمہ کی جانب اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اس آگ کے گولے نے آخر اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کر ہی لیا۔''

وکیلِ استغاثہ اپنے گواہ کی زبانی معزز عدالت کو جو کچھ باور کرانا چاہتا تھا، اپنی عقل و فہم کے مطابق وہ اس میں کامیاب ہو گیا تھا لہٰذا اس نے فاتحانہ انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے جرح کے سلسلے کو موقوف کر دیا۔ میں اپنی باری پر اُٹھا اور گواہ والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ گیا۔

میں نے استغاثہ کی گواہ سلمیٰ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے براہِ راست سوال کیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ ملزمہ آپ کی گلی میں رہتی تھی اور اکثر و بیشتر آپ کو اس کے خیالات جاننے کا بھی موقع ملتا رہتا تھا۔ ذرا سوچ کر جواب دیں۔ کیا کبھی ملزمہ نے آپ کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی؟''

''مجھے وہ کیوں نقصان پہنچائے گی......؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''مجھ سے اس کی کیا دشمنی؟''

''یعنی آپ تسلیم کرتی ہیں کہ ملزمہ آپ کی دشمن نہیں ہے؟''

''ہاں، ہاں......اس میں ایسی اُلجھن والی کون سی بات ہے؟''

''اگر وہ آپ کی دشمن نہیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اسے اپنا دوست سمجھتی ہیں؟''

وہ میرے سوالات میں اُلجھ کر رہ گئی۔ متاملانہ انداز میں بولی۔ ''یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ آپ جسے اپنا دشمن نہ سمجھیں وہ آپ کا دوست بھی ہو۔ میری ملزمہ سے کبھی دوستی رہی ہے اور نہ ہی دشمنی۔''

''جب آپ کی ملزمہ سے کبھی دشمنی نہیں رہی تو پھر آپ اس کیس میں اس سے دشمنی کرتے ہوئے کیوں دکھائی دے رہی ہیں؟'' میں نے خاصے جارحانہ انداز میں سوال کیا۔

وہ گڑبڑا کر رہ گئی، مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''مم........میں نے........کیا دشمنی کی ہے؟''

میں نے اسے تیز نظر سے گھورا اور خاصے سخت الفاظ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی بیگم! آپ نے وکیلِ استغاثہ کی جرح کے جواب میں معزز عدالت کے روبرو بتایا ہے کہ ملزمہ انتہائی غصہ ور، منتقم مزاج اور جارحانہ انداز کی مالک ہے۔ یہاں تک کہ آپ نے اسے آگ کے گولے سے تشبیہہ دے ڈالی۔ یہ بھی کہا کہ ملزمہ جس شخص کو نشانے پر رکھ لیتی ہے، اس کے خلاف سوچتے اور عمل کرتے ہوئے اسے کسی بات کی پرواہ نہیں ہوتی۔ انہی خصوصیات کی بناء پر آپ نے ملزمہ کو ''آگ کا گولا''، ''آتش مزاج'' اور پتہ نہیں کون کون سے خطاب دے ڈالے ہیں۔ جو شخص آپ کا دوست ہو اور نہ ہی دشمن، اس کے بارے میں اس نوعیت کی بیان بازی کیا معنی رکھتی ہے؟ کیا یہ ملزمہ کے لئے آپ کی کھلی دشمنی نہیں ہے؟''

اُس نے بوکھلاہٹ آمیز انداز میں اپنے زیریں ہونٹ کو دانتوں سے دبایا پھر خاصے منتشر لہجے میں بولی۔ ''میں نے ملزمہ کی عادات و اطوار اور مزاج کو جیسا پایا، ویسا ہی بیان کیا ہے۔ میرے اس عمل سے کہیں بھی دشمنی نہیں جھلکتی۔''

''بہت خوب........!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تو اس کا مطلب ہے آپ نے معزز عدالت کو حقائق سے آگاہ کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ کیونکہ استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے یہ آپ کا حق بنتا تھا۔''

میں لمحہ بھر کے لئے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی بیگم! آپ کے بیان سے تو یہی تاثر اُبھرتا ہے کہ آپ نے ملزمہ کو اپنی آنکھوں سے وہ جرم کرتے دیکھا ہے جس کے الزام میں وہ اس وقت ملزموں والے کٹہرے میں کھڑی نظر آ رہی ہے؟''

''مم.....میں نے ایسی تو.....کوئی بات نہیں کی.....کہ میں نے.....'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کہ میں نے اپنی آنکھوں سے ملزمہ کو اپنے سوتیلے باپ کا قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے.....آپ شاید میری بات سمجھ نہیں سکے یا.....آپ اس کا غلط مطلب نکال رہے ہیں۔''

وہ اپنے قدموں سے اُکھڑ چکی تھی۔ اس کی بنیاد کو ہلا کر میں نے اپنے لئے راہ ہموار کر لی تھی۔ وکیلِ استغاثہ نے اسے جہاں تک سبق یاد کروا رکھا تھا، میں نے پرچۂ امتحان اس سے تھوڑا آگے سے ترتیب دے ڈالا تھا۔ اسی لئے میرے سوالات کے جواب دیتے ہوئے وہ

خاصی دقت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے جرح کو اختتام کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

''سلمٰی بیگم! الفاظ کو گھمانے پھرانے سے اگرچہ مفہوم میں تھوڑی بہت تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے لیکن اس سے اصل واقعے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ میں نے آپ کے الفاظ کا غلط مطلب نکالا ہے اور نہ ہی ایسی بات ہے کہ میں انہیں سمجھ نہ پایا ہوں۔''

میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔''آپ نے چند منٹ پہلے وکیلِ استغاثہ کو بتایا ہے کہ آپ نے اکثر و بیشتر ملزمہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ اپنے سوتیلے باپ سے شدید نفرت کرتی ہے اور اگر اسے موقع ملا تو وہ اس کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ پھر آپ نے ملزمہ پر انگلی اٹھاتے ہوئے بڑے وثوق سے کہا......دیکھ لیں، اس آگ کے گولے نے آخر اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کر ہی لیا......آپ کے یہ دوٹوک الفاظ اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ آپ ملزمہ کے مجرم ہونے کے لئے پُر یقین ہیں۔ یعنی آپ نے اپنی آنکھوں سے ملزمہ کو لیاقت حسین کا قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے؟''

میں نے اُسے ایک ایسی بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا کہ وہ گھبرا کر راستے کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے لگی اور بالآخر اس کی متلاشی نظر وکیلِ استغاثہ کے چہرے پر جا ٹکی۔ لیکن قبل اس کے کہ وکیلِ استغاثہ ''آبجیکشن یور آنر!'' کا نعرہ لگاتا، میں نے گواہ کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''سلمٰی بیگم! آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر کوئی کنفیوژن ہو تو میں اپنا سوال دوہرا دیتا ہوں۔''

وہ جلدی سے بولی۔''کوئی کنفیوژن نہیں۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ میرا مطلب ہے، میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ میں نے ملزمہ کو قتل کی واردات کرتے ہوئے دیکھا ہے۔''

''اس بات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ملزمہ کو بے گناہ سمجھتی ہیں؟'' میں نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''مم......میں نے ایسی بھی کوئی بات نہیں کی۔'' وہ بری طرح اُلجھ کر رہ گئی تھی۔

وکیلِ استغاثہ فوراً اس کی مدد کو لپک آیا۔ میں نے گواہ سلمٰی بیگم کو سوالات کی جس منجدھار میں لا پھینکا تھا اگر وہاں بھی وکیلِ استغاثہ اسے بچانے کے لئے اپنا ہاتھ آگے نہ بڑھاتا تو پھر اس کی وکالت کا کیا جواز باقی رہ جاتا تھا۔

''مجھے سخت اعتراض ہے جنابِ عالی!'' وکیلِ استغاثہ کی چیختی ہوئی آواز عدالت کے

کمرے میں اُبھری۔ ''میرے فاضل دوست، استغاثہ کی معزز گواہ کو ذہنی اُلجھاؤ میں ڈال کر زچ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ انہیں اس قسم کی حرکتوں سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

میں نے اس کے حملے کا جواب دینا ضروری جانا اور جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یور آنر! میں نے فی الواقعہ ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ گواہ کے بیان میں موجود الفاظ کے جو معنی اور مفہوم اُبھر کر سامنے آتا ہے، میں نے تو اس تاثر کی بات کی ہے۔ استغاثہ کی گواہ سلمیٰ بیگم نے جس اعتماد کے ساتھ میری مؤکل کو آگ کا گولا قرار دیتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کر لیا ہے........ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ گواہ کو پورا یقین ہے کہ مقتول کی موت کی ذمے دار صرف اور صرف ملزمہ ہے۔ یہ وثوق، یہ اعتماد اور یہ یقین اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر گواہ نے اپنی آنکھوں سے ملزمہ کو قتل کی واردات کرتے دیکھا ہو۔ دیٹس آل یور آنر!''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں وکیل صاحب! اپنے گواہ کے بیان کے بارے میں؟''

وکیلِ استغاثہ نے جج کو جواب دینے سے پہلے گھور کر معاندانہ نظر سے میری طرف دیکھا، پھر روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے بولا۔

''جنابِ عالی! استغاثہ کی گواہ ایک سیدھی سادھی گھریلو عورت ہے۔ وہ میرے فاضل دوست کی طرح الفاظ کے گھماؤ پھراؤ کے فن سے آشنا نہیں اس لئے وکیلِ صفائی نے اس کے الفاظ کو پکڑ کر اتنا بڑا طوفان کھڑا کر دیا ہے کہ وہ اس کے نیچے دبی اور پھنسی ہوئی دکھائی دیتی ہے حالانکہ اس کا مطلب ہرگز وہ نہیں تھا جو وکیلِ صفائی سمجھ رہے ہیں۔''

''پھر کیا مطلب تھا اس کا؟'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی گیپ دیکھ کر تیز شاٹ کھیل دیا۔ ''آپ وکیلِ استغاثہ ہیں۔ استغاثہ کے گواہ کے بیان کی وضاحت آپ ہی بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔''

بات ختم کرتے ہی میں نے معنی خیز انداز میں جج کی طرف دیکھا۔ اُس نے اثبات میں سر ہلایا اور سوالیہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی سمت دیکھنے لگا۔ وکیلِ استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''جنابِ عالی! بات دراصل یہ ہے کہ استغاثہ کی گواہ سلمیٰ بیگم نے ملزمہ کو اپنی آنکھوں سے قتل کی واردات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو یہ ''عینی شاہد'' کہلاتی۔ استغاثہ کی طرف سے اسے کہیں بھی ''آئی وٹنس'' یعنی عینی شاہد نہیں کہا گیا۔ اس بے چاری نے

تو ملزمہ کے مزاج، عادات اور عزائم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اپنی سادگی کے باعث وکیلِ صفائی کے شکنجے میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ جبکہ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ........'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بتانے لگا۔

''یور آنر! انسان کی سوچ اور بیان اس کے ماحول سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ ملزمہ زاہدہ کو اس کے سوتیلے باپ لیاقت حسین کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے عدالت تک پہنچایا گیا ہے۔ ایکوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں اسے کھڑے دیکھ کر ہر دیکھنے والے کے ذہن میں یہی خیال جاگے گا کہ اس نے کوئی نہایت ہی سنگین جرم کیا ہوگا۔ گواہ چونکہ وقوعہ کی سنگینی سے بھی بہ خوبی آگاہ ہے لہٰذا اس نے حالاتِ حاضرہ اور ملزمہ کے خطرناک خیالات کی روشنی میں کہہ دیا........اس آگ کے گولے نے اپنے سینے میں دہکتے ہوئے نفرت اور انتقام کے الاؤ کو ٹھنڈا کر لیا........بس اتنی سی بات ہے۔''

وکیلِ استغاثہ نے نہایت ہی محتاط الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے اپنے گواہ کے بیان پر مرہم کاری کرنے کی کوشش کی تھی۔ جج نے اُکتائے ہوئے انداز میں اس کی وضاحت سنی اور اس کے خاموش ہونے پر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

''بیگ صاحب! یہ عدالت استغاثہ کی گواہ سلمیٰ بیگم کے بیان کو یہاں تک محدود کرتی ہے کہ اس نے ملزمہ کی باتوں اور خیالات میں اپنے سوتیلے باپ کے لئے شدید نوعیت کی نفرت کو محسوس کیا تھا۔ اسی بناء پر اس کا اندازہ ہے کہ ملزمہ نے اپنے خیالات اور عزائم کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اپنے سوتیلے باپ لیاقت حسین کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔ اس نے ملزمہ کو جرم کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''نو آبجیکشن یور آنر!'' میں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایگری۔''

جج نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو گواہ کے بیان کی اس شکل پر کوئی اعتراض ہو تو بتائیں۔''

وکیلِ استغاثہ اس موقع پر کوئی اعتراض اٹھا کر خود کو کسی بڑی مصیبت میں گرفتار کرنے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ جج نے ایک انتہائی معقول اور اصولی بات کی تھی۔ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بڑی فرماں برداری سے بولا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے جنابِ عالی!''

''آپ کو استغاثہ کی گواہ سے کوئی اور سوال پوچھنا ہے؟'' جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!''

میں نے سلمیٰ بیگم کو فارغ کیا تو استغاثہ کی جانب سے یکے بعد دیگرے دو گواہوں کو شہادت کے لئے پیش کیا گیا۔ ان میں ایک قمر النساء نامی عورت تھی۔ اس کا بیان اور مقاصد سلمیٰ بیگم سے بڑی حد تک ملتے جلتے تھے۔ لہٰذا میں نے صرف دس منٹ کی جرح ہی میں اسے کلین بولڈ کر دیا۔

دوسرے گواہ کا نام طیب علی معلوم ہوا۔ اس کا بیان پولیس کے مؤقف کی حمایت کرتا تھا۔ یعنی مقتول نے اپنی موت سے قبل گواہ طیب علی سے اپنے اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ ملزمہ کی طرف سے اسے جان کا خطرہ ہے۔ لیکن طیب علی کے پاس کوئی ثبوت تھا اور نہ ہی اپنی بات کو منوانے کے لئے کوئی ٹھوس دلیل۔ مقتول دوبارہ زندہ ہو کر اس کے مؤقف کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا لہٰذا میں نے کڑی جرح کی مدد سے جلد ہی طیب علی کو کارنر کر دیا۔

ان دونوں گواہوں کے بیانات میں کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی کہ جس کی تفصیل بیان کی جائے۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوا تو جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کرنے کا اعلان کر دیا۔

''دی کورٹ اِز ایڈ جارنڈ........!''

***

منظر اسی عدالت کا تھا....... گواہوں والے کٹہرے میں ملزمہ کی ماں اور مقتول کی بیوہ خدیجہ بیگم کھڑی تھی۔ آج اُس نے خاصا سوبر لباس زیب تن کر رکھا تھا اور میک اپ وغیرہ پر بھی محنت اور وقت صرف کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ اس سیشن کی سب سے اہم گواہ تھی۔ ایک اعتبار سے اُسے اس کیس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

خدیجہ نے اپنا طویل اور سنجیدہ بیان ریکارڈ کرایا، پھر دونوں طرف کے وکلاء کے سوالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو گئی۔ یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی کہ میں خدیجہ کے ایماء پر اس کی بیٹی کا کیس لڑتے ہوئے ملزمہ زاہدہ کو باعزت بری کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور وکیلِ استغاثہ، استغاثے کی سربلندی قائم رکھنے کے لئے ملزمہ کو گواہ کے شوہر کے قتل کے الزام میں عدالت سے کڑی سزا دلوانے کا خواہاں تھا۔ اس تناظر میں مجھ پر دوہری ذمے داری عائد ہوتی تھی۔ مجھے نہ صرف یہ کہ زاہدہ کو بے قصور ثابت کرتے ہوئے اس مصیبت میں سے بڑی خوب صورتی سے نکالنا تھا۔ بلکہ کچھ ایسا بندوبست بھی کرنا تھا کہ لیاقت حسین کے اصل قاتل کی نشاندہی بھی ہو جائے۔ میرے لئے یہ ایک طرح کی کڑی آزمائش تھی۔

جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وکیلِ استغاثہ گواہ والے کٹہرے کے پاس آ گیا اور جرح کے سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے اس نے خدیجہ سے سوال کیا۔ ''خدیجہ بیگم! کیا یہ درست ہے کہ مقتول تمہارا دوسرا شوہر تھا؟''

''جی ہاں....... یہ درست ہے۔'' خدیجہ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

وکیلِ استغاثہ نے پوچھا۔ ''آپ کو اس حقیقت سے انکار تو نہیں کہ ملزمہ اپنے سوتیلے باپ کو سخت ناپسند کرتی تھی....... بلکہ اگر یہ کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی۔

''یہ عین فطری بات ہے۔'' خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''شدید نفرت'' کے الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ زاہدہ کو یہ شادی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ اپنے سوتیلے باپ سے خاصی اُکھڑی اُکھڑی رہتی تھی۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا، یہ زاہدہ کا فطری ردِ عمل تھا۔ وہ اپنے باپ مظفر علی سے بہت محبت کرتی تھی۔

وکیلِ استغاثہ خاصے جارحانہ انداز میں مستفسر ہوا۔ ''کیا یہ غلط ہے کہ ملزمہ نے اس شادی کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ لیکن اس کی مخالفت اور ناپسندیدگی کے باوجود بھی آپ نے مقتول سے شادی کر لی؟''

''یہ غلط نہیں ہے۔'' خدیجہ نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

وکیلِ استغاثہ کی لفظی جارحیت کچھ اور آگے بڑھی۔ ''کیا آپ اس بات سے انکار کر سکتی ہیں کہ اس شادی کے سلسلے میں آپ نے بیٹی کے جذبات و احساسات کی پرواہ اس لئے نہیں کی کہ مقتول نے اپنی چالبازیوں کا جال پھیلا کر آپ کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔ وہ ایک خاص پلاننگ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے خود کو آپ کا کزن ثابت کر کے پہلے آپ کے دل میں جگہ بنائی، پھر گھر میں ڈیرہ ڈال لیا۔ جب آپ پوری طرح اس کے شیشے میں اتر گئیں تو آپ کو اس شادی کے لئے مجبور ہونا پڑا؟''

''میں مرنے والے کی برائی کر کے خود کو گناہ گار نہیں بنانا چاہتی۔'' خدیجہ نے سادگی سے جواب دیا۔

اس جواب سے وکیلِ استغاثہ کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ ترش لہجے میں بولا۔ ''خدیجہ بیگم! مجھے آپ کے گناہ و ثواب سے کوئی مطلب نہیں....... آپ میرے سوال کا جواب ''ہاں'' یا ''نہ'' میں دیں۔''

یہ تمام وہ حقائق تھے جو میں نے دانستہ آپ سے چھپا لئے تھے اور وعدہ کیا تھا کہ عدالتی

کارروائی کے دوران مناسب موقع پر انہیں آپ کے سامنے لاؤں گا۔ اور یہ انتہائی موزوں موقع تھا۔ وکیلِ استغاثہ مقتول کی جن ''خوبیوں'' کا ذکر کر رہا تھا وہ بالکل درشت تھیں۔ مقتول ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت ہی اس گھر میں گھسا تھا۔ بہرحال، وکیلِ استغاثہ نے جو زاویہ پکڑ رکھا تھا، وہ میری مؤکل کے خلاف جاتا تھا۔ وہ ان حقائق کے افشاء سے یہ بات ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ملزمہ انہی ''اوصاف'' کی بناء پر مقتول سے شدید نفرت کرتی تھی اور اسی نفرت میں بالآخر اس نے اپنے سوتیلے باپ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

خدیجہ بیگم نے وکیلِ استغاثہ کے دوٹوک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''صورتِ حال واقعی کچھ ایسی ہی تھی۔ میں معزز عدالت کے روبرو یہ تسلیم کرتی ہوں کہ مرحوم لیاقت حسین کی نیت شروع ہی سے اچھی نہیں تھی لیکن جب تک اس کے ارادے کھل کر سامنے آتے، بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں اس مسئلے کا کوئی مناسب حل نکالنے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ لیاقت حسین قتل ہو گیا۔''

''آپ نے مقتول کی نیت کے حوالے سے بہت ہی محتاط الفاظ کا سہارا لیا ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے خدیجہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔ ''یور آنر! استغاثہ کی بنیاد یہ ہے کہ ملزمہ نے شدید نفرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے سوتیلے باپ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ اپنے سوتیلے باپ سے اس قدر نفرت کیوں کرتی تھی، یہ معزز عدالت کے علم میں آنا بہت ضروری ہے۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں نہایت ہی مختصر الفاظ میں ملزمہ کی نفرت اور مقتول کی پلاننگ کا احوال بیان کرتا ہوں تاکہ ملزمہ کی ذہنی کیفیت اور جذبۂ انتقام کو سمجھنے میں آسانی رہے۔''

''اجازت ہے۔'' وکیلِ استغاثہ کے خاموش ہوتے ہی جج نے بارعب آواز میں کہا۔

وکیلِ استغاثہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی دانست میں کوئی عظیم کارنامہ انجام دینے کی کوشش کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ''جنابِ عالی! ملزمہ کے باپ مظفر علی کی موت کے بعد یہ ماں بیٹی بالکل اکیلی رہ گئی تھیں۔ چالاک اور مکار قسم کے افراد ایسے بے سہارا لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ مقتول بھی ایک ایسا ہی عیار اور چالباز شخص تھا۔ وہ خدیجہ بیگم کے گھر پہنچا۔ اپنی لچھے دار باتوں سے اُسے اُلجھایا اور لمبی چوڑی ضرب تقسیم کے بعد اس نے خود کو خدیجہ کا کزن ثابت کر دیا۔ پھر چند روز بعد ہی وہ ان کے گھر میں مقیم تھا۔ اس نے اپنے بارے میں ایسی دردناک کہانی سنائی کہ خدیجہ فوراً اس سے متاثر ہو گئی اس نے بتایا کہ پہلے وہ بزنس کرتا تھا، اب سائٹ کی کسی فیکٹری میں ملازم ہے۔ خدیجہ نے اس کی کہانی کا

یقین کرتے ہوئے مقتول کو ایک انتہائی ہمدرد، مخلص اور نیک انسان تسلیم کر لیا۔ اسی دوران ملزمہ کی شدید مخالفت کے باوجود بھی گواہ نے مقتول سے شادی کر لی۔''

وہ لحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''شادی کے بعد مقتول نے اپنے منصوبے پر عمل کا آغاز کر دیا۔ اُس نے گواہ خدیجہ کو یہ راہ سجھائی کہ اگر اس گھر کو بینک میں رہن رکھ کر ایک موٹی رقم حاصل کر لی جائے تو زندگی کو خوشگوار بنایا جا سکتا ہے۔ اس رقم سے وہ اپنے ڈوبے ہوئے بزنس کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔ گواہ کو یہ بات معلوم تھی کہ زندگی میں آسانیاں اور آسائشیں لانے کے لئے نوکری کافی نہیں ہوتی۔ اس بات پر اس کی پہلے شوہر سے ہمیشہ لڑائی ہوتی رہتی تھی۔ مظفر علی مرحوم کبھی بزنس کی طرف نہیں آیا تھا۔ چنانچہ مقتول لیاقت حسین نے گواہ خدیجہ کے سامنے جب بزنس کا آئیڈیا رکھا تو وہ فوراً مان گئی۔ اس ''ماننے'' کے نتیجے میں ایک طویل عرصے کے لئے وہ گھر بینک کی ملکیت بن گیا۔ بینک نے اس رہن کے عوض جو رقم دی، وہ خدیجہ نے مقتول کے ہاتھ پر رکھی اور بڑی شدت سے سہانے دنوں کا انتظار کرنے لگی۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟''

آخری سوالیہ جملہ اس نے وٹنس باکس میں کھڑی خدیجہ بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ اُس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، وکیل صاحب!''

وکیلِ استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے اپنی وضاحت کو آگے بڑھایا۔ ''جنابِ عالی! مقتول نے بڑی ہوشیاری سے ایک بڑی رقم ہتھیا لی۔ خدیجہ انتظار کرنے لگی کہ چند دنوں میں مقتول کا بزنس دوڑنے لگے گا اور ان کے گھر میں ہر شے کی ریل پیل ہو جائے گی۔ اس موقع پر بھی ملزمہ نے سخت مخالفت کی تھی کہ خدیجہ اتنا بڑا رسک نہ لے۔ مگر اس کی ماں نے ایک نہیں مانی تھی۔ مقتول بڑی پلاننگ سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اول، اس نے خدیجہ سے شادی کر کے گھر کا آرام وسکون اور مزہ حاصل کر لیا تھا۔ دوم، وہ بزنس کے بہانے ایک بڑی رقم اپنے قبضے میں کر چکا تھا۔ اس نے اپنے طے شدہ مقاصد پورے کر لئے تھے۔ منصوبہ بندی کے مطابق اب اسے بن بتائے چپ چپاتے کہیں غائب ہو جانا چاہئے تھا۔ لیکن ملزمہ کی خاطر وہ اپنے منصوبے کی توسیع میں لگ گیا۔ اس لڑکی نے قدم قدم پر مقتول کی مخالفت کی تھی۔ اس نے سوچا، جاتے جاتے اس پر ہاتھ صاف کر جائے مگر........ قبل اس کے کہ وہ ایک قدم آگے بڑھتا، ملزمہ نے اس کا کام تمام کر دیا۔''

''یہ غلط ہے........ میری بچی قتل نہیں کر سکتی۔'' خدیجہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''لیاقت

حسین کا فراڈ اور بدنیتی اپنی جگہ، میں مانتی ہوں، اس نے بڑی منصوبہ بندی سے ہمیں لوٹ لیا تھا۔ میں یہ بھی تسلیم کرتی ہوں کہ لیاقت کے انہی کرتوتوں کے باعث زاہدہ اس سے نفرت کرتی تھی لیکن اس نے لیاقت کی جان نہیں لی۔ وہ........''

خدیجہ کی بات پوری ہونے سے قبل ہی وکیلِ استغاثہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ درست ہے کہ مقتول نے ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ سے شادی کی تھی؟''

''ہاں........ یہ درست ہے۔'' خدیجہ نے جواب دیا۔

''اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ اس نے نہایت چالاکی سے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا؟''

''جی ہاں........ مقتول کی چالبازی کو میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔''

''گویا آپ مقتول کی بدنیتی کو تسلیم کرتی ہیں۔''

خدیجہ نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیلِ استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو موقوف کرتے ہوئے تیز لہجے میں کہا۔ ''مقتول کی بدنیتی جب گھر اور آپ سے آگے بڑھ کر ملزمہ زاہدہ کو چھونے لگی تو پہلی مرتبہ آپ کو مقتول سے خطرہ محسوس ہوا تھا۔ آپ نے اس روز مقتول سے شدید جھگڑا بھی کیا تھا جس میں مقتول نے اپنی صفائی بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ملزمہ کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہے........ اور یہ کہ آپ کو اس سلسلے میں غلط فہمی ہوئی ہے........ ملزمہ نے مقتول سے اپنی شدید نفرت کے نتیجے میں اس پر الزام تراشی کی ہے........ وغیرہ۔''

''ہاں........ یہ واقعہ پیش آیا تھا۔'' خدیجہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن آپ نے مقتول کی وضاحت کا یقین نہیں کیا تھا۔ زاہدہ کے حوالے سے مقتول کی بدنیتی آپ پر آشکار ہو چکی تھی۔ ملزمہ نے تنہائی میسر آتے ہی دھمکی دینے والے انداز میں آپ سے کہا تھا کہ آپ پہلی فرصت میں اس بے ہودہ شخص (مقتول لیاقت حسین) کو گھر سے نکال دیں ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

''ہاں........ زاہدہ نے کچھ اسی نوعیت کا احتجاج کیا تھا۔'' خدیجہ کمزور سی آواز میں بولی۔

وکیلِ استغاثہ نے آخری داؤ آزمانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ملزمہ زاہدہ نے اپنے الفاظ ''ورنہ اچھا نہیں ہوگا!'' کی وضاحت بھی تو کی تھی؟''

''جی ہاں!'' خدیجہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''اس نے کہا تھا........ اگر میں نے مقتول لیاقت حسین کو گھر سے نہ نکالا تو وہ گھر چھوڑ کر کہیں بھی چلی جائے گی۔ یا پھر اپنے ہاتھوں سے اس خبیث شخص کو موت کے گھاٹ اتار دے گی۔''

''اور اس کے چند روز بعد ہی آپ کے دوسرے شوہر لیاقت حسین کو قتل کر دیا گیا؟''

''ج ج........ جی ہاں........'' خدیجہ نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی........!'' وکیلِ استغاثہ نے جرح ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

میں نے اپنی باری پر جج سے اجازت حاصل کی اور اس کیس کی سب سے اہم جرح کے لئے خدیجہ والے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''خدیجہ بیگم! وقوعہ کے روز آپ سہ پہر پانچ بجے سے لے کر رات ساڑھے آٹھ بجے تک اپنے گھر میں موجود نہیں تھیں؟........ کیا آپ معزز عدالت کو بتائیں گی کہ یہ ساڑھے تین گھنٹے آپ نے کہاں گزارے؟''

''میں اپنے پڑوس میں........ نورانی صاحب کے گھر میں تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق آپ کے دوسرے شوہر لیاقت حسین کو وقوعہ کے روز رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان قتل کیا گیا ہے یعنی آپ کی غیر موجودگی میں اس کی موت واقع ہوئی۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ آپ ساڑھے تین گھنٹے تک اپنے پڑوس میں کیا کرتی رہی تھیں؟''

میں نے بڑی محنت سے حاصل کردہ معلومات کو نہایت ہی احتیاط سے استعمال کرنے کا آغاز کر دیا۔ اس کیس کے سلسلے میں اب تک جو جرح ہوئی تھی اس کی روشنی میں استغاثہ اور ڈیفنس کا پلّہ برابر نظر آتا تھا۔ اسی پیشی پر مجھے اس برابری کو ختم کرنا تھا۔ ڈیفنس کے پلّے میں دلائل، حقائق، ثبوت اور انکشافات کی صورت میں اتنا کچھ ڈالنا تھا کہ وہ کسی اندھے کو بھی واضح طور پر جھکا ہوا دکھائی دے۔ اور میں یہی کوشش کر رہا تھا۔

خدیجہ نے میرے سوال کے جواب میں بڑی رسان سے بتایا۔

''اُس روز نورانی صاحب کے گھر میں ان کی بیوی نے محفلِ میلاد رکھی تھی۔ پڑھائی کا وقت عصر اور مغرب کے درمیان کا تھا۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد کھانا تھا۔ میں اُسی محفل میں گئی ہوئی تھی۔''

''اس تفصیل کو معزز عدالت تک پہنچانے کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''خدیجہ صاحبہ! تھوڑی دیر پہلے وکیلِ استغاثہ نے مقتول کے حوالے سے آپ پر بڑی

سخت جرح کی ہے اور از خود بھی مقتول کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کا مظاہرہ فرمایا ہے۔ میں اس موضوع کو بالکل نہیں چھیڑوں گا۔ آپ کے شوہر لیاقت حسین نے آپ کے ساتھ کون کون سا دھوکا کیا، زیرِ ساعت کیس سے براہِ راست اس کا کوئی ناتا نہیں نکلتا۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ جب وقوعہ کے روز سہ پہر پانچ بجے آپ نورانی صاحب کے گھر گئیں تو اس وقت آپ کے گھر میں کون کون تھا؟''

''صرف زاہدہ تھی۔'' خدیجہ نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے اس وقت تک مقتول گھر نہیں پہنچا تھا؟''

''جی ہاں.......اس کا یہی مطلب ہے۔''

''وہ عموماً کتنے بجے گھر آجایا کرتا تھا؟''

''کم وبیش رات آٹھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق آپ کے شوہر کی موت رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے وقوعہ کے روز وہ آٹھ بجے سے پہلے ہی گھر آ گیا تھا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور جواب دیا۔ ''اس روز وہ ساڑھے چھ بجے گھر آ گیا تھا۔''

''ساڑھے چھ بجے!'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تیز آواز میں دوہرایا، پھر پوچھا۔ ''خدیجہ بیگم! وقوعہ کے روز آپ تو سہ پہر پانچ بجے سے رات ساڑھے آٹھ بجے تک نورانی صاحب کے گھر میں تھیں۔ پھر آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ مقتول اس روز ساڑھے چھ بجے گھر آ گیا تھا؟''

میں اس کیس میں وکیلِ صفائی کا کردار ادا کر رہا تھا لیکن گواہ خدیجہ بیگم سے میں جس نکیلے انداز میں سوالات کر رہا تھا اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا، میں استغاثہ کا حمایتی ہوں۔ شاید وکیلِ استغاثہ بھی یہی سمجھ رہا تھا تبھی بڑی شرافت سے خاموش کھڑا عدالتی کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میری طرف سے کسی عظیم انکشاف کی توقع رکھتا ہو.......اور میری یہ کوشش تھی کہ اس کی توقع کو ٹوٹنے نہ دوں۔

خدیجہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد مجھے ایک ضروری کام سے گھر آنا پڑ گیا تھا۔ کھانا شروع ہونے والا تھا اور نورانی صاحب کے گھر میں برتنوں کی کمی پیش آ رہی تھی۔ میں نے سوچا اپنے گھر سے پلیٹیں اور گلاس پکڑ لوں۔'' وہ لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

”میں گھر آئی تو دیکھا، لیاقت بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا وہ آج جلدی کیسے گھر آ گیا؟ اس نے بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں، سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور یہ کہ وہ سونا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے سر درد کی گولی کھلائی اور برتن وغیرہ لے کر واپس نورانی صاحب کے گھر چلی گئی۔“

”آپ برتن لینے کے لئے کتنے بجے اپنے گھر آئی تھیں؟“

”اُس وقت سات بجنے والے تھے۔“

”یہ بات مقتول نے آپ کو بتائی تھی کہ وہ ساڑھے چھ بجے گھر آیا ہے؟“

”جی ہاں.......لیاقت کی زبانی مجھے یہ بات پتہ چلی تھی۔“

”جب سات بجے آپ برتن لینے اپنے گھر میں آئیں تو کیا آپ کی بیٹی زاہدہ گھر میں موجود تھی؟“

”نہیں!“ اس نے قطعیت سے جواب دیا۔

”لیکن آپ میلاد میں جاتے وقت اسے گھر میں چھوڑ کر گئی تھیں۔“

”جی ہاں!“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”کیا آپ نے مقتول سے ملزمہ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا؟“

اس نے جواب دیا۔ ”میں نے لیاقت سے پوچھا تھا زاہدہ کہاں ہے؟ اس نے بتایا تھا کہ اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ کہیں چلی گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہاں چلی گئی تھی؟ اس نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے سوچا ادھر ہی کہیں آس پڑوس میں اپنی کسی دوست کے پاس چلی گئی ہو گی، خود ہی واپس آ جائے گی۔ یہ سوچتے ہوئے میں برتن لے کر نورانی صاحب کے گھر چلی گئی اور.......بعد میں میرا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔“

”کون سا اندازہ؟“ میں نے با آواز بلند دریافت کیا۔

”یہی کہ وہ اپنی کسی دوست سے ملنے چلی گئی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”کون سی دوست؟“ میں نے فوراً اگلا سوال کر دیا۔

”سعیدہ۔“ خدیجہ نے حتمی لہجے میں جواب دیا اور حاضرینِ عدالت کی طرف اُنگلی اُٹھاتے ہوئے بولی۔ ”وہ، جو اُدھر کونے میں اپنے باپ جہانگیر کے ساتھ بیٹھی ہے۔“

اس انکشاف کے بعد سب کی نظریں سعیدہ نامی اس لڑکی کی جانب اُٹھ گئیں جس کا ذکر خدیجہ نے کیا تھا۔ یہ دراصل میری چلی ہوئی ایک شاطرانہ چال تھی۔ میں اس اسٹیپ کے ذریعے استغاثہ کی عمارت کو زمین بوس کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری درخواست پر جہانگیر اس

روز اپنی بیٹی سعیدہ کے ساتھ عدالت کے کمرے میں موجود تھا۔ سعیدہ ایک طرف سے اس کیس میں صفائی کے گواہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب پھیرا اور نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں درخواست کی۔ ”یور آنر! یہ ایک حسین اتفاق ہے کہ سعیدہ اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہے۔“ اتنا کہہ کر میں نے غصہ دلانے والے انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے بڑی تکلیف میں مبتلا نظر آیا۔ میرے ”حسین اتفاق“ جیسے الفاظ نے اس کے استغاثہ کی ناک پر ایک دھواں دھار پنچ رسید کر دیا تھا۔ وہ بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ میں نے خاص اہتمام کے تحت سعیدہ کو عدالت میں حاضر کر رکھا ہے۔ بہر حال، میں وکیلِ مخالف کو نظر انداز کرتے ہوئے جج کی طرف متوجہ ہو گیا اور بدستور ملتجیانہ انداز میں کہا۔

”یور آنر! خدیجہ کے بیان کی روشنی میں سعیدہ بڑی اہمیت کی حامل نظر آتی ہے۔ میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ مجھے سعیدہ سے دو چار سوال کرنے کی اجازت دی جائے۔“

جج نے اثبات میں گردن ہلائی، پھر اس کے حکم پر سعیدہ نامی وہ لڑکی وٹنس باکس میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ خدیجہ کو تھوڑی دیر کے لئے کٹہرے سے باہر نکال دیا گیا۔ سعیدہ سے کوئی سوال پوچھنے سے پہلے میں نے ایک مرتبہ پھر جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”جنابِ عالی!........میری درخواست ہے کہ اس کیس کے تفتیشی افسر کو چند منٹ کے لئے عدالت سے باہر بھیج دیا جائے........میں آئی او کی غیر موجودگی میں سعیدہ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

آئی او شفیع شاہ نے اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جج نے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔ ”بیگ صاحب! کیا اس کی کوئی خاص اہمیت ہے؟“

”خاص الخاص جنابِ عالی!“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ اہمیت ابھی معزز عدالت کے سامنے واضح بھی ہو جائے گی۔“

جج کے حکم پر انکوائری آفیسر شفیع شاہ کو عدالت سے باہر جانا پڑا۔

میں نے سعیدہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا یہ درست ہے کہ آپ ملزمہ زاہدہ کی گہری دوست ہیں۔ آپ کا گھر پچھلی گلی (ملزمہ کی) میں واقع ہے۔ آپ لوگ آپس میں ملنے کے لئے ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہتے ہو؟“

یہ کئی مختصر سوالات پر مشتمل ایک طویل سوال تھا لیکن اس میں آسانی کا پہلو یہ تھا کہ تمام

سوالات ایک خاص زاویے اور سیریز میں تھے لہٰذا ان کا جواب ایک ''ہاں'' یا ایک ''نہیں'' میں دیا جا سکتا تھا۔ سعیدہ کو قطعاً کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

''ہاں، یہ درست ہے۔''

''کیا وقوعہ کے روز ملزمہ آپ کے گھر آئی تھی؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

''وہ کتنے بجے آپ کے گھر پہنچی تھی؟''

''یہی کوئی ساڑھے چھ بجے...... یا پھر چھ پینتیس پر۔''

''اور اس کی واپسی کب ہوئی تھی؟''

''ساڑھے آٹھ بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پانچ چھ منٹ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔''

''کیا وہ خود ہی واپس چلی گئی تھی یا کوئی اسے بلانے آیا تھا؟''

''اس کی امی ڈھونڈتے ہوئے ہمارے گھر آئی تھیں۔'' سعیدہ نے جواب دیا۔ ''آنٹی خدیجہ خاصی پریشان تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ زاہدہ کے سوتیلے باپ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ پھر وہ دونوں چلی گئی تھیں۔''

''اوکے۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا، پھر سعیدہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ اچھی طرح سوچ کر بتائیں...... کیونکہ میں اب آپ سے جو سوال کرنے والا ہوں اس کے جواب کی بڑی اہمیت ہے۔ آپ کا جواب اس کیس کا پانسہ پلٹ سکتا ہے......''

میں نے دانستہ لحہ بھر کو توقف کیا اور حاضرینِ عدالت کے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ سب سے زیادہ کھلبلی اور سنسنی مجھے وکیلِ استغاثہ کے چہرے پر نظر آئی۔ وہ بے چینی اور بے قراری سے بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ میں دوبارہ سعیدہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے میرے سوال کی منتظر تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اس سے پوچھا۔

''ملزمہ زاہدہ وقوعہ کے روز لگ بھگ ساڑھے چھ بجے آپ کے گھر آئی اور ساڑھے آٹھ بجے اس کی واپسی ہوئی۔ سعیدہ بی بی! آپ کو سوچ سمجھ کر یہ بتانا ہے کہ کیا ان دو گھنٹوں کے دوران ملزمہ ایک لمحے کے لئے بھی آپ کے گھر سے باہر نکلی تھی؟''

''نہیں...... بالکل نہیں۔'' اس نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا آپ کو یاد ہے اُس روز اس کیس کی ملزمہ اور آپ کی دوست زاہدہ نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟''

''کاٹن کا سفید سوٹ۔'' سعیدہ نے بتایا۔ ''وہ بالکل کسی کبوتری کی طرح دکھائی دیتی

تھی...... بلکہ میں نے اسے یہ کہہ کر چھیڑا بھی تھا...... چٹی کبوتری! کہاں اُڑنے کا ارادہ ہے؟''

میں نے سعیدہ پر جرح ختم کر دی اور جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! اب میں ملزمہ کی ماں خدیجہ سے آخری ایک دو سوالات کرنا چاہوں گا۔''

جج نے اجازت دینے سے پہلے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آئی او کو اندر بلا لیا جائے؟''

''خدیجہ کی جرح مکمل ہونے کے بعد۔'' میں نے درخواستی لہجے میں کہا۔ ''سعیدہ کا کام ختم ہو گیا، خدیجہ بھی فارغ ہو جائے تو پھر آئی او صاحب کی باری آئے گی۔ جیسا کہ معزز عدالت اس بات سے باخبر ہو چکی ہے کہ انکوائری آفیسر سے پوچھنے کے لئے سوالات کا ایک انبار کھڑا ہو چکا ہے۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلائی۔ پھر اس کے حکم پر سعیدہ کی جگہ خدیجہ وٹنس باکس میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے ملزمہ کی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا میں آپ کی یادداشت کا امتحان لے سکتا ہوں؟''

''جی، لے سکتے ہیں۔'' وہ بڑی سادگی سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز نورانی صاحب کے گھر میں میلاد کے سلسلے میں جو کھانا دیا گیا تھا، اس میں کیا کیا شامل تھا؟''

وہ ترت بولی۔ ''بچھیا کا قورمہ تھا، تافتان تھی...... اور میٹھے میں کھیر تھی۔''

''آپ محفل میلاد میں شرکت کے لئے کون سا لباس پہن کر گئی تھیں؟''

''میں نے جامنی شلوار پر پھول دار قمیض پہن رکھی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور دوپٹہ بھی جامنی رنگ ہی کا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''جب آپ نورانی صاحب کے گھر جا رہی تھیں تو زاہدہ کو کس لباس میں گھر میں چھوڑ کر گئی تھیں؟''

اُس نے ایک مرتبہ پھر سعیدہ کی جانب اشارہ کیا اور بولی۔ ''زاہدہ کے لباس کے بارے میں سعیدہ نے آپ کو بتایا تو ہے۔''

''یعنی آپ سعیدہ کے بیان کی تصدیق کرتی ہیں؟''

''بالکل!'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''زاہدہ کو سفید لباس بہت پسند ہے۔ اور وقوعہ کے روز بھی اس نے کاٹن کا سفید جوڑا ہی پہن رکھا تھا۔''

''خدیجہ صاحبہ! آپ سے میرا آخری سوال ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر گہری سنجیدگی سے پوچھ لیا۔ ''وقوعہ کے روز جب آپ نورانی صاحب کے گھر سے واپس

آئیں تو آپ کے بیان کے مطابق آپ نے مقتول کو بستر پر مُردہ حالت میں پڑے ہوئے دیکھا۔ کسی سفاک شخص نے تیز دھار آلے کی مدد سے اس کی گردن کاٹ ڈالی تھی۔ بستر کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے جان دینے سے پہلے مقتول بے انداز تڑپا اور پھڑکا ہوگا۔ بستر پر جابجا خون کے چھینٹے بھی پڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔'' میں لمحہ بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ گھر سے نکلیں اور زاہدہ کو تلاش کرتے ہوئے سعیدہ کے گھر پہنچ گئیں۔ سعیدہ آپ کو وہاں مل گئی۔ آپ نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ کسی نے اس کے سوتیلے باپ کو قتل کر دیا ہے۔ پھر آپ اسے اپنے ساتھ لے کر گھر آ گئیں۔ ذرا سوچ کر بتائیں، جب آپ نے سعیدہ کے گھر میں ملزمہ کو دیکھا تو کیا آپ کو اس کے سفید لباس پر خون کا کوئی چھینٹا یا دھبا نظر آیا تھا؟''

اُس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی اور ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''بالکل نہیں۔ وہ جیسا صاف ستھرا لباس پہن کر گئی تھی، ویسے ہی لباس میں واپس آئی تھی۔''

''دیٹس آل یور آنر!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور کندھے اچکا دیئے۔

اس کے بعد آئی او شفیع شاہ کو اندر بلا لیا گیا۔ میں چونکہ جج سے کہہ چکا تھا کہ آئی او سے چند سوالات کروں گا لہٰذا شفیع شاہ کو وٹنس باکس میں کھڑے ہونے کو کہا گیا۔ حکم چونکہ جج کی طرف سے آیا تھا لہٰذا وہ کسی پس و پیش کے بغیر جا کر گواہوں والے کٹہرے میں کھڑا ہو گیا۔ میں جج کا اشارہ پا کر فوراً آئی او کے پاس پہنچ گیا۔ وہ قدرے اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اب اس سے کون سا سوال کرنے والا ہوں۔

میں نے سوال کیا۔ ''آئی او صاحب! آپ کے غیاب میں سعیدہ بنتِ جہانگیر اور خدیجہ بیوہ لیاقت حسین کی یادداشت کا امتحان لیا گیا ہے اور وہ دونوں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہوئی ہیں۔ میں آپ کو بھی اس کڑی آزمائش میں سرخرو ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو اس امتحان کا آغاز کیا جائے؟''

اس نے متاملانہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کو دیکھا اور جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو جو پوچھنا ہے، پوچھیں۔ میں یہاں موجود ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز جب آپ جائے واردات پر پہنچے تو آپ نے مقتول کو اپنے بستر پر مُردہ حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور تڑپنے پھڑکنے کے باعث بستر کی چادر کئی جگہ سے خون آلود ہو چکی تھی۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' وہ محتاط لہجے میں بولا۔

میں نے استفسار کیا۔ ''آپ کے بیان کے مطابق جب مقتول کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تو وہ اپنے بستر پر چت سویا ہوا تھا۔ گردن کٹنے کے سبب اس کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور اس کی پوزیشن پہلے والی نہ رہی۔ جب آپ نے اس کی لاش کو دیکھا تو وہ کم و بیش کروٹ کے بل بستر کے کنارے پر پہنچا ہوا تھا۔ شمالی دیوار والے کنارے پر۔ ایم آئی رائٹ؟''

''جی...... میں نے ایسا ہی دیکھا تھا۔'' آئی او نے جواب دیا۔

میں نے اچانک ہی سوال کیا۔ ''جب آپ نے ملزمہ زاہدہ کو اپنے سوتیلے باپ کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا تو اس نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟''

''سفید لباس!'' بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔

''بے داغ سفید لباس؟''

''میں نے اس کے لباس کو گھما پھرا کر نہیں دیکھا تھا۔'' وہ بے زاری سے بولا۔

''میرا مطلب ہے، آپ کو اس کا لباس خون آلود تو دکھائی نہیں دیا؟''

''نن...... نہیں!'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جنابِ عالی!'' میں نے فاتحانہ انداز میں وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا اور جرح موقوف کر دی۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے ایک ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

***

گواہوں کے بیانات کا سلسلہ گزشتہ پیشی پر مکمل ہو چکا تھا لہٰذا آئندہ پیشی پر دلائل کی باری تھی۔ جج اپنی مخصوص نشست پر براجمان ہوا تو عدالت کی کارروائی کا آغاز کیا گیا۔ پہلے وکیلِ استغاثہ نے ملزمہ زاہدہ کو سزا دلوانے کے لئے دلائل دیئے۔ اس کے دلائل میں کوئی نئی بات یا نکتہ دیکھنے یا سننے کو نہیں ملا۔ وہ اپنے حلق اور عقل کا استعمال کر کے فارغ ہوا تو میری باری آئی۔

میں نے گزشتہ پیشی پر خدیجہ، سعیدہ اور شفیع شاہ سے جس انداز کی جرح کی تھی اس نے کیس کی صورتِ حال کو عدالت پر واضح کر دیا تھا۔ جج اور حاضرینِ عدالت اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ حقیقتِ حال کیا ہے۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ملزمہ زاہدہ کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا۔

''جنابِ عالی! اب تک کی عدالتی کارروائی سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی

ہے کہ میری مؤکل اوراس کیس کی ملزمہ مسماۃ زاہدہ بے گناہ اور بے قصور ہے۔اسے کسی گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں اُلجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پولیس کی تن آسانی اور زبردستی کسی ''تعریف'' کی محتاج نہیں۔مقتول لیاقت حسین کے اصل قاتل تک رسائی حاصل کرنے کی بہ نسبت یہ فارمولا زیادہ سہل نظر آیا کہ وہ مقتول کی سوتیلی بیٹی کوقربانی کی بکری بناڈالیں۔ اس غریب کا صرف اتنا قصور ہے کہ یہ اپنے سوتیلے باپ سے شدید نفرت کرتی تھی.......اور اس نفرت کے لئے اس کے پاس ٹھوس وجوہ بھی تھیں جن کا تفصیلی ذکر گاہے بہ گاہے عدالتی کارروائی کے دوران ہوتا رہا ہے۔ میں یہاں پر اس قصے کو دوبارہ چھیڑ کر معزز عدالت کا وقت ضائع نہیں کروں گا.......اس سلسلے میں پہلے ہی خاصا بدنام ہوں۔''

آخری جملہ میں نے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا۔ وہ میری اس گہری اور نظر نہ آنے والی چوٹ پر بل کھا کر رہ گیا۔ اس کی حالت سے محظوظ ہونے کے لئے میرے پاس وقت نہیں تھا لہٰذا میں دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''جنابِ عالی! محبت اور نفرت دونوں فطری جذبے ہیں جو انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ قانون کی کتابوں میں ایسا کوئی باب نہیں جو محبت اور نفرت کے ان جذبات کو جرم کے زمرے میں بند کرتا ہو.......اور کوئی ایسی دفعہ بھی وضع نہیں کی گئی کہ جو محبت اور نفرت کرنے والوں پر عائد کی جاسکتی ہو۔ بہرحال، میں مانتا ہوں کہ ملزمہ اپنے سوتیلے باپ سے نفرت کرتی تھی لیکن یہ کوئی جرم نہیں کہ اسے قتل جیسے خطرناک کیس میں ملوث کر دیا جائے۔ میں معزز عدالت کے علم میں اس کیس کے وہ اہم زاویے لا رہا ہوں جو میری مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔''

میں نے لحہ بھر کو توقف کر کے حاضرینِ عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نمبر ایک، گزشتہ ایک پیشی پر اس کیس کے آئی او صاحب نے جائے وقوعہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس کے مطابق مقتول جس بیڈ پر سو رہا تھا اس کی ایک سائیڈ اور سرہانہ دو دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے یعنی سائیڈ شمالی دیوار کے ساتھ اور سرہانہ مغربی دیوار کے ساتھ۔ یہ ایک ایسی پوزیشن ہے کہ بستر پر چڑھنے اور اُترنے کے لئے یا تو پائنتی کو استعمال کیا جاسکتا ہے اور یا پھر بیڈ کی جنوبی سائیڈ کو۔ آئی او کو یقین ہے کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل مقتول شمالی دیوار والی سمت چت لیٹا ہوا تھا۔ یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ میری مؤکل لیفٹ ہینڈر ہے۔ ایک لیفٹ ہینڈر کے لئے پائنتی پر کھڑے ہو کر یا جنوبی سائیڈ پر رہتے ہوئے مقتول کی گردن پر چھری چلانا تکنیکی اعتبار سے ممکن نظر نہیں آتا۔ اِلاّ یہ کہ

قاتل پہلے بستر پر چڑھے، پھر قتل کرنے کی کوشش کرے۔ بستر پر چڑھنے کی صورت میں مقتول جاگ سکتا تھا اور قاتل ایسا کوئی رِسک لینے کی حماقت نہیں کر سکتا۔ نمبر دو......."

میں نے ایک سانس کا توقف کیا، پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"مقتول کے بستر کی حالت اس بات کی گواہ ہے کہ موت کے منہ میں جانے سے قبل ہی بڑی اذیت سے گزرا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے جاری اُبلتے ہوئے خون نے بستر کو متعدد مقامات سے آلودہ کر دیا تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ملزمہ اپنے لیفٹ ہینڈر ہونے کی "خامی" کو دور کرنے کے لئے بستر کے اوپر چڑھ گئی تھی تو پھر ایک نا قابلِ جواب سوال اُبھر کر یہ سامنے آتا ہے کہ ملزمہ کے سفید لباس پر خون کا ایک معمولی سا دھبہ تک کیوں نہیں آیا؟....... ملزمہ کا بے داغ لباس ثابت شدہ ہے۔ نمبر تین.......اور سب سے اہم نکتہ!" میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ہمیں بتاتی ہے کہ مقتول لیاقت حسین کی موت رات سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ دوسری جانب ایسی ہی ایک نا قابلِ تردید مسلمہ حقیقت یہ بھی موجود ہے کہ وقوعہ کے روز شام ساڑھے چھ بجے سے لے کر ساڑھے آٹھ بجے تک ملزمہ اپنی دوست سعیدہ کے گھر میں تھی اور اس دوران وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔ سعیدہ اس بات کی تصدیق کے لئے معزز عدالت کے روبرو بیان دے چکی ہے۔ جنابِ عالی! جب میری مؤکل مقتول کے متوقع وقتِ موت کے دوران جائے وقوعہ سے کئی گز کے فاصلے پر موجود تھی تو پھر وہ قاتل کیسے ہو سکتی ہے؟"

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز خاصی بلند ہو گئی تھی۔ جیسے ہی میری بات مکمل ہوئی، عدالت کے کمرے میں وکیلِ استغاثہ کی چیخ سے مشابہہ آواز اُبھری۔

"اگر ملزمہ قاتل نہیں ہے تو پھر لیاقت حسین کو کس نے قتل کیا ہے؟"

میں نہیں جانتا....... بلکہ شاید کوئی بھی نہیں جانتا کہ وکیلِ استغاثہ نے کس کو مخاطب کر کے یہ بلند آہنگ استفسار کیا تھا۔ اس کی آواز میں بڑی بے کیفی اور حیرت پائی جاتی تھی۔ اُس کے سوال کے جواب میں، میں نے ٹھوس اور چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"قاتل تک رسائی حاصل کرنا استغاثہ کی ذمہ داری ہے۔ میں صرف اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے متعین ہوں۔ اور اللہ کا شکر ہے، میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے۔"

جج نے فیصلے کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخواست کر دی۔

***

آئندہ پیشی پر جج نے میری مؤکل اور اس کیس کی ملزمہ زاہدہ کو بے گناہ تسلیم کرتے ہوئے باعزت بری کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی استغاثہ کے وارث یعنی انکوائری آفیسر شفیع شاہ کو خاصی سختی سے تاکید کی کہ وہ عرصہ دس یوم کے اندر اصل قاتل کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرے۔

زاہدہ کی باعزت بریّت پر اس کی ماں خدیجہ بڑی خوش تھی۔ اس کیس کی کامیابی پر ظاہر ہے خوشی تو مجھے بھی بہت ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی میرا ذہن مسلسل ایک اُلجھن کو سلجھانے کی کوششوں میں مصروف تھا۔ اور اس ''مصروفیت'' نے مجھے خاصا بے چین کر رکھا تھا۔ بے چین اور مضطرب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ لیاقت حسین کا قاتل کون ہے؟

مجھے بے قراری کی اس کیفیت میں زیادہ عرصہ مبتلا نہیں رہنا پڑا۔ زاہدہ کی بریّت سے ہفتہ بھر بعد کی بات ہے، میں اپنے چیمبر میں بیٹھا روزمرہ کی ڈاک دیکھ رہا تھا۔ دفتر کے پتے پر روزانہ آٹھ دس خطوط آ جاتے تھے اور میں نے یہ عادت بنا رکھی تھی کہ روز کے روز خطوط کھول کر پڑھ لیا کرتا تھا۔ انہی خطوط میں سے ایک خط نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خط رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کیا گیا تھا اور خط کی پشت پر بھیجنے والے کا نام محمد صابر اور ایڈریس لانڈھی کا تھا۔ خط میں مجھے اس طرح مخاطب کیا گیا تھا کہ پہلا جملہ پڑھتے ہی میں خط بھیجنے والے کو پہچان گیا۔

''بیگ صاحب! میں غلام مرتضیٰ......آپ سے اس خط کے ذریعے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں......''

میں تیزی سے اس خط کو پڑھتا چلا گیا۔ غلام مرتضیٰ نے آگے لکھا تھا۔ ''میں آپ سے چند دن کی چھٹی لے کر حیدر آباد گیا تھا لیکن پھر واپس نہیں آیا اور میری کوشش یہ ہو گی کہ آئندہ کبھی ہماری ملاقات نہ ہو۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں، میں نے اپنی دانست میں جو نیکی کی ہے اس کا بھرم قائم رہنا چاہئے...... سچی بات یہ ہے کہ میں کبھی حیدر آباد نہیں گیا۔ میں ادھر کراچی ہی میں تھا اور اب بھی ادھر ہی ہوں۔ البتہ میں گولیمار چھوڑ کر کہیں اور بس گیا ہوں اور میں نے اپنا حلیہ اور رنگ ڈھنگ بھی تبدیل کر لیا ہے۔ اور یہ سب کچھ میں نے ایک خاص مقصد کے تحت کیا ہے۔ میں اپنی زندگی اور مستقبل سے بہت مایوس تھا۔ ذہن میں یہی خیال آیا کہ کسی کے کام ہی آ جاؤں میرے کسی عمل سے اگر دو مصیبت زدہ افراد کی مشکل آسان ہو جائے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی۔ سو میں نے اپنے منصوبے پر عمل کر ڈالا۔

بیگ صاحب! میں بات کو گھما پھرا کر آپ کا وقت برباد نہیں کروں گا اس لئے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں اور اصل موضوع ہے ''لیاقت حسین مرڈر کیس'' جی بیگ صاحب! لیاقت حسین کو میں نے قتل کیا ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پولیس یا کوئی بھی ان ماں بیٹی کو اس

(پہیلیاں)

[illegible]